پُراسرار شیطان
PDFBOOKSFREE.PK

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی و اصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PVL

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

فہرست

خون آشام	11
تھارودھن	34
گوٹنگا کا مردم خور قبیلہ	54
غار کا راز	77
پراسرار شیطان	95
حادثہ یا قتل	126
خواب یا حقیقت	135
زندہ لاش	153
ناگ کی داسی	175
غار کی پراسرار مخلوق	217

پیش رس

قارئین کرام!

ایک بار پھر نیا انتخاب لے کر حاضر خدمت ہوں۔ سابقہ انتخاب "ڈریکولا" کی پسندیدگی پر میں بے حد مشکور ہوں۔ کئی دوستوں نے ڈریکولا کی پراسرار زندگی کے خفیہ گوشوں کو بے نقاب کرنے پر داد و تحسین سے نوازا۔ معرکتہ الارا مصنّفین کی عمدہ تحریروں کو ایک جلد میں اکٹھا کرنے کے عمل کو سراہا اور مزید کتاب کی ضرورت پر زور دیا۔ لہٰذا ان کی نیک خواہشات اور جذباتی لگاؤ کا احترام کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کہانیوں کا نیا انتخاب پیش ہے جس میں شیطان اور اس کے چیلوں کی ہنگامہ آرائیاں عروج پر دکھائی دیں گی۔ شیطانی قوتوں کے حامل بھٹکے ہوئے انسانوں کے محیر العقول کارنامے جو ان کی دنیاوی حرص و طمع کی ایک بھیانک تصویر ہے۔ انسانی لبادے میں چھپے ہوئے ان گنت شیطان جو اپنے افعال میں شیطان کو بھی مات دے گئے ہیں۔ شیطانی و ماورائی قوتوں کی تلاش میں دنیا کے کونے کھدروں میں مارے مارے پھرنے والے لوگوں کی کارستانیاں' شبنمی رشتوں' آتشیں جذبات' پتھریلے و دشوار نشیب و فراز اور نوکیلے رویوں کی عکاس کہانیاں جو آپ کے دل و دماغ میں ہلچل برپا کر دیں گی۔ طاقت و فراست اور قوت عمل کے حسین امتزاج سے جنم پذیر انوکھی داستانیں جو کہ آپ کے جسم کو لرزا دیں گی۔ آپ خود کو ایک ایسی دنیا میں پائیں گے جہاں کے دستور و انداز سب منفرد ہیں اور انسانیت نام کی کوئی چیز وہاں نہیں ملتی۔ کمالات قدرت کے مظاہر اور فطرت سے ضد رکھنے والے نادان لوگ جو لافانی وجود کی کشمکش میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھے مگر ایک ایسی طاقت سے سرفراز ہو گئے جو کہ دوسروں کی حیات پر آہنی شکنجے سے کم نہ تھی۔ ان کے رویوں سے ابھرنے والی خونخوار وحشت جو انسانوں کی خوشیوں کو اجاڑ دیتی ہے' جوانوں اور دیوانوں کو لگام لگا دیتی ہے اور عمر رسیدہ فرزانوں کو حوصلہ شکن بنا دیتی ہے۔ تباہی و بربادی کی عکاسی کرنے والے شیطانوں کا انسانوں پر غلبہ!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انتقام اور تلاش مسلسل کی وہ خواب ناک سرگذشت جو انہیں تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ بنا ڈالتی ہے اور پھر وہ اپنی مکاریوں اور حرامکاریوں کے دائرے کو مفاد و فساد سے وسعت دیتے ہیں۔ لیکن نظام قدرت سے ٹکرانے والا تھوڑی بہت ہلچل کے بعد تھک جاتا ہے یا پھر قدرت خود اس کے مقابلے میں کمزور لوگوں کو لا کھڑا کرتی ہے۔ کمزور و طاقتور کے بیچ سنسنی خیز کشمکش کے وہ متحیر کر دینے والے واقعات ہی اس کتاب کا مرکزی موضوع ہیں۔ کمزور وہی ہوتا ہے جو "خوف" کا شکار ہو۔ ایک ایسے سنسنی خیز جذبے کا شکار جو انسانی فصیل جاں سے قوت عمل کو تفریق کر دیتا ہے اور طاقتور سے طاقتور انسان کو مٹی کا مادھو بنا ڈالتا ہے۔ یہ ایک ذہنی کیفیت جو انسانی پیکر میں "ایڈرنالین" نامی غدود کے نامی غدود کے عدم توازن سے پیدا ہوتی ہے۔ اس جذبے پر قابو پا کر ہی ان کمزور لوگوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ خوف بذات خود ایک طاقتور قوت ہے۔ کسی نہ کسی خوف کی وجہ سے ہی لوگ زندگی کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر پاتے۔ خوف واقعی انسان کو بیمار کر دیتا ہے۔ ان کی زندگی مختصر کر دیتا ہے اور جب وہ بولنا چاہتے ہیں تو ان کے منہ پر قفل ڈال دیتا ہے۔ خوف' بے یقینی اور عدم اعتماد سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم معاشی زوال کا شکار کیوں ہیں۔ خوف سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں لوگ اپنے ہدف پر پہنچنے سے قبل ہی ناکامی سے دوچار ہو جاتے ہیں اور کیونکر بہت کم زندگی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ ذہین افراد نے انسانی معاشرے کے اسی خوف کو مد نظر رکھتے ہوئے کمزور قوت ارادی کے حامل لوگوں کو مزید خوفزدہ کرنے کا عزم اختیار کیا ہے۔ انہوں نے خوف کی ان پر پیچ وادیوں میں جہاں ان لوگوں کو سیر کرائی ہے وہیں انجام کو ایسے منفرد انداز میں پیش کیا ہے کہ ان مخفی اور ان دیکھے خوفوں سے نبرد آزمائی کا حوصلہ اجاگر ہو سکے۔ خوفناک اور دہشت ناک کہانیاں بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قارئین ان انوکھے واقعات کو پڑھ کر جہاں تفریح حاصل کرتے ہیں وہیں ان کے مخفی شعور میں تعمیر و تشکیل کا پوشیدہ عمل جاری رہتا ہے۔

مخلص

جاوید بخاری

خون آشام

بچپن کیسے گزرا عمر نے کیا کیا کھیل دکھائے یہ ایک طویل اور بور قصہ ہے اس کی تفصیل میں جانے کی بجائے خلاصہ بہتر ہے اور خلاصہ یہ ہے کہ ماں اس وقت مر گئی جب میرے منہ سے اس کے لیے ماں کا لفظ نہیں نکلا تھا باپ اس وقت جب اس نے پریوں اور جنوں کی چند کہانیاں سنائی تھیں میرا بوجھ رشتے کے ایک چچا کو سنبھالنا پڑا۔ اس بوجھ کے ساتھ باپ کا مکان اور اس مکان میں خوب بھرا ہوا سامان بھی تھا اس لیے چچا کو یہ بوجھ زیادہ وزنی نہیں محسوس ہوا۔ لیکن پاس پڑوس کے لوگوں نے چچا کو زیادہ خوش ہونے کا موقع نہیں دیا اور میری پرورش کی نگرانی کی گئی۔ کیا کھاتا ہوں کیا پہنتا ہوں گھر میں مجھے پریشان تو نہیں کیا جاتا وغیرہ وغیرہ۔ چچی کے ارمان دل میں رہ گئے تھے انہوں نے سوچا ہوگا کہ مال دولت کے ساتھ ایک نوکر بھی ملا مگر پڑوسیوں نے مجھے نوکر نہ بننے دیا۔ نہ صرف یہ بلکہ مجھے اسکول میں بھی داخل کرایا گیا اور میں نے وہاں میٹرک کیا۔ پھر کالج میں داخلے کے لیے شہر بھی پہنچ گیا جہاں میں نے انٹر کیا۔ چچا کو طویل عرصہ تک یہ خسارے کا سودا بھگتنا پڑا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ بچا کھچا تو قبضے میں آئے چنانچہ خاموشی سے کارروائیاں کیں اور مکان وغیرہ بیچ کر بستی سے ہی بھاگ گئے۔ اس طرح میری پڑھائی کا سلسلہ رک گیا۔ بستی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی شہر دلکش تھا ہاں اب ذرا معاملہ مختلف تھا۔ چنانچہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نوکری تلاش کرنی پڑی اور یہ نوکری امین بھائی کے ہاں مل گئی۔ جوتوں کا کارخانہ تھا ہول سیل ڈیلر تھے لاکھوں میں کھیلتے تھے مگر قیامت کے کنجوس تھے۔ کنجوسی کی ساری روایتیں ان کے سامنے ماند پڑ جاتی تھیں مجھے آٹھ سو روپے ماہوار دیتے تھے۔ چائے گھر سے بن کر آتی تھی کھانا بھی گھر سے آتا تھا۔ پانچ ملازم تھے سب ساتھ کھاتے تھے۔ مگر لطف اس وقت آیا جب مجھے تنخواہ ملی۔ چھبیس روپے کچھ پیں کے حساب سے مہینے کی چار چھٹیوں کے پیسے کٹے چھ روپے روزانہ کھانے کے دو روپے روزانہ دن بھر میں چائے کے کٹنے والی رقم بنی تین سو چودہ روپے باقی چار سو چھیاسی روپے میرے حوالے کردیے گئے۔

"یہ کیا؟" میں نے سوال کیا۔ اور انہوں نے مجھے حساب بتا دیا۔

"مگر تنخواہ آٹھ سو بتائی گئی تھی مجھے۔"

"حساب کتاب سیکھو بھائی میاں چھبیس روپے بیس پیسے روزانہ ہوئے کہ تیس ہوئے۔"

"جی ہوئے۔"

"میں نے تو ایک سو چھ روپے ہی کاٹے ہیں۔"

"مگر جمعہ کی چھٹی تو عام ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے دلارے میاں دکان تو نہیں کھولی جاسکتی۔ دکان کھلے تو آمدنی ہو آمدنی ہو تو تمہیں دیں چندا میاں خود کمائیں گے تو تمہیں دیں گے نا۔ گھر بیٹھ کر تو نہیں دے سکتے۔"

"دوسرے لوگ تو ایسا نہیں کرتے۔"

"بھائی میاں وہ باؤلے ہیں تو ہمیں کیا ہماری بات کرو!"

"کھانا؟"

"چندا ذرا بازار دیکھیو چھ روپے میں تو قسم اللہ کی دال روٹی بھی نہیں ملتی میں تو رعایتی پیسے لگاتا ہوں چائے ایک روپے سے کم کی ملتی ہے کہیں تین چائے دیتا ہوں تمہیں پلے سے خرچ کرنا پڑتا ہے۔"

"مگر اس تنخواہ میں تو گزارا نہیں ہوگا۔ اگر میں دوپہر کو کھانا نہ کھاؤں تو۔"

"تو کام کیسے کرو گے بابو۔ ڈھیلے پڑ جاؤ گے۔ یہ اپنا اصول ہے سوچ لو چندا سارے

نوکر کھاتے پیتے اور عیش کرتے ہیں دعائیں دیتے ہیں امین بھائی کو۔"

پہلی نوکری تھی اور اس کے لیے بھی بڑے پاپڑ بیلنا پڑے تھے چنانچہ میں امین بھائی کو دعائیں دینے کے علاوہ کیا کرسکتا تھا۔ ان کی دکان میں واحد پڑھا لکھا تھا۔ خط و کتابت حساب کتاب سب کچھ سنبھال لیا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی عہدے مجھے دیے گئے تھے۔ میں کیشئر تھا۔ سیلز مینجر تھا۔ سیلز مین تھا۔ بینکوں کا حساب کتاب رکھتا تھا بڑی بڑی رقمیں بینکوں میں جمع کردیتا تھا امین بھائی مجھ پر بہت اعتبار کرتے تھے لیکن اصولوں کے بڑے پابند تھے۔ کبھی ایک گھنٹہ لیٹ ہوگیا تو حساب میں درج تھوڑی دیر پہلے چلا گیا تو حساب میں درج۔ پیٹ میں درد ہوا تو بوتل پلا دی مگر پیسے حساب میں درج اور مہینے میں چند سو روپے ہاتھ میں آتے تھے بڑی پریشانی کے عالم میں گزر رہی تھی امین بھائی سے بڑی نفرت ہوگئی تھی مجھے۔ میں نے غصہ میں میز کو ایک ٹھوکر ماری۔ حساب کتاب میں ڈیڑھ ہزار کا گھپلا ہوگیا تھا اور امین بھائی سخت غصہ ہوئے۔ ہزاروں سنا ڈالی تھیں اور آخر یہی کہا تھا۔

"میاں پیسے ادا کردو۔ ورنہ کیس پولیس کو دے دوں گا۔"

"میں ڈیڑھ ہزار ادا کروں گا امین بھائی۔ ٹھیک ہے آپ پولیس میں جائیں۔"

میرے فرشتوں کو بھی گمان نہیں تھا کہ امین بھائی جو کہہ رہے ہیں وہ کر دکھائیں گے۔ پولیس انسپکٹر نے جو شاید امین بھائی کا جاننے والا یا کوئی رشتہ دار تھا اس نے مجھے دکان سے ہی گرفتار کیا۔ اور تھانے لے گیا تھانے جاکر اس نے مجھے ایک حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"بچے کو ذرا ڈرائنگ روم دکھا دینا۔ ڈیڑھ ہزار روپے ہضم کیے ہیں امین بھائی کے۔ ذرا دیکھو اس نے کہاں چھپا کر رکھے ہیں۔" میں نے گڑگڑا کر حوالدار کو بتایا کہ رقم میں نے نہیں غائب کی ہے۔ امین بھائی کو دھوکا ہوا ہے لیکن حوالدار ہنس کر بولا "ہضم کرنے والے ایسی ہی کہانیاں سناتے ہیں بیٹا اگر تو نے ڈیڑھ ہزار روپے اپنے سے نہ اگلے تو میرا نام بھی حوالدار رحیم خان نہیں۔"

اور پھر حوالدار نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ بہت مارا اس نے مجھے۔ ماں بہن کی گالیاں دیتا رہا۔ اور میرا خون کھولتا رہا۔ میں نے بالآخر رونا اور چیخنا بھی بند کر دیا۔ امین بھائی کے لیے دل میں شدید نفرت کا احساس جاگ اٹھا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ امین بھائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر اس ساری مار کا بدلہ نہ لے لوں میں بھی اپنے باپ کا بیٹا نہیں ہوں۔ حوالدار نے جو کچھ اس سے کیا جا سکتا تھا کر ڈالا۔ پانچ دن تک مجھے لاک اپ میں رکھا گیا۔ اور میرا جسم جگہ جگہ سے سوج گیا۔ میرے جسم کی اوور ہالنگ کر دی گئی تھی اور اتنا مارا گیا تھا کہ دوسرا کوئی ہوتا تو شاید برداشت نہیں کر پاتا۔ بات چونکہ بہت چھوٹی سی رقم کی تھی اور انسپکٹر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے مجھے گالیاں دیتے ہوئے بھگا دیا اور کہا کہ بلاوجہ میں اس کے ہاتھوں سے مارا جاؤں گا۔ باہر نکلا امین بھائی کی دکان پر جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ جو چھوٹا سا کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا اسی میں پہنچ گیا۔ کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ کسی نے یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ میں اتنے دن سے کہاں ہوں۔ کوئی ہوتا تو سوچتا۔ اپنے زخموں کو لیے ہوئے بھوکا پیاسا اس بند کمرے میں پڑا رہا۔ وقت سب سے بڑا ساتھی ہوتا ہے اور جب کوئی پرسان حال نہ ہو تو انسان کے اپنے اندر اتنی قوتیں ابھر آتی ہیں کہ وہ ہر مشکل کا مقابلہ کر لیتا ہے۔ اور اپنی اس مشکل کا مقابلہ میں نے خود کیا۔ ٹھیک ہو گیا۔ چلنے پھرنے لگا کچھ پیسے محفوظ تھے۔ ان سے کھانے پینے کا بندوبست کیا۔ اور اس کے بعد جب بالکل تندرست ہو گیا تو امین بھائی سے ملاقات کرنے پہنچ گیا۔

میں ان کا گھر جانتا تھا۔ دو تین بار جا بھی چکا تھا۔ اور ان کے اہل خانہ سے بھی واقفیت تھی۔ امین بھائی کے لیے میرے دل میں جو نفرت اور دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت زیادہ تھا۔ اور اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے آٹھ بجے تھے مجھے یقین تھا کہ امین بھائی آ چکے ہوں گے۔ چنانچہ میں چھپ کر ان کے مکان میں داخل ہو گیا اور ان کے کمرے تک جا پہنچا۔ امین بھائی کمرے میں نہیں تھے۔ ان کی آواز دوسرے بڑے کمرے سے آ رہی تھی۔ جہاں وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پھر وہ واپس آئے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ ایک الماری کھولی پھر اس میں سے چمڑے کا ایک بیگ نکالا اور بیگ میں رکھے ہوئے نوٹوں کے بنڈل نکال کر کاغذ پنسل لے کر بیٹھ گئے۔ نوٹوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ جس کا صحیح اندازہ میں نہیں لگا سکا تھا۔ لیکن امین بھائی کے پاس اکثر میں نے اتنی بڑی رقومات دیکھی تھیں۔ میں نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور اس کے بعد خاموشی سے اپنی جگہ سے باہر نکل آیا۔ امین بھائی کچھ اس طرح اپنے کام میں لگے ہوئے تھے کہ انہیں میرے قدموں کی چاپ محسوس نہ ہوئی۔ بالآخر میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ اور جب

انہیں احساس ہوا تو ان پر وہی گزری جو کسی ایسے دولت مند پر گزر سکتی ہے۔ جو بے انتہا کنجوس ہو کسی پر ظلم بھی کر چکا ہو اور مظلوم اس کے سامنے ہو۔ چند لمحوں تک تو امین بھائی کی آواز ہی نہ نکل سکی۔ اور اس کے بعد انہوں نے شور مچانے کے لیے منہ کھولا لیکن میرا مضبوط اور طاقتور گھونسا ان کے منہ پر پڑا اور ان کے ہونٹ دانتوں میں جا گھسے۔ اور دانت حلق میں۔ میں نے ان کی گردن دبوچ لی تھی۔ امین بھائی ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ مگر میرے جسم میں اس وقت ان گالیوں کا اور اس مار کا جنون تھا میں نے انہیں اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا پھر ایک پیتل کے وزنی گلدان سے ان کے دونوں پیروں پر ضربیں لگائیں لیکن ان کا منہ بھینچے رکھا۔ میں انتہائی جوش کے عالم میں تھا اور انہیں بالکل زندگی سے محروم کر دینا چاہتا تھا۔ امین بھائی نیم مردہ ہو گئے۔ میری آنکھوں میں وحشت بھری ہوئی تھی۔ امین بھائی سے میں نے اپنا انتقام لے لیا تھا۔ واپسی کے لیے پلٹ رہا تھا کہ نوٹوں پر نگاہ پڑی۔ اور میں نے دل میں سوچا کہ یہ نوٹ کیوں نہ میری اپنی ملکیت بن جائیں۔ امین بھائی جیسے آدمی کے ساتھ رعایت نہیں کی جا سکتی۔ میں نے سارے نوٹ چمڑے کے اسی بیگ میں بھرے اور بیگ کی زپ بند کر کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر امین بھائی کے اہل خانہ آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ میں خاموشی سے وہاں سے چل پڑا کسی کو میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو سکا تھا وہاں سے میں اپنی رہائش گاہ پر آیا۔ اور رہائش گاہ پر آنے کے بعد احساس جرم نے مجھے گھیر لیا۔ امین بھائی مر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے پولیس کا شبہ میری طرف جائے اور پولیس مجھے تلاش کرے۔ ظاہر ہے دکان کے دوسرے لوگ میری رہائش گاہ کا پتہ بتا سکتے ہیں۔ یہ رہائش گاہ اس وقت خطرناک ہے۔ کچھ کرنا چاہیے۔ امین بھائی کے ساتھ رہ کر خاصی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ چنانچہ دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ رات تو یہاں گزارنی ہے۔ دوسرے دن صبح کو سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ اپنے لیے کوئی بہتر رہائش گاہ تلاش کر لوں گا۔ تب میری توجہ نوٹوں کی جانب گئی۔ اور میں نے انہیں گننا شروع کر دیا۔ آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار روپے تھے۔ بہت بڑی رقم اتنی بڑی کہ میں نے چشم تصور سے بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ رقم تو اس وقت میری ملکیت ہے۔ اور اگر تھوڑی سی ہمت سے کام لیا جائے تو ہمیشہ میری ملکیت رہ سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے بڑی ذہانت سے کام کرنا ہو گا۔ اور دوسرے دن سورج نکلنے سے پہلے میں اپنی اس رہائش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گاہ سے باہر نکل آیا۔ رقم میرے پاس موجود تھی۔ اور میں نے اسے احتیاط سے پہلے کے اسی بیگ میں رکھا ہوا تھا۔ کافی دیر تک سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا۔ ایک چھوٹے سے چائے خانے میں جاکر چائے اور بند کھایا۔ اس طرح ناشتہ کرنے کے بعد میں وہیں بیٹھ انتظار کرتا رہا۔ وقت بہت ست رفتاری سے گزر رہا تھ۔ خدا خدا کرکے زندگی معمولات پر آئی۔ دکانیں کھلنی شروع ہوگئیں۔ سب سے پہلے ایک دکان سے میں نے چمڑے کا ایک دوسرا بیگ خریدا۔ یہ بیگ اس بیگ سے بڑا تھا جو میرے پاس موجود تھا۔ میں نے وہ بیگ اس میں محفوظ کردیا۔ البتہ اس میں سے میں نے ایک اچھی خاصی رقم نکال کر اپنی جیبوں میں رکھ لی تھی۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ اور اس منصوبے کے تحت بالآخر دن کو تقریباً ساڑھے گیارہ بجے میں ایک پراپرٹی ڈیلر کے ہاں پہنچا۔ اور اس سے کرائے پر ایک فلیٹ طلب کیا۔ پراپرٹی ڈیلر نے اپنے ایک آدمی کے ساتھ مجھے فلیٹ دکھانے بھیجا۔ فلیٹوں کے ایک منصوبے میں پہلی منزل کا ایک فلیٹ سب سے پہلے مجھے دکھایا گیا۔ اور میں نے اسی کو پسند کرلیا۔ پراپرٹی ڈیلر سے معاملات طے ہوئے۔ ایڈوانس کی رقم اسے دے دی گئی اور اس نے مکان مالک کو ٹیلی فون پر طلب کرکے بقیہ کارروائیاں مکمل کرادیں۔

شام تک میں اس فلیٹ میں منتقل ہوگیا تھا۔ میں نے پراپرٹی ڈیلر کو ایک کہانی سنا دی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں دوسرے شہر سے آیا ہوں اور میرے والدین میرے یہاں پہنچنے کے بعد آنے والے ہیں۔ ایڈوانس ادا کردیا گیا تھا۔ ایک مہینے کا کرایہ دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد پراپرٹی ڈیلر کو اور کوئی تشویش نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں ایک ایسے فلیٹ میں پہنچ گیا تھا۔ جہاں کھردرے اور ننگے فرش کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ اس فلیٹ کو آباد کروں گا۔ اور اس کے بعد کچھ دن آرام کرکے مستقبل کے بارے میں پلاننگ کرونگا۔

لیکن یہ اتنی بڑی رقم اس طرح نہیں چھوڑی جاسکتی تھی۔ تقریباً پچیس ہزار روپے میں نے نکال لیے تھے اور ان پچیس ہزار روپے میں سے کافی رقم میرے پاس جیبوں میں پڑی ہوئی تھی۔ ابھی تھیلا چھپانا باقی تھا۔ فلیٹ میں غسل خانے کے اوپر دو چھتی بنی ہوئی تھی۔ یہ دو چھتی میرے بڑے کام آسکتی تھی۔ اس دو چھتی کو میں نے اینٹوں سے جوڑ کر بند کردیا۔ اس کے بعد فلیٹ ہی کے رنگ کا ڈبا لے کر آگیا۔ اور اس رنگ کو میں نے ان

اینٹوں پر بڑی مہارت سے پھیر دیا۔ اب کوئی بھول کر بھی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس جگہ کوئی دو چھتی ہوگی۔ البتہ اگر فلیٹ کا مالک ہی اس پر غور کرتا تو دوسری بات تھی۔ رقم محفوظ ہوگئی میں نے فلیٹ کی مناسبت سے اسے آراستہ کرنے کے لیے سامان خرید لیا حتیٰ کہ کچن کی ضروریات کی چیزیں بھی خرید لیں۔ دل میں خوشی کی لہریں بھی اٹھتی تھیں۔ اور ایک خوف بھی دامن گیر رہتا تھا۔ کہ کہیں پتہ نہ چل جائے کہ کیا کرچکا ہوں۔ اخبارات وغیرہ اس دوران نگاہوں سے نہیں گزرے تھے۔ جو یہ پتہ چلتا کہ امین بھائی کا کیا حشر ہوا۔ لیکن ایک دن تقدیر نے ایک زبردست ٹھوکر لگا دی۔ وہی انسپکٹر جس نے مجھے پہلی بار گرفتار کیا تھا اچانک میرے سامنے آیا اور مجھ پر حملہ کردیا پولیس انسپکٹر سے مقابلہ کرنا تو میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ لیکن بھاگنے کی کوشش کی اور پولیس انسپکٹر نے مجھے بالآخر پکڑلیا۔

وہیں سڑک پر اس نے مجھے اتنا مارا کہ میں زمین پر گر پڑا مجھے احساس ہوگیا تھا کہ تقدیر نے ایک بار پھر مجھے مصیبت میں لا ڈالا ہے۔ البتہ ایک کام میں نے خفیہ طریقے سے کرڈالا تھا۔ وہ یہ کہ فلیٹ کی چابی جو میرے لباس میں پوشیدہ تھی وہ میں نے اس وقت پھینک دی تھی جب پولیس انسپکٹر مجھے اپنی جیپ میں گرفتار کرکے لے جا رہا تھا۔ ایک بار پھر مجھے اسی منحوس تھانے میں لے جایا گیا اور لاک اپ میں ڈال دیا گیا۔ یہاں مجھے ساری تفصیلات معلوم ہوئیں۔

امین بھائی زندہ تھے۔ ان کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں۔ دانت بھی ٹوٹ گئے تھے اور انہوں نے میری نشاندہی کرتے ہوئے یہ بتا دیا تھا کہ تقریباً نو لاکھ روپے کی رقم میں ان سے لوٹ کر فرار ہوگیا ہوں یہ نو لاکھ روپے مجھ سے اگلوانے کے لیے پولیس نے میرے جسم پر اتنے زخم لگائے کہ ناقابل بیان ہیں۔ وہ سب کچھ میرے ساتھ کیا گیا جو مجھے زندگی سے محروم کردینے کے لیے کافی تھا۔ مجھے عدالت میں پیش کیا گیا۔ فاضل جج صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا پولیس نے مجھ پر تشدد کیا ہے تو میں نے انہیں اپنے زخم دکھا دیے۔ نتیجے میں مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ اور اس طرح مجھے اس مار پیٹ سے نجات ملی۔ بعد میں میرے اوپر مقدمہ چلتا رہا۔ مجھ سے اس رقم کے بارے میں اتنا پوچھا گیا تھا کہ اس کے بعد پوچھنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا کسی کے پاس۔ چنانچہ رقم کا مسئلہ ختم ہوگیا۔ لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امین بھائی نے حلفیہ بیان دیا تھا کہ میں نے انہیں مارا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سزا ہو گئی۔ اور یہ سزا ساڑھے چار سال کی تھی۔ رقم کا مسئلہ حل نہیں ہوسکا تھا۔ لیکن سزا بھگتے ہوئے اکثر میرے دل میں یہ آرزو بیدار ہوتی کہ کاش کوئی اس فلیٹ میں موجود اس رقم تک نہ پہنچ جائے۔ فلیٹ کا میں نے کسی کو کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ تھانے میں مجھ سے پوچھا گیا تھا کہ اس دوران میں کیا کرتا رہا ہوں تو میں نے انہیں یہی بتا دیا تھا کہ سڑکوں فٹ پاتھوں اور گلیوں پر میں نے گزارا کیا ہے۔ بہرحال یہ ایک الگ بات تھی۔ جیل کی زندگی کا آغاز ہوگیا۔ اور اس کے بعد میرے شب و روز میں پختگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ دل میں شدید وحشت اور درندگی تھی۔ اور میں ہر ایک سے لڑ پڑتا تھا۔ اس کے نتیجے میں بعض لوگوں پر میرا رعب بیٹھ گیا۔ لیکن زندگی کے یہ ساڑھے چار سال میں نے لاکھوں تجربات حاصل کر کے گزارے تھے۔ اور آئندہ کے لیے بے شمار فیصلے کیے تھے۔ بس کبھی کبھی رات کی تاریکیوں میں دل سے یہ دعائیں نکلنے لگتی تھیں کہ اگر ایک بہتر مستقبل کے لیے وہ رقم مجھے محفوظ مل جائے تو پھر زندگی میں کوئی گناہ نہیں کروں گا۔ اکثر یہ دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ بہت سے خیالات دل میں آتے تھے کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ لیکن اگر وقت سہارا دے جائے تو میں بھی انسانوں میں انسانوں ہی کی طرح زندگی گزاروں گا۔ ساڑھے چار سال کا عرصہ ختم ہوگیا۔ مجھے جیل سے رہا کر دیا گیا باہر کی دنیا بڑی عجیب لگی۔

یوں محسوس ہوا جیسے پہلی بار اس دنیا کو دیکھ رہا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی ہزاروں وسوسے بھی دل میں تھے۔ جانے اب کیا ہوگا میرے ساتھ۔ جیل میں کم از کم محفوظ تو تھا۔ دل میں خوف اور دہشت لیے سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ جی چاہا کہ دوڑتا ہوا اس فلیٹ تک پہنچ جاؤں۔ اب مجھے امین بھائی سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔ نو لاکھ کی چوٹ دی تھی میں نے انہیں اور اس کے علاوہ جسمانی چوٹیں الگ۔ چنانچہ اب وہ قابل معافی تھے۔ دو دن تک یونہی آوارہ گردی کرتا رہا کھانے پینے کے لیے کوئی خاص چیز موجود نہیں تھی۔ بس چند روپے تھے جیب میں۔ جن سے میں نے اپنا کام چلایا۔ یہ احساس تھا کہ میرے جیل سے رہا ہونے کے اوقات کا تعین کرلیا گیا ہوگا اور چونکہ میں ایک ایسا مجرم تھا جس کے پاس نو لاکھ روپے کی موجودگی کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے امین بھائی نے یہ انتظام کررکھا ہو۔ ہوسکتا ہے پولیس انتہائی احتیاط سے میری نگرانی کررہی ہو۔

چنانچہ فوری طور پر اس طرف دوڑ پڑنا میرے لیے خطرناک ہوسکتا ہے۔ البتہ اتنا میں نے ضرور کیا تھا کہ اس علاقے کا ایک چکر لگا لیا تھا۔

میں اچانک ہی غائب ہوا تھا ظاہر ہے مالک مکان نے میرا انتظار نہیں کیا ہوگا۔ ساڑھے چار سال بہت ہوتے ہیں گو اس کے پاس میری ایڈوانس رقم موجود تھی۔ لیکن وہ بھی ختم ہوچکی تھی۔ بہرحال یہ سب بعد کی باتیں تھیں۔ مگر پہلے یہ یقین کرلینا تھا کہ کوئی مجھ پر نگاہ تو نہیں رکھ رہا۔

میں ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا اور وہاں سامان اٹھوانے کا کام کرنے لگا۔ اس کام میں کافی محنت کرنا پڑتی تھی۔ لیکن اب سونا تپ کر کندن بن چکا تھا۔ اور میں دنیا کے نشیب و فراز سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا۔ اس محنت کی کمائی سے پیٹ بھرتے ہوئے لطف بھی آتا تھا۔ اس طرح تقریباً پندرہ دن میں نے گزار دیے اور یہ اندازہ لگایا کہ مجھ پر نگاہ تو نہیں رکھی جارہی۔ پھر جب یہ یقین ہوگیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تو میں نے اپنا کام کرنے کا فیصلہ کرلیا سب سے پہلے میں ریلوے اسٹیشن سے نکل کر نجانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ کئی بسیں تبدیل کیں اور اس کے بعد بالآخر اپنے مطلوبہ علاقے میں پہنچ گیا۔ ایک دکان سے ایک چھوٹا سا رجسٹر اور بال پوائنٹ خریدا اور اس کے بعد حلیہ ذرا سا درست کرکے بالآخر اس فلیٹ کی جانب چل پڑا۔ اس وقت دوپہر کا تقریباً ڈیڑھ بجا تھا۔ جون کی چلچلاتی دھوپ تھی اور سڑکیں سنسان تھیں۔ فلیٹ کا علاقہ بھی سنسان تھا۔ میں سیڑھیاں عبور کرکے پہلی منزل پر پہنچ گیا۔ اور دھڑکتے دل سے میں نے دروازے پر دستک دی۔ پہلی بار دوسری بار تیسری بار دستک دینے پر ایک دبلے پتلے سے بزرگ آدمی باہر نکلے۔ ان کی آنکھیں غصے سے سرخ ہورہی تھیں۔ دروازہ کھولتے ہی انہوں نے کہا۔

"ابے آخر تو سمجھتا کیا ہے کیا لاوارث سمجھ رکھا ہے۔ کمینے آخر تیرا کیا ارادہ ہے کیا سلوک کروں تیرے ساتھ۔"

"جی۔" میں نے حیرت سے ان بزرگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں پیچھا کرتا ہے میری بیٹی کا۔ تیری ماں بہن نہیں ہیں گھر میں۔"

"آپ کو غلط فہمی ہورہی ہے محترم مردم شماری کی فہرستیں تیار ہورہی ہیں میں آپ کے گھر کے افراد کی تعداد معلوم کرنے آیا تھا اسی دوران ایک لڑکی دروازے پر آگئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ارے نہیں ابا۔ یہ نہیں ہیں۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ بغیر دیکھے بھالے آپ شروع ہو گئے۔"

"ایں۔ یہ نہیں ہے۔"

"ہاں یہ نہیں ہے۔ وہ مردود تو بہت ذلیل انسان تھا۔ معاف کیجئے گا جناب دراصل میں ایک سکول میں پڑھاتی ہوں۔ ایک شخص مسلسل میرا پیچھا کرتا ہے۔ ابا یہ سمجھے کہ شاید وہ یہاں تک آپہنچا ہے۔" میں نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے آپ لوگوں نے تو مجھے خوب گالیاں دے لیں۔"

"معاف کرنا بیٹے غلطی ہو گئی۔ بہرحال تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہم بھی مجبور تھے۔ بولو ہم کیا خدمت کر سکتے ہیں تمہاری۔"

"جی میں مردم شماری کر رہا ہوں کہ آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کے گھر میں کتنے افراد ہیں؟" میں نے احتیاطاً یہ سوال کیا۔ جاننا چاہتا تھا کہ اگر اس وقت میں اندر داخل ہونا چاہوں تو مجھے کتنے لوگوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

"میاں میں ہوں اور یہ میری بیٹی ہے۔ ہم دو ہی ہیں۔ میرا نام رحمت بیگ ہے اور میری بیٹی کا نام سلطانہ ہے۔" میں نے رجسٹر میں یہ دونوں نام لکھے۔ اور پھر لجاجت سے بولا۔

"ایک گلاس پانی مل سکے گا باہر شدید دھوپ ہے۔"

"میں لاتی ہوں۔" لڑکی نے کہا اور واپسی کے لیے پلٹ گئی۔ بڑے میاں بھی پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگے تھے۔ اور اس وقت میں نے ان کی کمر پر ایک زور دار لات رسید کر دی۔ بیچارے بڑے میاں اچھل کر کمرے کے وسط میں جا پڑے تھے۔ میں نے پھرتی سے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ رجسٹر وغیرہ ایک طرف پھینکا اس دوران بڑے میاں سنبھلنے کی کوشش کر رہے تھے لڑکی کو بھی شاید ان دھماکوں کا احساس ہوا تھا وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئی اور اس نے خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"سنو میں تم دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ لیکن اگر تمہارے منہ سے ذرا

بھی آواز نکلی تو میری جیب میں پستول موجود ہے۔ تم دونوں زندہ نہ رہ سکو گے۔" لڑکی کا منہ کھلا اور پھر دہشت سے بند ہو گیا۔ بڑے میاں بھی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے نیچے جھک کر ان کا گریبان پکڑا اور انہیں سیدھا کھڑا کر دیا۔

"ایک بار پھر میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے ایک کام ہے اور اس کی تکمیل کے بعد میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہاں اگر تم لوگوں نے کوئی حرکت کی تو اس کے بعد مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" میں انہیں دھکیلتا ہوا اس کمرے میں لے آیا جو میری امیدوں کا مرکز تھا۔ غسل خانے کی دو چھتی پر نگاہ ڈالی اور میری روح تک مسرور ہو گئی۔ دو چھتی اسی طرح بنی ہوئی تھی اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مقصد ہے کہ کسی کا ذہن اس سمت نہیں گیا تھا کہ دو چھتی اینٹیں لگا کر بند کیوں کی گئی ہے پھر میں نے ان دونوں کو کمرے میں موجود کرسیوں سے باندھ دیا اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس پر رومال کس دیئے وہ بیچارے شدت خوف سے ویسے ہی نیم مردہ ہو گئے تھے۔ میری حرکات پر انہوں نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔

یہ میرے مستقبل کا سوال تھا۔ اس کے بعد دو چھتی کو توڑنا میرے لیے مشکل نہ ثابت ہوا بڑے میاں بے چین نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے لیکن چونکہ منہ بند تھا اس لیے کچھ بول بھی نہیں سکتے تھے............ دو چھتی میں' میں نے اتنا سوراخ کر لیا کہ اندر کا جائزہ لے سکوں میرا وہ بیگ وہاں محفوظ تھا جس میں میرا مستقبل بند تھا۔ میں نے ہاتھ ڈال کر وہ بیگ اندر سے نکال لیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔ نوٹ اس میں موجود تھے میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی اور مسکراتی نگاہوں سے ان لوگوں کو دیکھا۔ وہ حیران تھے بہرطور اس کے بعد انہیں کوئی تفصیل بتانا ضروری نہ تھا۔ البتہ چلتے ہوئے میں نے آہستہ سے کہا۔

"باہر کسی کو میں یہ اطلاع دے جاؤں گا کہ تم لوگ یہاں بندھے ہوئے ہو ویسے بھی دروازہ کھلا چھوڑ دوں گا۔ بے فکر رہو کوئی نہ کوئی تمہیں آزاد کر دے گا۔ بہت بہت شکریہ۔"

بیگ سے میں نے چند چھوٹے نوٹ نکال لیے تھے جنہیں میں استعمال کر سکوں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ریلوے اسٹیشن پر چونکہ کئی دن سے رہ رہا تھا اس لیے ٹرین کے اوقات بھی معلوم تھے پہلے میں ریلوے اسٹیشن پہنچا ایک ٹکٹ خریدا اور اس کے بعد میں ریل کے ڈبے میں آبیٹھا اور مستقبل کی جانب سفر شروع ہو گیا تھا۔

نیا شہر نئی زندگی نئے لوگ نیا ماحول اور اس ماحول میں مجھے اپنے لیے جگہ تلاش کرنی تھی اور یہ جگہ سب سے پہلے کوئی مکان ہی ہو سکتا تھا لیکن درمیانہ درجے کے محلے میں' میں نے ایک چھوٹا سا مکان حاصل کیا اور یہاں بھی سب سے پہلے اپنی اس رقم کو محفوظ کیا جو اس وقت میں اپنے تاج محل کا درجہ رکھتی تھی اور پھر میں نے اپنا تاج محل بنوانا شروع کر دیا بالکل ہی تبدیل کر لیا تھا سب سے پہلے میں نے ایک دکان خریدی اور اس کے بعد اس میں ایک شاندار قسم کا جنرل اسٹور کھول لیا دکان کے اوپر ایک فلیٹ لے لیا تھا جو بہت خوبصورت تھا اور اس طرح اپنے منصوبے کے مطابق میں نے نئی زندگی کا آغاز کر دیا۔ اپنا نام بھی تبدیل کر لیا تھا اور میرے پڑوسی مجھے ایک انتہائی نیک اور شریف انسان کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ ویسے بھی وہ سب کے سب تعلیم یافتہ اور اچھی حیثیت کے مالک تھے۔ یہاں میری سب سے پہلی دوستی ڈاکٹر الیاس سے ہوئی۔ وہ مینٹل اسپتال میں کام کرتا تھا اور اکثر مجھے دماغی مریضوں کی کہانیاں سناتا رہتا تھا یہ کہانیاں کافی دلچسپ ہوتی تھیں۔ مجھ سے اس نے میری زندگی کے بارے میں بہت سے سوالات کیے تھے۔ خود شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ تھا۔ بیوی بھی بہت اچھی فطرت کی مالک تھی اور میں اسے بھابھی کہہ کر پکارتا تھا اکثر اس کی بیوی نے مجھ سے کہا تھا۔

"شاہد بھائی آپ شادی کر لیں تنہا زندگی بھی کوئی زندگی ہے آپ مجھ سے کہیں تو میں آپ کے لیے لڑکی تلاش کروں۔"

"نہیں بھابی ابھی نہیں کچھ وقت گزر جانے دیجئے یہ محسوس کر لینے دیجئے کہ میں اب اس دنیا میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ ڈاکٹر الیاس نے کئی بار مجھے اپنے اسپتال آنے کی دعوت دی تھی اور کہا تھا کہ ان دماغی مریضوں کو کسی وقت میں خود دیکھوں۔ ایک دن ایسے ہی موڈ بن گیا اور میں اس کی جانب چل پڑا۔ دماغی اسپتال ایک بہت بڑی عمارت میں واقع تھا اور یہاں پر ذہنی مریضوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ ڈاکٹر الیاس مجھ سے باتیں کرتا رہا یہاں کا ماحول واقعی عجیب و غریب تھا میں نے ڈاکٹر الیاس سے

کہا۔

"تم پر تو ایک بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ان پاگلوں کے درمیان واقعی زندگی گزارنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔"

اور یہاں سے حاصل شدہ تجربہ بھی زندگی کے لیے بڑا قیمتی ہوتا ہے اس کے بعد انسان اپنے بیوی بچوں کو اچھی طرح ہینڈل کر سکتا ہے۔"

"اوہو تم بھابھی کے بارے میں یہ بات کہہ رہے ہو۔ تذکرہ کروں گا ان سے۔" میں نے ہنستے ہوئے ڈاکٹر سے کہا۔

الیاس بھی ہنسنے لگا۔ اچانک میری نگاہ اس لڑکی پر پڑی۔ دراز قامت اور ایسی شکل و صورت کی مالک تھی کہ انسان کی نگاہ ایک بار اس پر ٹکنے کے بعد ہٹنے کا نام نہ لے۔ ویسے تو لاتعداد حسین صورتیں نگاہوں کے سامنے آتی ہیں لیکن کچھ چیزوں میں ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ انسان ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جائے۔ ڈاکٹر الیاس نے میری توجہ محسوس کر لی تھی اس نے گہری سانس لی اور میرے بازو پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

"درحقیقت اس کا چہرہ اتنا ہی حسین ہے کہ انسان کا ذہن بھٹک جائے۔" میں چونک پڑا اور میں نے شرمندہ نگاہوں سے ڈاکٹر الیاس کو دیکھا اور بولا۔

"سوری ڈاکٹر الیاس!"

"نہیں یار۔ میں جانتا ہوں کہ تم تنہا ہی نہیں ہو جو اسے اس طرح دیکھتے رہ گئے ہو۔ بلکہ اس سے پہلے بھی وہ بہت سی نگاہوں کا مرکز بن چکی ہے۔"

"کون ہے؟" میں نے سوال کیا۔ اور ڈاکٹر الیاس ہنس پڑا پھر بولا۔"

"ایک ذہنی مریضہ۔"

"یہ!" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ بڑی انوکھی کہانی ہے اس کی۔ میں نے اس کہانی میں دلچسپی کا اظہار کیا تو ڈاکٹر الیاس کہنے لگا۔

"میرا خیال ہے تقریباً چار سال پہلے یہ اس اسپتال میں داخل کی گئی تھی۔ اور اسے ایک رفاہی ادارے کی منتظم مسز تنویر نے یہاں تک پہنچایا تھا۔ مسز تنویر کی رپورٹ تھی اس کے بارے میں کہ یہ کہیں سے ان کے دارالامان آ گئی تھی۔ اپنا ماضی نہیں بتا سکتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اور بے سہارا تھی۔ مسز تنویر نے انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اسے دارالامان میں رکھ لیا۔ وہاں اس نے اتنی شرافت اور دیانت داری کا ثبوت دیا کہ مسز تنویر کی آنکھوں کا تارا بن گئی بہت ہی خدمت گزار اور نفیس قسم کی لڑکی ہے یوں سمجھ لو کہ مسز تنویر کا بھی یہی کہنا تھا کہ انہیں اس کی ذات سے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن پھر ایک دن مسز تنویر ششدر رہ گئیں۔ اس دن جو واقعہ پیش آیا وہ بہت انوکھا تھا۔ دارالامان میں تقریباً بارہ تیرہ سالہ لڑکی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے نیچے گر پڑی۔ رات کا وقت تھا۔ لڑکی نابینا تھی۔ نیچے گری تو اس کا سر پھٹ گیا اس وقت اس کے پاس کوئی اور موجود نہیں تھا۔ مسز تنویر کو بالکل علم نہیں تھا کہ لڑکی زخمی ہو گئی ہے۔ وہ اتفاقیہ طور پر ہی اپنی رہائش گاہ کی کھڑکی کھول کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ تب انہوں نے ایک نہایت حیرت ناک منظر دیکھا۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ لڑکی اس زخمی لڑکی کا خون چاٹ رہی ہے۔ اور عجیب و غریب کیفیت کا شکار ہے۔ ابتداء میں تو مسز تنویر کو یقین نہ آیا۔ لیکن پھر وہ دوڑتی ہوئی وہاں پہنچیں تو انہوں نے یہ منظر پوری طرح اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان پر تقریباً نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی زندہ بچ گئی۔ لیکن یہ کافی دیر تک عجیب و غریب کیفیت کا شکار رہی۔

مسز تنویر بری طرح گھبرا گئی تھیں۔ یوں بھی انہیں اس کا ماضی نہیں معلوم تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں تب انہوں نے ڈاکٹر نقی سے رابطہ کیا۔ ڈاکٹر نقی کا نام شاید آپ نے سنا ہو مسٹر شاہد وہ بہت بڑے ذہنی امراض کے ماہر تھے۔

ڈاکٹر نقی سے مسز تنویر نے یہ تفصیل بتائی تو ڈاکٹر نقی بھی حیران رہ گئے۔ پھر اس کے بارے میں تفصیل سن کر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس کا ذہنی تجزیہ کریں گے۔ کہ آخر اس جیسی شریف اور نیک نفس لڑکی پر یہ دورہ کیوں پڑا۔ اس طرح یہ ڈاکٹر نقی کے لیے ایک یادگار چیز بن گئی۔ وہ اسے اسپتال لے آئے اور انہوں نے اسے اپنی آبزرویشن میں رکھ لیا۔ ڈاکٹر نقی اس کے ذریعے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دینا چاہتے تھے۔ لڑکی کے مختلف ٹیسٹ کیے گئے۔ ڈاکٹر نقی نے فرصت کے لمحات میں اسے اپنے تصورات سے ہٹا اور پھر وہ ایک رپورٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ انوکھی رپورٹ

"کیا؟" میں نے دشمن سے سوال کیا۔

"ڈاکٹر نقی نے بتایا کہ اس کے دماغ کے تمام خلیئے درست ہیں۔ بس ایک خلیہ

تاریک ہے اور اس میں ایک سرخ دھبہ نظر آتا ہے۔ اس حصے کے بارے میں ڈاکٹر نقی مختلف انداز میں تجربے کرتے رہے اور انہوں نے جو معلومات حاصل کیں وہ یہ تھیں کہ یہ دھبہ شاید قدرتی ہے۔ یا پھر یہ کسی حادثے کا نتیجہ ہے۔ لیکن اس دھبے میں ایک انوکھی بات ہے وہ یہ کہ یہ پھیلتا اور سکڑتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر نقی کا خیال تھا کہ یہ سرخ دھبہ کبھی پھیل کر اتنا وسیع بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے پورے ذہن پر چھا جائے اس وقت اس کی کیفیت غیر انسانی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت خود کو کوئی خون آشام سمجھ لے یہ کیفیت اسے خون پینے پر مجبور کر سکتی ہے۔

ڈاکٹر نقی ابھی یہ فیصلے کر رہے تھے کہ اس کے علاج کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے یا اس دھبے کی نوعیت کیا ہے کہ وہ خود حادثہ کا شکار ہوئے اور ہلاک ہو گئے۔ اسپتال میں چونکہ یہ ایک لاوارث حیثیت سے داخل ہوئی تھی۔ اور پھر ڈاکٹر نقی کی آبزرویشن میں تقریباً ایک سال رہی تھی۔ اس لیے اسپتال کے ایک فرد ہی کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ڈاکٹر نقی نے خصوصی طور پر اسے بے شمار مراعات فراہم کی تھیں۔ اور اب اسے تقریباً چار سال ہو چکے ہیں۔ لیکن ان چار سالوں میں اس کے ریکارڈ کا ایک لمحہ بھی خراب نہیں ہے۔ یہ بے غرض، مریضوں کی خدمت کرتی ہے۔ ہر ایک کے کام آتی ہے۔ اتنی نیک فطرت اور نفیس عورت ہے کہ آپ یقین نہیں کریں گے مسٹر شاہد بہرطور اب اسپتال کی طرف سے اسے ہر چیز دستیاب ہے۔ ویسے مختلف ڈاکٹروں نے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر نقی کی حاصل کی ہوئی معلومات سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے۔"

"گویا یہ ایک لاوارث حیثیت رکھتی ہے۔"

"ہاں بظاہر اسپتال کی انتظامیہ اس سے بددل نہیں ہے۔"

"ہاں یقیناً وہ اتنی خوبصورت ہے اور اتنی نرم خو ہے کہ ہر شخص اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ ابھی تو آپ نے اسے صرف دور سے دیکھا ہے۔ اگر کچھ دیر اس سے گفتگو کر لیں تو میرا خیال ہے کہ اس کے گرویدہ ہو جائیں گے۔"

"میں تو اس کا گرویدہ ہو گیا ہوں ڈاکٹر الیاس۔ یقین کرو۔ وہ میرے ذہن میں ایک عجیب حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اس کے بعد اس پر پھر ویسا ہی کوئی دورہ نہیں پڑا"

"نہیں بالکل نہیں۔ اسپتال کی چار سالہ رپورٹ میں ایسی کوئی بات نہیں ملی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس سے اس موضوع پر بات ہوئی کبھی۔"

"ہاں۔ ڈاکٹر نقی نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اس سے اس کے بارے میں سوالات کیے تو اس نے بتایا کہ اسے اپنا ماضی بالکل یاد نہیں ہے۔ بس لاوارث بھٹک رہی تھی کہ مسز تنویر کے ہاں پہنچ گئی۔ اس سے جب پوچھا گیا کہ اس نے ایک زخمی لڑکی کا خون چاٹا تھا تو اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔"

"ممکن ہے۔ مسز تنویر کو ہی کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔"

خدا بہتر جانے۔ لیکن ڈاکٹر نقی بہت اچھے ڈاکٹر تھے۔ اور انہوں نے اس کا جو ذہنی تجزیہ کیا ہے وہ غلط نہیں ہو گا۔"

"ڈاکٹر الیاس میرا ایک کام کرسکتے ہیں آپ؟" میں نے کہا اور ڈاکٹر الیاس چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولے۔

"کیا؟"

"میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ارے ارے۔ کیا ہوگیا آپ کو شاہد صاحب۔ آپ تو آپ تو بڑے سنجیدہ آدمی ہیں۔"

"پوری سنجیدگی سے میں یہ بات کہہ رہا ہوں ڈاکٹر الیاس۔"

"ٹھیک ہے سوچ لیجئے بہت بڑا رسک ہے۔"

"میں یہ رسک لینے کے لیے تیار ہوں۔ ڈاکٹر الیاس۔" میں نے جواب دیا۔ اور ڈاکٹر الیاس عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر شانے ہلا کر بولا۔

"اگر میں یہ کوشش کروں تو میرے خیال میں مجھے اس میں ناکامی نہیں ہوگی۔ کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اسے اپنی تحویل میں رکھنے کا دعویٰ کرتا ہو۔ ایسی حالت میں اگر اس کے لیے کوشش کی جائے تو میرا خیال ہے یہ کام ناممکن نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خود بھی چاہے۔"

"یہ کام آپ کو کرنا ہے۔ ڈاکٹر الیاس!" میں نے جواب دیا۔ "ٹھیک ہے میں اپنی بیوی سے بات کرلوں۔ ویسے یقین کرو مجھے انتہائی حیرت ہوئی ہے۔"

حیرت مجھے بھی تھی۔ نجانے کس طرح وہ لڑکی ایک نگاہ میں میرے ذہن کی

گہرائیوں سے اتر کر دل تک پہنچ چکی تھی اور اس کے بعد ڈاکٹر الیاس اور مسز الیاس کی کوششوں سے یہ مرحلہ طے ہوگیا۔ نگار سے میری ملاقات کرائی گئی اور ڈاکٹر الیاس کا کہنا بالکل درست تھا۔ اس کا چہرہ ملائم ہی نہیں تھا۔ بلکہ اس کی باتیں اتنی شگفتہ اور بے اختیار ہوتی تھیں کہ آدمی کا دل ان کی جانب کھنچتا چلا جائے۔ میں نے خود ہی اس سے اپنی زندگی کا ساتھی بننے کا تذکرہ کیا تو اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس نے کسی قدر غمگین لہجے میں کہا۔

"میرے نام کے ساتھ ایک کہانی وابستہ ہے۔ آپ کو علم ہے اس کا۔"

"ہاں نگار مجھے اس کا علم ہے۔"

"اور میں نہیں جانتی کہ اس کہانی میں کہاں تک صداقت ہے۔"

"تمہیں اپنے ماضی کے بارے میں ایک لفظ بھی یاد نہیں آتا۔"

"یہیں پر آکر تو میں یہ سوچتی ہوں کہ ہو سکتا ہے واقعی میرے اندر ایسی کوئی کمی ہو، لیکن انسانی خون۔ یہ تصور ہی مجھے پاگل کردیتا ہے۔ آپ خود سوچئے میں چہرے سے انسان نظر نہیں آتی آپ کو۔"

"بالکل نظر آتی ہو نگار اور میں صحیح معنوں میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنا کر اپنے آپ کو بہت خوش نصیب خیال کروں گا۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے کہا۔

"شاہد صاحب در حقیقت میں نے تو یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ جب تک یہ اسپتال والے مجھے برداشت کرتے رہیں گے۔ میں یہاں رہوں گی اور اس کے بعد کہیں اور نکل جاؤں گی۔ میں نے زندگی میں خوشیوں کا تو تصور ہی نہیں کیا تھا۔ آپ.......... آپ اگر خلوص کے ساتھ مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو میرے لیے اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہوسکتی ہے۔"

نہ اس کا کوئی سرپرست تھا اور نہ ہی میرا۔ ڈاکٹر الیاس اور بھابھی جان ہماری سرپرست بن گئے اور نہایت سادگی سے ڈاکٹر الیاس کے فلیٹ میں میرا نگار سے نکاح کردیا گیا۔ اور اس کے بعد نگار میرے فلیٹ میں آکر آباد ہوگئی۔ اس کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اسے اس سے کچھ زیادہ ہی پایا۔ ایسی خدمت گزار وفاشعار اور محبت کرنے والی لڑکی کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے ان لوگوں کی دماغی کیفیت پر شبہ ہونے لگا۔ جنہوں نے اسے دماغی مریض قرار دیا تھا البتہ بس ایک احساس کبھی کبھی میرے ذہن میں بیدار ہوجاتا تھا وہ یہ کہ اس کا ماضی کیا ہے۔ وہ کون ہے اور اپنا ماضی کیوں بھول گئی۔ اکثر میرے اس کے درمیان اس موضوع پر گفتگو بھی ہوئی تھی اور اس نے ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہوئے کہا تھا۔

"بہت عجیب لگتا ہے مجھے شاہد۔" بہت عجیب لگتا ہے۔ جب میں یہ سوچتی ہوں کہ کہیں میرے بھی کوئی عزیز و اقارب نہ ہوں۔ میرے والدین نہ ہوں۔ میرے بہن بھائی نہ ہوں۔ وہ سب مجھے کھو کر افسردہ ہوچکے ہوں۔ اور بالآخر میں ان کی زندگی سے نکل گئی ہوں۔ لیکن ایسا کیوں ہو اور اگر وہ تھے تو انہوں نے مجھے تلاش کیوں نہ کیا۔ انہوں نے کیوں یقین کرلیا کہ میں اب اس کائنات میں نہیں ہوں۔ بعض اوقات جب یہ سب کچھ سوچتی ہوں شاہد تو میرا دل عجیب سی کیفیتوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ لیکن اس دنیا میں میرے جیسے اور بھی لوگ ہوں گے جو اپنی شناخت ہی نہ رکھتے ہوں۔ جو اپنے آپ میں ایسے گم رہے ہوں کہ انہیں ماضی کا کوئی سرا نہ ملتا ہو۔ کیسے دکھ کی بات ہے شاہد کہ میرا اپنے ماضی سے رابطہ ٹوٹ چکا ہے۔ میرا ماضی کیا تھا۔ کیا ہوا تھا۔ وہ کون سا حادثہ تھا جس نے مجھ سے میری یادداشت چھین لی اور میری زندگی کا ایک طویل عرصہ نگل لیا۔ نجانے وہ کون سا لمحہ تھا۔ ایسے موقعوں پر وہ رونے لگتی تھی اور میرے دل میں اس کے لیے بڑا گداز پیدا ہوجاتا تھا۔

مین نے اسے ایک شوہر کا مکمل اعتماد دیا تھا اور اس نے میرے اس اعتماد کو کبھی مجروح نہیں کیا تھا۔ میں اس پر پورا پورا بھروسہ کرتا تھا۔ ہمارے فلیٹوں کے بالکل سامنے کچھ اور فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ درمیانی فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ بس ایک سڑک درمیان میں تھی سامنے والے فلیٹ میں ایک شخص آکر رہا عجیب و غریب شکل کا مالک تھا۔ نجانے کیوں اس کی شکل دیکھ کر کچھ غصہ سا آتا تھا یا پھر اس کا انداز ہی ایسا تھا۔ بالکونی میں آکر کھڑا ہوتا تو اسی جانب دیکھتا رہتا۔ کئی بار میں نے اسے چور نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ ادھر دیکھ رہا ہوتا تھا اور ظاہر ہے اس کے اس سمت دیکھنے کی وجہ کیا ہوسکتی تھی۔ بارہا مجھے غصہ آیا اور ایک بار خصوصی طور پر نگار نے بھی اس کا تذکرہ کیا۔

"یہ آدمی کچھ عجیب سا ہے۔ غالباً تنہا رہتا ہے۔ کبھی اس کے فلیٹ مین کسی اور کو

نہیں دیکھا گیا۔ لیکن جب بھی دیکھو یہاں کھڑا رہتا ہے۔ ایک آدھ بار میں کسی کام سے نیچے اتری ہوں تو میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ خود بھی نیچے اتر آتا ہے۔" میرے دل و دماغ میں غصے کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔

تو پھر میں اس سے نمٹ لیتا ہوں۔

نہیں، نہیں شاہد بلاوجہ ہم کسی سے جھگڑا کیوں مول لیں۔ میرا کیا بگاڑ لے گا۔ اگر کبھی اس نے کوئی بدتمیزی کرنے کی کوشش کی بھی تو میں' میں اسے خود جواب دے دوں گی۔"

لیکن میرے دل میں اس شخص کے لیے نفرت بیدار ہونے لگی۔ میں جو زندگی گزار چکا تھا وہ ایسی نہیں تھی کہ میں کسی سے ہار مان کر خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں میں نے خود دیکھا تھا کہ وہ مردود عموماً اسی جانب دیکھتا رہتا ہے اور اس کے چہرے پر جو آثار اس وقت نظر آتے ہیں وہ میرے لیے انتہائی غصہ دلانے والے ہوتے ہیں۔ اسی دوران ڈاکٹر الیاس بھی وہ فلیٹ چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس نے اپنا مکان بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر الیاس اگر یہاں ہوتا تو شاید یہ مسئلہ کسی دوسرے طریقے سے حل ہوجاتا لیکن ان دنوں وہ میرے ذہن میں بری طرح پک رہا تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے۔ اس شخص سے ملاقات کروں۔ اسے اس کی بدتمیزی کے بارے میں بتا دوں پھر کسی وقت اسے پکڑ کر اس کا دماغ درست کر دوں۔ لیکن بات واقعی رسوائی کی تھی۔ لوگوں کو پتہ چلتا۔ لوگ کیا کہتے۔ زبان چلانے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ نجانے کون کس انداز میں سوچتا یہی سوچ کر خون کے گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتا تھا۔

لیکن پھر میری زندگی میں وہ منحوس رات آگئی جس نے میری زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ میں کسی کام سے گیا ہوا تھا اکثر چلا جاتا تھا اور ان لمحات میں نگار گھر میں اکیلی ہوتی تھی اس نے ایک دو جگہ تعلقات بھی پیدا کرلیے تھے اور اکثر عورتیں بھی ہمارے گھر آتی جاتی تھیں رات کو تقریباً پونے گیارہ بجے جب میں گھر کے دروازے پر پہنچا تو خلاف معلوم میں نے دروازہ کھلا ہوا پایا۔ میں حیران سا کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا اندر روشنی تھی اور سامنے ہی صوفے پر نگار عجیب سے انداز میں پڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔ لیکن اسے قریب سے دیکھ کر میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا اس کے ہونٹ پر خون جما ہوا تھا دائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رخسار اور دائیں آنکھ کے نیچے گوشت پھٹا ہوا تھا بائیں رخسار پر بھی ایک عجیب سا نشان تھا۔ آنکھ کے گرد سیاہ حلقہ نظر آرہا تھا دائیں پیشانی بھی زخم آلود تھی اور وہ بہت برے حال میں نظر آرہی تھی میرے حلق سے ایک دلخراش چیخ نکل گئی۔

"یہ کیا ہوا نگار یہ کیا ہوا کیا ہو گیا۔" اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔"

"اس نے اس کمینے نے اس کتے نے مجھ پر حملہ کیا تھا شاہد۔ وہی وہی سامنے کے فلیٹ والا۔"

میرے بدن میں چنگاریاں بھر گئیں اور پھر وہی ہو گیا جسے میں اب تک ٹالتا چلا آرہا تھا میں نے نگار کو بغور دیکھا اور وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں نے اس کے بال درست کیے اور اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور بولا۔

"آؤ نگار ہمت کرو۔ آؤ میرے ساتھ چلو۔ دیکھو منہ سے آواز نہ نکالنا جو کچھ میں کروں مجھے خاموشی سے کرتے رہنے دینا نگار ورنہ۔ ورنہ میں خودکشی کرلوں گا۔"

"کیا کرو گے شاہد تم؟" کیا کرو گے؟"

"ایک منٹ ایک منٹ رکو۔" میں نے کہا اور خاموشی سے اندر داخل ہو گیا باورچی خانے سے میں نے ایک تیز دھار کی چھری نکالی اور اسے اپنے لباس میں پوشیدہ کرلیا آج پھر میرے ذہن میں امین بھائی آگئے تھے میں نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے بعد جو زندگی میں نے گزاری تھی وہ ایک دم سے مجھ پر دوبارہ مسلط ہو گئی تھی۔ میں اس کمینے بدبخت کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے نگار کا حلیہ دیکھا اور پھر اس کا بازو پکڑ کر آہستہ سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"جوتا۔ جوتا تو پہن لوں۔" اس نے کہا اور میں نے اسے جوتا پہننے کی اجازت دے دی میں نے اس سے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں سامنے والی بلڈنگ کے دروازے سے اندر داخل ہوا اور اس فلیٹ کے سامنے پہنچ گیا جس میں وہ رہتا تھا۔ دروازہ بند تھا میں نے آہستہ سے اس پر دستک دی اور چند لمحات کے بعد اندر روشنی ہوئی اور دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھولنے والے کو میں نے ایک لمحہ بھی سنبھلنے کا موقع نہیں دیا میری لات اس کے پیٹ پر پڑی اور اس کے حلق سے ایک آواز نکل گئی۔ میں نے اسے بخوبی پہچان لیا تھا۔ وہی شخص تھا نگار بھی میرے ساتھ اندر داخل ہو گئی اور میں نے دفعتاً ہی اس پر حملہ کرکے اس کے دونوں ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر پیچھے کی جانب موڑ دیے۔ وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں پھر اس نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا؟"

"یہ سب' یہ سب کیا ہے۔ مم میں۔ میں۔ میں پوچھتا ہوں یہ سب کیا ہے۔ تم تو۔ تم تو۔"

مگر میں نے اسے جملہ پورا کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اچانک ہی میں نے اس کے دونوں ہاتھوں کو ایک جانب گھمایا اور جیسے ہی اس کا چہرہ میرے سامنے آیا۔ میرا ایک زور دار گھونسہ اس کے جبڑے پر پڑا۔ جبڑے کی ہڈی چٹخنے کی آواز صاف سنائی دی تھی اور اس شخص کے منہ سے ایک خوفناک آواز نکلی تھی اس کا منہ خون میں ڈوب گیا تھا۔

"مم۔ میں۔ میں۔ میں پوچھتا ہوں میں نے کیا کیا ہے۔ کچھ' کچھ بتاؤ تو سہی مجھے کچھ بتاؤ تو سہی اس کی آواز بمشکل تمام نکلی میں نے نگار کی جانب دیکھا۔

نگار کا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "کمینے کتے ذلیل اب معصوم بن رہا ہے میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں تجھے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گی۔

میں نے نگار کو اپنی کلائی سے پیچھے ہٹا دیا اور اس شخص کو گردن سے پکڑ کر اونچا اٹھا لیا۔ میری قوتیں انتہائی حد تک بڑھ گئی تھیں۔ میں نے اسے زمین پر دے مارا اور اس کے بعد اپنے لباس میں چھپا ہوا چاقو نکال لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ جما دیا تھا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ مجھ پر خون سوار ہو رہا تھا اور دوسرے لمحے میں نے تیز دھار والا چاقو اس کے نرخرے پر پھیر دیا۔ اس کا پورا جسم تڑپا اور مجھے اسے سنبھالنے میں کافی دقت پیش آئی اس کی گردن سے خون اچھل رہا تھا میں ہٹ کر پیچھے کھڑا ہو گیا۔ تاکہ میرا لباس زیادہ داغدار نہ ہو میں نے اس بدبخت کو فنا کر دیا تھا جس نے میری عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ ہم اس کے تڑپنے کا منظر دیکھتے رہے اور اس کے بعد مجھے ہوش آگیا میں نے سوچا کہ جو کچھ میں کر چکا ہوں اسے چھپانا بے حد ضروری ہے اب تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کسی نے مجھے یا نگار کو یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہماری واپسی بھی اسی انداز میں ہونی چاہیے۔

"میں نگار کا بازو پکڑے ہوئے اپنے فلیٹ میں واپس آگیا تھا شکر تھا کہ اس وقت رات کی خاموشی اور سناٹے کی وجہ سے ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ خون آلود چاقو میں نے غسل خانے میں لے جاکر دھویا اور پھر اپنے لباس پر نگاہ دوڑائی خون کی کچھ چھینٹیں میرے لباس پر پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے نگار سے کہا۔

"دروازہ بند کرلو اور اطمینان سے اپنا لباس وغیرہ تبدیل کرلو۔ اس کے بعد ہم سوچیں گے کہ ہمیں آئندہ کیا کرنا ہے کیوں کہ کسی کو تمہاری یہ کیفیت معلوم نہیں ہونی چاہیے یا پھر میں تمہیں بتا دوں گا کہ اگر کسی سے تمہاری ملاقات ہو تو تمہیں کیا کہنا ہے۔"

میں نگار کو یہ ہدایت دے کر غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ میرے غسل خانے کی عقبی کھڑکی کا رخ اسی جانب تھا جہاں سے وہ فلیٹ نظر آتا تھا۔ میں غسل خانے کی لائٹ جلا کر اپنے لباس کے خون آلود دھبے دھونے لگا۔ یہ لباس ضائع ہی کرنا پڑے گا۔ اس کا باقی رہنا نامناسب ہے شکر ہے کہ کسی نے ہمیں نہیں دیکھا۔ نگار بہت قابل اعتماد لڑکی ہے۔ وہ بھلا کسی کو کب یہ بتائے گی کہ میں نے کیا کیا ہے۔ ویسے بھی ظاہر ہے کہ میں نے اسی کی بے عزتی کا انتقام لیا تھا دل میں نجانے کیسے کیسے خیالات آرہے تھے نگار کے بارے میں میں نے یہ سوچا کہ اسے ایک کہانی بتا دوں گا تاکہ اگر کوئی اس سے اس بارے میں سوال کرے تو وہ اسے سنا دے۔ کہانی یہ ہوگی کہ میں کبھی کبھی دوستوں میں جا بیٹھتا ہوں۔ پچھلی رات دوستوں نے مجھے شراب پلا دی تھی اور شراب پینے کے بعد میں گھر میں داخل ہوا تھا۔ میں نے نگار کو مارا پیٹا تھا۔ ہاں یہی کہانی سب سے مناسب رہے گی یہی کہانی۔

میں نے کھڑکی سے اس فلیٹ کی جانب دیکھا جس کی بالکونی سے وہ ادھر دیکھتا رہتا تھا۔ اب اس کی منحوس لاش صبح کو ہی دستیاب ہوگی۔ میں نے تو کوئی ایسا نشان نہیں چھوڑا جس سے میرے بارے میں کوئی شبہ ہو سکے اور پھر شبہ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن فلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے دفعتاً ہی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ میں نے اس بلڈنگ کے دروازے پر کسی کو دیکھا تھا۔ اس کا حلیہ اور عقبی حصہ میرا جانا پہچانا سا تھا۔

نگار۔ میں نے حیرانی سے سوچا۔ وہ نگار ہی تھی یقینی طور پر وہ نگار ہی تھی۔ لیکن

میرا دل اچھل کر ایک بار پھر حلق میں آگیا۔ نگار دوبارہ وہاں کیوں گئی ہے کیا بات ہو گئی کیا کوئی ایسا نشان وہاں چھوڑ دیا ہم نے جسے ختم کرنے کے لیے نگار کا وہاں جانا ضروری ہوگیا۔

آہ کیا بات ہے۔ بدحواسی سے میں نے لباس تبدیل کیا اور ہانپتا کانپتا فلیٹ کے بیرونی حصے میں آگیا۔ نگار فلیٹ میں موجود نہیں تھی اس کے بعد میں پھرتی سے نیچے اترا اور اس بلڈنگ کی جانب دوڑنے لگا۔ نگار کہیں کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے اسے مجھ سے کہے بغیر وہاں نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچا فلیٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اندر روشنی تھی۔ میں نے محتاط نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا اور کھلے دروازے سے اندر داخل ہوگیا۔ لیکن روشنی میں ایک ہولناک منظر میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ نگار اس کی لاش پر جھکی ہوئی تھی اس کے ہونٹوں پر خون لگا ہوا تھا رخسار اور پیشانی پر بھی خون کے دھبے نظر آرہے تھے اس کی حالت اس وقت بالکل وحشی درندوں جیسی تھی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا ان آنکھوں میں ایک عجیب سا خمار تھا اور اس کی لمبی زبان بار بار اپنی ٹھوڑی اور اطراف میں بکھرے ہوئے خون کو چاٹ رہی تھی۔

میرا سانس رک گیا نیچے سے چوکیدار کی سیٹیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

O☆O

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھارودھن

آدھی رات گذر چکی تھی کہ اچانک پھر وہی جھنجھناہٹ کی آواز سنائی دی۔ ا
محسوس ہورہا تھا کہ درمیان والے کمرے کے نیچے کوئی ایک ساتھ کئی برتنوں کو لے
تال کے ساتھ جھنجھنا رہا ہے۔ برتنوں کی اس جھنجھناہٹ میں ٹھہراؤ نہیں تھا اور یہ آ
لگاتار سنائی دے رہی تھی۔ میں نے دھیان دے کر سننے کی کوشش کی تو مجھے لگا
جھنجھناہٹ کی یہ آواز درمیان والے کمرے سے شروع ہوکر اب برآمدے تک پھیل گ
ہے۔

برآمدے تک آنے کے بعد وہ آواز ایک پل کے لیے مدھم ہوگئی لیکن رکی نہ
بلکہ برآمدے سے اتر کر صحن تک پہنچ گئی لیکن صحن میں جاکر بھی وہ آواز بند نہیں ہوئی
یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ آواز صحن کے درمیان سے گزرتی ہوئی اب صحن کے دوسر
سرے پر لیموں اور انار کے درختوں کی جانب بڑھتی جا رہی ہے۔ پھر وہ آواز ان درخت
کے قریب بھی نہیں رکی بلکہ اب تو اس کی رفتار میں کچھ اور تیزی آگئی تھی اب وہ آوا
دس فٹ کے فاصلے پر موجود کنویں کی جانب بڑھنے لگی تھی۔

اس آواز کے سرکنے کی جو رفتار تھی وہ بھی ایک خاص ڈھنگ کی تھی۔ یوں لگ
تھا جیسے کوئی ڈھیر سارے برتنوں کو فرش پر ایک ساتھ گھسیٹ رہا ہو۔ بس یہی وجہ تھی ک

میرا تجسس اور بڑھ گیا اور میں اس آواز کو پہلے سے بھی زیادہ توجہ سے سننے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اس آواز میں ایک لمحے کے لیے ٹھہراؤ آگیا ہے لیکن دوسرے ہی پل میں نے سنا جیسے ایک ساتھ کئی برتن اس پرانے کنویں میں گر رہے ہوں۔ پھر سارا صحن اس شور سے گونج اٹھا سارا ماحول جھنجھنا اٹھا۔ وہ آواز کافی دیر تک گونجتی رہی۔ اس آواز کا اثر مجھ پر ایسا پڑا کہ آواز کے بند ہو جانے کے باوجود دیر تک مجھے اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی رہی۔

میں بہت زیادہ ڈر گیا تھا پھر بھی بڑی مشکل سے اٹھ کر میں نے کمرے اور برآمدے کی بتیاں روشن کر دیں۔ بلب کی روشنی میں وہ سیلن سے بھرا کھنڈر جیسا مکان ایک دم سے دانت نکال کر مجھے نگل لینے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اس زرد روشنی میں مکڑی کے جالوں میں دبکی ہوئیں مکڑیاں دیواروں پر پھیل پھیل کر رینگنے والی کالی کالی چھپکلیاں ایک پر خوف تاثر دے رہی تھیں۔ اس وحشت زدہ ماحول میں برتنوں کی جھنکار جیسی آواز بیچ بیچ میں گونج کر مجھے اور زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ مگر میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا تھا۔ کافی دیر بعد میں ہمت کر کے اٹھا اور صحن میں آگیا اور پھر وہیں صحن میں ہی ایک جانب چادر اوڑھ کر سو گیا۔

ترائی کے اس علاقے میں جب میں پہلے پہل آیا تھا تب ہی ان نیپالی پہاڑیوں کے بارے میں مجھے طرح طرح کے عجیب و غریب قصے سننے کو ملے تھے۔ میرا چپراسی گووندا سنگھ بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ اور مارکیٹ انسپکٹروں کے ساتھ اسے چپراسی کا کام کرتے ہوئے آٹھ دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اسی لیے وہ ہم سرکاری افسروں کے موڈ اور ہماری عادتوں سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ اسے میرے ساتھ بھی رہتے ہوئے آٹھ دس روز گزر چکے تھے۔ جب میں نے ایم والی کوٹھی کو اپنے رہنے کے لیے چنا تھا اور کرایہ ادا کرنے کے بعد میں نے پہلی بار گووندا سنگھ سے کہا تھا کہ وہ میرا سامان دن کے وقت اس کوٹھی میں پہنچا دے۔

میری بات سن کر پہلے تو گووندا سنگھ بڑی حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا مگر جب میں نے دوبارہ اسے حکم دیا تو وہ ہکلاتے ہوئے بولا: ”صا... صا... صاحب کیا آپ نے وہ کوٹھی کرائے پر لے لی ہے؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں لے لی ہے جبھی تو کہہ رہا ہوں کیوں؟" میرا جواب سن کر وہ سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس قدر خوفزدہ ہو کر آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟ میں نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی لیکن اس نے تو جیسے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ وہ خاموشی سے ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس وقت مجھے ایک انسپیکشن کے لیے جانا تھا۔ اسی لیے میں زور دے کر پوچھ نہیں سکا اور اپنے کام پر روانہ ہو گیا۔

دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد جب میں شام کو تھکا ہارا اس افیم والی کوٹھی کے سامنے پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ہمیشہ کی طرح یہ کوٹھی آج بھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ گووندا سنگھ میرا سامان لے کر آگیا ہو گا۔ مگر جب میں نے اسے نہ پایا تو میں الجھن میں پڑ گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید کسی وجہ سے وہ میرا سامان نہ لا سکا ہو میں نے کسی طرح اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کی اور دھیرے دھیرے کھپریل اور گھاس پھونس کے بنے ہوئے اس کچے مسافر خانے کی جانب چل پڑا۔ جہاں میں نے اپنا سامان وغیرہ رکھا تھا۔ لیکن وہاں کا تو ماحول ہی عجیب ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسافر خانے کے لوگوں نے پوچھنا شروع کر دیا۔ "کیا آپ سچ مچ اس کوٹھی میں رہنے جا رہے ہیں؟"

میں نے انہیں بھی وہی جواب دیا جو میں گووندا سنگھ کو دے چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد تنہائی پا کر گووندا سنگھ نے مجھ سے کہا۔ "مگر صاحب اس کوٹھی میں آپ کا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں؟ آخر ایسی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔ "صاحب اس کوٹھی کے نیچے "تھارو دھن ہے۔" گووندا سنگھ ڈرتے ڈرتے بولا۔

"یہ تھارو دھن کیا ہوتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا لیکن میرا سوال سن کر گووندا سنگھ کو ہنسی آگئی میں نے ہنستے ہوئے کہا "آپ اتنا بھی نہیں جانتے صاحب؟ زمین کے نیچے اگر کوئی اپنا دھن گاڑ کر مر جائے اور مرتے وقت اس کی روح اسی دھن میں لگی رہے تو اس دھن کو کوئی دوسرا شخص استعمال نہیں کر سکتا۔ یہاں پہاڑوں پر ایک ایسا قبیلہ رہتا ہے جسے تھارو قبیلہ کہا جاتا ہے۔ اور تھارو قبیلے کی ذات کے لوگ ہی ایسے مدفون خزانے کو زمین کے اندر سے نکالتے ہیں اور انہیں استعمال کرتے ہیں۔"

"کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ اس کوٹھی کے نیچے کوئی خزانہ دفن ہے؟"

"ہاں صاحب" گووندا سنگھ نے کہا "لوگوں نے اسے دیکھا ہے وہ دھن رات کے وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے۔ جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے تو بڑی بھیانک آواز پیدا ہوتی ہے اکثر لوگ اس کی آواز سے ڈر جاتے ہیں۔"

گووندا سنگھ کی بات سن کر مجھے ہنسی آگئی۔ لیکن اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ اسی گھمبیر لہجے میں بولا۔

"اور صاحب اس کوٹھی میں سوائے تھارو منڈلی کے اور کوئی ٹک ہی نہیں سکتا بس وہی لوگ اس میں رہ سکتے ہیں ان کی عورتیں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں صاحب۔ وہ دوسری ذات کے مردوں کو بھیڑ بکریاں بنا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ وہ جب کبھی پہاڑیوں سے نکل کر ہمارے علاقے میں آتی ہیں تو یہاں سے دھن اور مرد لوگوں کو لے کر ہی واپس جاتی ہیں اور کوئی ڈر کے مارے ان سے کچھ بول بھی نہیں سکتا۔"

"اچھا تو تم لوگ بھی ان سے ڈرتے ہو؟" میں نے مسکرا کر پوچھا۔

"ڈرنے کی بات تو ہے ہی صاحب" گووندا سنگھ نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "وہ عورتیں اتنی خطرناک ہوتی ہیں کہ اگر کوئی آدمی انہیں پسند آ جائے تو پھر ان سے جیتنا ناممکن ہو جاتا ہے وہ سب جادو ٹونا جانتی ہیں صاحب ٹونا کرتی ہیں۔"

رات کافی گزر چکی تھی اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح کو اپنا سامان اس افیم والی کوٹھی میں رکھوا کر ہی اپنے کام پر جاؤں گا۔ جو کچھ گووندا سنگھ نے بتایا تھا اسے سن کر تو میرا تجسّس اور بھی بڑھ گیا تھا۔ میں نے گووندا سنگھ کی باتوں پر اعتراض تو نہیں کیا تھا مگر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا کہ "تھارو" کا لفظ سنتے ہی میری آنکھوں کے آگے ایک انتہائی خوبصورت عورت کی تصویر ابھر آتی تھی سرخ و سفید چہرہ کچے آم کی پھانکوں جیسی بڑی بڑی آنکھیں اور شراب کی خوبصورت بوتل جیسا شرابور جسم۔ بس میں پھر اس کے تصور میں ہی ڈوب جاتا۔ گووندا سنگھ نے مجھے تھاروؤں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ بتایا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تھارو عورتیں بڑی لڑاکا ہوتی ہیں۔ وہ جب چاہتی ہیں آس پاس کے گاؤں کے لوگوں کو بھیڑ بکریاں بنا کر اپنے ساتھ لے جاتی ہیں۔ وہ گاؤں والوں کی مرغیاں اور بکریاں بھی پکڑ کر لے جاتی ہیں۔ لیکن کوئی کچھ نہیں بولتا۔ ایک بار ایک نوجوان نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہیں روکنے کی کوشش کی تھی مگر وہ تھارو عورتیں اس پر ٹوٹ پڑیں اور انہوں نے اس نوجوان کو جان سے مار ڈالا۔ پھر اس کے چھوٹے بھائی کو کتا بنا کر اپنے ساتھ لے گئیں۔"

گووندا سنگھ کی ایسی باتوں کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی۔

گول چہرہ سر پر گول ٹوپی اور پھولی پھولی سی آنکھیں چپٹی اور پھیلی ہوئی سی ناک ٹھگنا قد جو لالٹین کی روشنی میں بڑا عجیب سا دکھائی دیتا تھا۔

جب میں دورے سے واپس آیا تو گووندا سنگھ کانپ رہا تھا میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اسے تھارو عورت ملی تھی۔

"گووندا سنگھ کیا اس نے تمہیں کچھ نہیں بنایا؟ گھوڑا۔ بکرا کتا کچھ نہیں؟" میں نے ہنستے ہوئے مذاق سے پوچھا مگر اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا اور چپ چاپ میرے سامنے کھڑا خوف سے کانپتا رہا اس کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آ گئی تھوڑی دیر بعد میں کپڑے تبدیل کرکے واپس آیا تو گووندا سنگھ نے بتایا کہ اس نے صحن میں چارپائی لگا دی ہے۔ میں چونکہ بہت تھکا ہوا تھا اس لیے گووندا سنگھ نے جو کچھ کھانے کے لیے بنایا تھا اسے کھا کر جلدی سے چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے یہ اندازہ لگایا کہ صحن کے چاروں طرف پتھر کی دیواروں کا محرابوں والا برآمدہ ہے۔ داہنی جانب پانچ لیموں کے درخت ہیں اور ان درختوں سے تھوڑے فاصلے پر ایک پرانا ٹوٹا ہوا کنواں ہے جبکہ کنویں اور لیموں کے درختوں کے درمیان پتھر کا ایک چبوترا بھی ہے۔

رات کے تقریباً بارہ بجے ہوں گے۔ یکایک گووندا سنگھ برآمدے سے اٹھ کر میری چارپائی کے سرہانے آکر کھڑا ہو گیا اور ایک دم گھبرائی ہوئی آواز میں مجھے جگانے لگا۔

"صا... صاحب... صاحب..."

میں دن بھر کی تھکن کی وجہ سے گہری نیند میں تھا۔ اس لیے اس کی آواز سننے کے باوجود میں کروٹ بدل کر دوبارہ سو گیا۔ گووندا سنگھ نے مجھے پھر آوازیں دیں تو میری آنکھ کھل گئی اور میں اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میرے پوچھنے پر کہ بات کیا ہے؟ اس نے کنویں کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے کنویں کی جانب دیکھا تو مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا تب میں نے ڈانٹ کر اس سے کہا۔ "ادھر کیا انگلی اٹھا رہے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟"

میری ڈانٹ سن کر جیسے اس میں ہمت آ گئی اور وہ بولا "صاحب.......... عورت"

عورت کا نام سنتے ہی جیسے ایک سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی جس طرف اشارہ کر رہا تھا ادھر پلٹ کر دیکھا لیکن کہیں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خود گووندا سنگھ بھی حیران دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا لیکن وہ اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے پھر اسی سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں صاحب............ وہ آئی تھی۔ ابھی.......... ابھی یہاں آئی تھی.......... وہ وہاں اس پتھر کے چبوترے پر بیٹھی تھی۔

"اچھا" میرا تجسس بھی بڑھ گیا اور میں نے کہا۔ "جاؤ لالٹین لے آؤ۔"

وہ لالٹین لے آیا تو میں لالٹین لے کر اس چبوترے تک گیا پھر میں نے لیموں کے جھنڈ کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا مگر کہیں کچھ دکھائی نہیں دیا تو جھنجلا کر واپس آ گیا اور پھر سے چارپائی پر سو گیا گووندا سنگھ سے ڈانٹ کر کہہ دیا کہ مجھے نہ جگایا جائے۔ وہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گیا۔

مگر ابھی مجھے پوری طرح نیند بھی نہیں آئی تھی کہ ایک دم جھنجھناہٹ کی آواز نے میری نیند اڑا دی اور میں چونک کر بیٹھ گیا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سینکڑوں ہزاروں برتن ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے اور جھومتے ہوئے چلے جا رہے ہوں۔ اچانک میرے دل میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ میں نے چاہا کہ میں خود ہی گووندا سنگھ کو جگا دوں۔ مگر یکایک مجھے خیال آیا کہ میں خود اپنی بات سے پھر رہا ہوں۔ آفیسر آدمی ٹھہرا اس لیے خوف زدہ ہو کر گووندا سنگھ کو جگانے میں مجھے اپنے بے عزتی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں چپ چاپ پائی چارپائی پر لیٹ گیا۔ لیکن اس جھنجھناہٹ کی عجیب و غریب آواز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ بلکہ وہ آواز اب پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

میں نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ وہ آواز ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے اور وہ اس بیچ والے کمرے سے رینگتی ہوئی مسلسل برآمدے اور صحن سے ہوتی ہوئی میری چارپائی کی جانب بڑھتی چلی آ رہی ہے۔ میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ میری آنکھیں پتھرا رہی تھیں اور آواز حلق میں اٹک رہی تھی۔ گلا سوکھ رہا تھا اور آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے تھے میری زبان خشک ہو چکی تھی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ وہ بھیانک آواز میری طرف ہی بڑھتی آ رہی تھی..........

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن خوف کی اس حالت میں میرا دماغ ٹھیک کام کر رہا تھا اور میں نے محسوس کہ میں کسی پراسرار واقعے میں ڈوبتا جا رہا ہوں۔ پھر بھی میرے اندر کچھ ہمت ابھی تھی۔ اس لیے میں جھنجھناہٹ کی ایک زور دار آواز سنتے ہی اپنی چارپائی سے اٹھ کھڑا میرے پاؤں اس طرح کانپ رہے تھے کہ لگتا تھا میں ایک قدم بھی نہیں چل پاؤں گا لیکن ہمت کر کے میں نے اپنا پاؤں اٹھایا اور دھیرے دھیرے گوونداسنگھ کے قریب آ اور لالٹین کی روشنی تیز کر دی۔ اس روشنی میں جو کچھ میں نے دیکھا وہ بڑا ہی عجیب تھا میرے سامنے گوونداسنگھ پڑا تھا بے ہوش۔ خاموش اور بے حس و حرکت.......... میں نے اسے جھنجھوڑ کر جگانا چاہا لیکن وہ نہ جانے کیسی نیند میں اور کیسی بے ہوشی میں تھا کہ اٹھ ہی نہیں رہا تھا۔ ایک پل کے لیے مجھے یوں لگا کہ وہ مر چکا ہے لیکن کئی بار زور زور سے جگانے پر اس کے جسم میں ذرا سے جنبش ہوئی یہ دیکھ کر میری جان میں جان آ گئی پھر کسی طرح وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ میں نے اس کے ساتھ لالٹین لے کر پورے گھر کا معائنہ کیا ہر جگہ خوب اچھی طرح دیکھا لیکن کہیں بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ دھندلی سی پرچھائیں بھی جو تھوڑی دیر قبل میں نے دیکھی تھی اس کا بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا لیکن برتنوں کی پراسرار جھنجھناہٹ کی آواز ویسی ہی تیز تھی۔ میں نے برآمدے سے لے کر صحن تک کا معائنہ کیا۔ ایک خاص جگہ پر جہاں سے وہ آواز اٹھ رہی تھی میرا پاؤں پڑا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ آواز جیسے سیدھی اس ٹوٹے ہوئے کنویں کی جانب بڑھتی جا رہی ہے پھر تھوڑی ہی دیر بعد ایک گڑگڑاہٹ کی آواز آئی اور میں نے دیکھا کہ ایک نہیں بلکہ کئی بڑے بڑے تھال خود بخود ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے اس کنویں میں گر رہے ہیں گوونداسنگھ تو ان کے گرنے کی آواز سن کر وہیں گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔ میرا بھی پورا جسم کانپ رہا تھا خوف کے مارے مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔ مگر نہ تو میرے ہاتھ سے لالٹین چھوٹی اور نہ ہی میں گوونداسنگھ کی طرح بے ہوش ہوا۔ میں نے ہمت کر کے گوونداسنگھ کو اٹھایا اور پھر میں خود بھی اپنی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ میرے دل و دماغ پر اتنا خوف طاری تھا کہ میرے لیے نیند حرام ہو کر رہ گئی تھی۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا گوونداسنگھ میری چارپائی کے قریب سہما سہما سا کھڑا ہے میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن بار بار بات اس کے

منہ تک آ کر رک جاتی ہے۔ آخر میرے کئی بار پوچھنے پر وہ بمشکل بولا اس کی آواز کانپ رہی تھی اور الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ اس نے کہا وہ آج سے رات کے وقت اس ایفم والی کوٹھی میں نہیں رہے گا۔ میں نے تو پہلے اسے سمجھایا لیکن وہ فیصلہ کر چکا تھا اس لیے میں نے زیادہ زور دینا مناسب نہیں سمجھا اور اس کوٹھی میں اکیلے رہنے پر تیار ہو گیا۔

میں دن بھر اپنے کام میں مصروف رہا۔ مگر پچھلی رات کے سارے واقعات ابھی تک میرے ذہن میں ناچ رہے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں تمام دن کھویا کھویا سا رہا تھا۔ شام کو جب ایفم والی کوٹھی میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ گوونداسنگھ کہیں باہر سے دوڑا ہوا آ رہا ہے۔ راستے میں' میں نے اسے دو تین بار ٹھوکر کھا کر گرتے ہوئے بھی دیکھا۔ جب وہ میرے بالکل قریب آ گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ہانپ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس نے بتایا کہ اس نے ایک دوسرے گھر کا انتظام کر لیا ہے اور ابھی اس گھر کی مالکن بھی یہاں آ رہی ہے۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس ایفم والی کوٹھی کو چھوڑ دوں اور اس نئے مکان میں چلا جاؤں لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور بے پرواہی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ "جانے دو گوونداسنگھ میں تو اسی کوٹھی میں رہوں گا آخر دیکھوں تو سہی یہاں ہوتا کیا ہے؟"

"آپ نہیں جانتے صاحب۔" گوونداسنگھ ڈرتے ڈرتے بولا۔ "یہ ٹھارو عورتیں مردوں کو مار کر ان کے خون میں روپے پیسے ڈبو کر زمین میں گاڑ دیتی ہیں... وہ جو رات میں جھنکار ہو رہی تھی وہ اسی گڑے ہوئے پیسوں کی آواز تھی.......... جو نئے مکان کی مالکن یہاں آ رہی ہے اس نے بھی مجھے ایک دردناک قصہ سنایا ہے۔"

"سنایا ہوگا" میں نے بے پرواہی سے کہا۔ "مگر مجھے اس قصے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں اسی جگہ رہوں گا..........اسی کوٹھی میں .... میری بات سن کر گوونداسنگھ بالکل ہی ناامید ہو گیا۔ پھر وہ اندر جا کر بے دلی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد اس کھنڈروں جیسی ایفم والی کوٹھی میں اب میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ گووندا سنگھ کی طرح میرا بستر صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر ہی لگایا گیا تھا۔ میں سرہانے لالٹین رکھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر ایک کتاب پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے تھوڑی دیر بعد مجھے نیند آگئی۔ لیکن نیند میں مجھے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔ کوئی انتہائی حسین عورت اپنے بال کھولے اور نشے میں چور میری چارپائی پر بیٹھی اپنی نازک انگلیوں سے میرا سر سہلا رہی ہے۔ اس کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی میں محسوس کر رہا تھا کہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں ہوش میں ہوں۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ میں اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا تھا اور نہ ہی کچھ بول سکتا تھا ان نشیلی آنکھوں نے جیسے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ پھر جب میں نے ہمت کر کے زبردستی اٹھنا چاہا تو مجھے لگا کہ وہ خوبصورت اور سحرانگیز مجسمہ آہستہ آہستہ پیچھے سرکتا جارہا ہے۔ یکایک میں گھبرا کر چیخ پڑا۔ ”کون.......... کون ہو تم؟“

مگر میری آواز فضا میں تحلیل ہوگئی۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا مگر نہ جانے اس حسن میں کیسا جادو تھا کہ مجھے لگا کہ میں اس کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ میں بے اختیار اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ لیکن وہ برآمدے تک پہنچ کر میری نظروں سے غائب ہوگئی۔ اس کے غائب ہوتے ہی پھر وہی برتنوں کی جھنجھناہٹ تیزی سے گونجنے لگی۔ ایسے محسوس ہوا جیسے کنویں میں کچھ ہو۔ میں ٹارچ اور لالٹین کی روشنی میں کنویں کے اندر جھانکنے لگا۔ مجھے اب یوں لگ رہا تھا کہ وہ پیتل کی گاگریں بھی نہ ہوں بلکہ گیس سے بھرے غبارے ہوں۔ جو کنویں کی تہہ سے ابھر کر اوپر کو آرہے تھے۔ پیتل کی وہ گاگریں مضبوط پیتل کے ڈھکنوں سے بند تھیں اور ان کے منہ پر گہرے لال رنگ سے کوئی نشان بنا ہوا تھا۔ میں کھڑا ایک ٹک دیکھتا رہا۔ کنویں سے ایک ایک گاگر اٹھ کر کنویں کے ٹوٹے ہوئے منڈیر پر آجاتی تھی۔ یکایک منڈیر کے قریب کی زمین پھٹ گئی اور وہ پیتل کی بھاری بھرکم چمکیلی گاگریں ایک ایک کر کے اس میں سما گئیں۔ پھر وہ چھن چھن کرتی ہوئی آواز زمین کے نیچے تیرتے تیرتے اسی بیچ والے کمرے میں چلی گئی پھر یکایک ہی گہرا سکون چھا گیا اور میں واپس اپنی چارپائی پر آگیا۔ لیکن اچانک کچھ سوچ کر میں اٹھا اور کوٹھی کے اس بیچ والے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

ایم والی اس کوٹھی سے پچھلے ایک ہفتے سے میرا تعلق تھا اور اس ایک ہفتے میں کئی بار میں دن کے وقت بھی یہاں آیا تھا لیکن کبھی بھی اس بند کمرے کے بارے میں میں نے نہیں سوچا تھا۔ میرے دماغ میں یہ بات آئی ہی نہیں تھی کہ جب ساری کوٹھی کھلی ہوئی

ہے تو صرف یہ ایک کمرہ ہی کیوں بند ہے؟ میں ہمت کر کے اس کمرے کا دروازہ کھولنے لگا مگر اس کی کنڈی کھولتے ہی مجھے لگا جیسے کوئی میری کلائی پکڑ کر زور سے مروڑ رہا ہوا اور کلیجہ منہ کو آرہا ہو۔ میں نے کمرے کی کنڈی جان بوجھ کر نہیں چھوڑی تھی بلکہ وہ تو خود خود ہی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی اور کمرے کا دروازہ چوکھٹ سے اسی طرح چپکا رہا ۔نذا ناامید ہو کر میں ایک بار پھر اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گیا اسی طرح کئی روز گزر گئے۔ اکثر ہارپائی پر پڑے پڑے مجھے لگتا کہ جیسے وہی حسینہ میرے پاس بیٹھی ہوئی اپنی نازک انگلیوں سے میرا سر سہلا رہی ہے یا میرے چہرے کے پاس اپنا منہ لاکر دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہی ہے میں اس کی نشیلی اور شرارتی آنکھوں میں کھو کر رہ جاتا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا ں کیوں چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح میرے پاس بیٹھی رہے؟ ہمیشہ میرے پاس رہے؟ لیکن یک طرف جہاں مجھے اس پراسرار حسینہ سے دلچسپی تھی وہاں اس کوٹھی کے بیچ والے لمرے کے بارے میں بھی سخت تجسّس تھا۔ وہ کمرہ نہ جانے کب سے بند تھا۔ کیوں بند ما؟ میں نے گووندا سنگھ سے بھی کہا اسے انعام دینے کا لالچ بھی دیا لیکن وہ اسے کھولنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا میرے بہت کہنے پر وہ ایک دن نہ جانے کہاں سے ایک نوجوان لو پکڑ لایا اور بولا کہ یہ نوجوان اس کمرے کا دروازہ کھولنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے ں نوجوان کو نیچے سے اوپر تک دیکھا اس کی عمر چوبیس پچیس سال کی ہوگی اور وہ گورا چٹا حت مند نیپالی تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور اس کے انگ انگ ں جوانی کا جوش لہریں مار رہا تھا۔

”کیا تم اس کمرے کا دروازہ کھول سکتے ہو؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہاں صاحب۔ کہیے تو ابھی کھول دوں؟“

”ابھی نہیں۔ میں نے کہا ”اسے رات کو کھولنا پڑے گا کیونکہ اس وقت تو وہاں کا سارا خزانہ کنویں میں ہے۔“

”کیوں؟“ اس نوجوان نے حیرت سے پوچھا۔

”ہر رات اس کمرے کا سارا خزانہ نکل کر اس کنویں میں چلا جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”تو کیا آپ اس سے ڈرتا ہے صاحب؟“ اس نے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں ڈرتا نہیں ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں تو صرف اس کا راز جا
ہوں۔"

میری بات سن کر وہ نوجوان اپنی پراسرار آنکھوں سے مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا
اس سے میں نے پھر کہا۔ "میں نے جتنی بار بھی اس دروازے کی کنڈی پر ہاتھ لگایا
ایسا لگا جیسے کوئی میری کلائی مروڑ دے گا کیا تمہیں ایسا محسوس نہیں ہو گا؟"

"ہو گا صاحب۔" وہ بولا۔ "لیکن ہم منتر جانتا ہے وہ جو آپ کا ہاتھ پکڑتی
اس کو اپنا داسی بنا کر رکھے گا صاحب۔"

"وہ کیسے؟"

"منتر سے پہلے ہم منتر کا جاپ کرے گا۔ اس کی جوانی اس کے حسن اور اُ
پیاسی روح کی پیاس کو مٹائے گا اور پھر........." وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے
سے پوچھا "مگر وہ ہے کون؟ جس کی روح کی تم پیاس بجھاؤ گے؟"

"وہ تھارو ہے صاحب......... تھارو" اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔

گوونداسنگھ نے اسے بیس روپے دینے کے لیے کہا تو میں نے بیس روپے
دے دیے اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور وہ جلدی جلدی روپے کو اپنی جیب
ڈالتے ہوئے بولا۔ "صاحب آپ کل رات کو زمین پر سونا اور اپنا چارپائی ہم کو
دینا۔"

میں نے کچھ نہیں کہا اور دوسرے دن کے انتظار میں لگ گیا تمام دن انتظار کر
مگر وہ نہیں آیا تو میں نے سمجھا کہ شاید وہ میرے بیس روپے ہضم کر گیا پھر شام ہو گئی
بھی اس کا کوئی پتا نہیں تھا میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی میں نے کئی بار گوونداسنگھ
پوچھا لیکن اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔ پھر رات کے آٹھ بجے تک
نہیں آیا اب مجھے یقین ہو گیا کہ گوونداسنگھ نے اس سے ساز باز کر کے مجھ سے
روپے نکلوا لیے ہیں میں اس سلسلے میں گوونداسنگھ سے بازپرس کرنے ہی والا تھا کہ
میں نے دیکھا کہ ایک بوتل شراب' پھولوں کی مالا اور جانے کتنی رنگ برنگی کوڑیاں
اور سیپیوں کی مالائیں پہنے وہ نوجوان میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ نشے میں چور
کے قدم لڑکھڑا رہے تھے وہ جو کچھ بھی بولتا تھا وہ بھی ادھورا ہی رہ جاتا تھا۔ اس

کھلے ہوئے کمرے کی طرف دیکھا جہاں ایک چارپائی پڑی تھی اس نے اسی چارپائی پر بستر لگا
دینے کے لیے کہا۔ گوونداسنگھ میری چارپائی سے دری اور چادر لیجا کر اس چارپائی پر بچھا
دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نوجوان اس کمرے میں گیا اور سرسوں کے تیل کا ایک دیا جلا دیا
پھر فرش پر سفید چاک سے کچھ لکھ کر اس پر پھولوں کا ہار رکھ دیا اور پہاڑی زبان میں کوئی
گیت گانے لگا۔ وہ مسلسل کئی گھنٹوں تک اسی طرح گاتا رہا چیخ چیخ کر گانے کی وجہ سے
اس کے منہ سے ٹھیک طرح سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے وہ بڑی بھدی اور بے سری
آواز میں گا رہا تھا اور میں سامنے برآمدے میں بیٹھا اس کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔

دو گھنٹے سے زیادہ ہو چکے تھے کہ اچانک نہ جانے کیوں جلتے ہوئے دیے کی لو بری
طرح سے کانپنے لگی نشے میں چور شرابی کی طرح وہ جھوم جھوم کر پھر بھڑک جاتی تھی ایک
بار تو لگا جیسے دیا ہی بجھ گیا ہو کیونکہ کمرے میں بالکل اندھیرا سا چھا گیا۔ مگر اس نوجوان کے
گانے کی آواز مسلسل آرہی تھی اور آخرکار وہ دیا بجھ ہی گیا اور اس کے ساتھ ہی اس
نوجوان کے گانے کی آواز بھی بند ہو گئی۔ چند لمحوں بعد کمرے میں پھر ہلکی ہلکی روشنی سی
دکھائی دینے لگی اور اس مدھم دودھیا روشنی میں ایک نوجوان اور انتہائی خوبصورت
عورت کا حسن بھی چمکتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اس کے لمبے لمبے سیاہ بال اس کے شانوں پر
بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر ایک چولی تھی جبکہ کمر سے نیچے اس نے بہت چست
مختصر سا گھیر دار گھاگھرا پہن رکھا تھا وہ کمرے کی ایک دیوار سے چپکی کھڑی تھی اس کے
میں نہ جانے کیسی کشش تھی کہ میرا دل خود بخود اس کی جانب کھنچا جا رہا تھا۔

یکایک اس نوجوان نے ایک پیالے میں شراب انڈیل کر اس کی جانب بڑھا دیا اس
عورت نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ایک ہی سانس میں پیالہ خالی کر گئی۔ نوجوان
نے خالی پیالہ پھر بھرا اسے بھی وہ پی گئی تھوڑی دیر بعد مجھے لگا کہ بوتل کی شراب ختم ہو
رہا ہے اور وہ نوجوان حسینہ لڑکھڑاتی ہوئی اس نوجوان کے بالکل قریب آکر بیٹھ گئی اور پھر
یک ہی اس نے نوجوان کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ نوجوان پھر سے گیت گانے لگا تھا۔ اب
عورت نے اس کے ماتھے پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا پھر تھوڑی دیر بعد اس نوجوان کا
گیت رک گیا اور کمرے میں پھیلی ہوئی پراسرار روشنی بھی دھیمی ہو گئی اور پھر اچانک ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کمرے کے کواڑ بھی خود بخود بند ہو گئے۔

میری ساری توجہ اسی کمرے پر لگی ہوئی تھی اس لیے میں نہیں جان رہا
والے کمرے میں کیا ہو رہا ہے؟ لیکن جب اچانک گووندا سنگھ نے چیخ کر کہا کہ
دروازہ کھل گیا ہے تو میں بڑی بے چینی سے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ برآمدے
میں نے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دیکھ لیا تھا کہ کمرے کے فرش پر سونے
گنیاں اور اشرفیاں بچھی ہوئی ہیں۔ سامنے دیوار سے لگی ہوئی کئی الماریاں تھیں
سینکڑوں کی تعداد میں سونے کی سلاخیں اور سونے کی مہریں رکھی ہوئی تھیں۔ کمر
چاروں دیوار سے لگی ہوئیں تقریباً سو پیتل کی گاگریں اوپر تلے رکھی ہوئی تھیں۔
کے بالکل بیچوں بیچ ایک تخت یا چوکی جیسی کوئی چیز تھی جس پر ایک دیا دھیمے جل
دیے کی اس مدھم روشنی میں سونے کے سکوں اور اشرفیوں کی چمک اور بھی تیز لگ
تھی۔

یکایک میں نے ہمت کر کے قدم اٹھایا اتنی ہمت مجھ میں کہاں سے آ گئی تھی
خود بھی نہیں معلوم تھا میں نے آگے بڑھ کر کمرے میں داخل ہونا چاہا لیکن جیسے
نے اپنا ایک پاؤں آگے بڑھایا اس کمرے کا دروازہ بند ہو گیا اور باہر سے اس کی کنڈ
لگ گئی۔ میں حیران نگاہوں سے دیکھتا رہا یہ سب مجھے بے حد پر اسرار لگ
آخر تھک ہار کر میں فرش پر بچھے ہوئے اپنے بستر پر آ کر بیٹھ گیا پھر مجھے یاد نہیں
مجھے نیند آ گئی یہ سارے واقعات گووندا سنگھ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا مگر
وہ بھی کب سو گیا تھا؟

صبح جب میری آنکھ کھلی تو اندر باہر کی ابتر حالت دیکھ کر میری پریشانی اور
گئی۔ وہ نوجوان کمرے میں بے ہوش پڑا تھا اور گووندا سنگھ اپنے بستر سے غائب
بار بار اس نوجوان کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جیسے میں سب کچھ بھول
یہاں تک کہ مجھے گووندا سنگھ کا نام بھی یاد نہیں آ رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے میرا اپنا
باقی نہیں ہے رہ رہ کر میرے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ میں جیتے ہوں ہی نہیں۔
میرا ذہن مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا اور اسی کیفیت میں میں پورے ایک
چپ چاپ بیٹھا رہا۔ دن چڑھ رہا تھا اور سورج کی کرنیں تیزی سے پہاڑوں اور

پھیل رہی تھیں۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ نوجوان مر تو نہیں گیا اس خیال کے
آتے ہی میں ہمت کر کے اٹھا اور اس کے کمرے کی جانب بڑھا۔ کمرے میں شراب کی
خالی بوتل بجھی ہوئی لوبان دانی' پھولوں کے ہار سب کچھ فرش پر ادھر ادھر بکھرے ہوئے
پڑے تھے میری چارپائی اور بستر پر پھولوں کی بہت ساری پتیاں بکھری اور مسلی ہوئی پڑی
تھیں۔ میں آگے بڑھ کر اس نوجوان کو جگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں
نشے کی حالت میں اس کی آنکھیں سوج کر کچھ عجیب سی ہو گئی تھیں پہلے تو اس نے میری
طرف دیکھا پھر آنکھیں موند کر سو گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اچانک
میں اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا کافی دیر بعد وہ ہوش میں آیا اور لڑکھڑاتی ہوئی
آواز میں بولا "میں..... میں تو مر گیا صاحب....."

"کیوں؟ کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے میرا منتر توڑ دیا.... میری شکتی توڑ دی صاحب...." وہ بھرائی ہوئی آواز میں
بولا۔ "اب تو جب وہ چاہے گی مجھے اپنے پاس بلا لے گی لیکن میں چاہوں گا تو اسے نہیں
بلا سکوں گا۔"

حالانکہ رات کے سارے واقعات میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن پھر بھی
مجھے لگ رہا تھا کہ یہ سب بکواس ہے رہ رہ کر میرے اندر یہ جو ہٹ دھرمی سی جاگ پڑتی
تھی یہ بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھی۔ میں نے اس نوجوان کی ساری باتیں ان سنی کر دیں
وہ بے چارہ مجبوراً تھوڑی دیر بعد خود ہی اٹھ کر چلا گیا۔ اس دن نہ تو گووندا سنگھ واپس آیا
اور نہ ہی میں اپنے کام پر جا سکا۔

کئی دن بعد میرے دماغ میں ایک اور فتور آیا اور میں سوچنے لگا کہ اتنا سارا دھن
اس کمرے میں پڑا سڑ رہا ہے کیوں نہ اس کو کسی طرح سے نکال کر کسی نیک کام میں خرچ
کر دینا چاہیے آخر بہت سوچنے کے بعد میں نے سرکار کو بھی اس کی اطلاع دے دی اور
خود بھی جا کر آفیسروں سے بات کی لیکن کسی کو بھی جیسے مجھ پر یقین ہی نہیں ہوتا تھا۔ جب
میں نے ان لوگوں کا یہ رویہ دیکھا تو واپس آ کر اپنے کام میں لگ گیا لیکن کبھی کبھی اس
بارے میں سرکاری محکمے سے خط و کتابت ضرور ہو جاتی تھی۔

ٹھیک ایک مہینے بعد وہ نوجوان شراب کے نشے میں چور شام کے وقت پھر میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس آیا پہلے تو میں اسے دیکھ کر کشمکش میں پڑ گیا کیونکہ مجھے تو یہ یقین ہو چکا تھا کہ اس رات کے واقعے کے بعد وہ لوٹ کر نہیں آئے گا اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اس عورت کے ہاتھوں وہ اس طرح شکست کھا چکا ہے کہ اسے اپنی حالت سدھارنے میں مہینوں لگ جائیں گے لیکن اب اس میں وہ پہلی سی چمک دمک اور خود اعتمادی نظر نہیں آ رہی تھی۔

وہ بہت تھکا تھکا میری چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا "صاحب..... مجھے..... آج اس نے بلایا ہے۔"

"کس نے بلایا ہے تمہیں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"اس تھارو عورت کی آتمانے" اس نے کہا اور پھر وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ اس خزانے والے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور وہی خوبصورت عورت کا مجسمہ اس دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا ہے پھر وہ تھارو عورت دھیرے دھیرے ساتھ والے کمرے کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ نوجوان میرے قریب بیٹھا اسی طرح تھر تھر کانپ رہا تھا میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ عورت سفید مگر چمکیلے کپڑے پہنے ہماری جانب پیٹھ کیے برآمدے میں کھڑی تھی۔ کبھی کبھی وہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتی تھی اور اس کی نگاہ کا مرکز وہی نوجوان ہوتا تھا۔ وہ جب بھی پلٹ کر اسے دیکھتی تھی تو وہ ایک دم بے ہوشی کی کیفیت میں اور بھی زور زور سے کانپنے لگتا تھا یکایک وہ دھیرے دھیرے اس کمرے کی طرف بڑھی اور اس بار میرے پاس بیٹھا ہوا نوجوان بھی اٹھ کر کانپتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور پھر دونوں اس کمرے میں داخل ہو گئے۔

ٹھیک آدھی رات کے وقت اچانک اسی کمرے سے کسی عورت کے ہنسنے کی آواز سن کر میں جاگ پڑا لمحہ بہ لمحہ وہ ہنسی بڑھتی جا رہی تھی اور یکایک مجھے محسوس ہوا کہ یہ ہنسی اب مجھے بھی چھو رہی ہے میں اٹھ کر بیٹھ گیا کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ عورت اس نوجوان کے ساتھ داد و عیش میں مصروف ہے۔ وہ اس نوجوان کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے پیاسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک مجھے کچھ دنوں پہلے کی بات یاد آ گئی "تھارو عورت کی روح میری چارپائی پر بھی آ کر بیٹھ جاتی تھی اور میرے چہرے پر جھک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہتی تھی اس بات کو یاد کر کے میرے دل کی بے

قراری آج بھی بڑھ جاتی ہے کہ میں اس یاد کو اپنے ذہن سے نکال کر پھینک دینا چاہتا ہوں اس دن تو میرے دل کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے پھر اس کی تیز ہنسی کی آواز سنائی دی اس کے بعد وہ آواز بند ہو گئی پھر اس کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا لیکن اس کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی خزانے والے کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا نہ جانے کون سی طاقت تھی جو ایک بار پھر میرے اندر زور کرنے لگی تھی میں اپنی چارپائی پر سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس کمرے کے پاس آ گیا جس کے اندر اس نوجوان کے ساتھ وہ تھارو عورت کی روح تھی میں نے چپ چاپ اس کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی دوسرا ہاتھ میری کلائی پکڑے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی اور میں پہلے سے زیادہ نڈر ہو گیا۔ میں نے ٹارچ روشن کر دیں اور بیچ والے کمرے کی طرف بڑھا اس بار میں اس کمرے کے اندر چلا گیا فرش پر سونے کی گنیاں اور اشرفیاں اسی طرح بچھی ہوئی تھیں۔ کھلی ہوئی الماریوں میں سونے کی سلاخیں اور مہریں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں اور پیتل کی گاگریں بھی اسی طرح دیواروں سے لگی رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے فرش پر پڑی ہوئی سونے کی گنیوں اور اشرفیوں کو پہلے اٹھایا۔ پھر میں دونوں ہاتھوں سے انہیں اٹھا اٹھا کر اپنی پتلون اور کوٹ کی جیبوں میں ڈالنے لگا مجھے جیسے کچھ اور دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا جی بھر کر میں نے گنیاں اور اشرفیاں ٹھونس ٹھونس کر اپنی جیبوں میں بھر لیں۔ یکایک میں نے دیکھا کہ میرے سامنے والی الماری کے اوپر ایک ڈیڑھ بالشت لمبا بچھو لٹک رہا ہے میں ڈر کر پیچھے کی جانب سرکنے لگا۔ لیکن میرے پیچھے بھی ڈیڑھ بالشت کا ایک بچھو تھا جو دھیرے دھیرے میری جانب ہی بڑھ رہا تھا۔

میں نے کمرے سے نکل جانا چاہا لیکن ان میں سے ایک دروازے کی چوکھٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا اور دوسرا میرے سامنے تن کر مجھے گھورنے لگا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری میں سنبھل سنبھل کر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔ جوں جوں میرے قدم باہر کی چوکھٹ کی جانب اٹھتے جا رہے تھے توں توں چوکھٹ پر کھڑے ہوئے بچھو کا غصہ بھی بڑھتا جا رہا تھا وہ اپنا ڈنک اٹھائے وہیں ناچ رہا تھا جیسے ہی میں نے باہر جانے کے لیے اپنا پاؤں اٹھایا۔ ویسے ہی اس سیاہ بچھو نے اپنی ٹانگوں سے اپنا جسم اٹھا لیا اور اپنے ڈنک کو بار بار لہرانے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے دل میں یہ ٹھان لیا تھا کہ اپنی جیب سے ایک بھی گنی یا اشرفی باہر نہیں جانے دوں گا میں نے اپنا اٹھایا ہوا قدم آہستہ سے نیچے کرلیا اور تب ہی میری نظر پیچھے کی جانب گئی تو میں نے دیکھا کہ دوسرا بچھو بھی تیزی سے میری طرف بڑھ رہا ہے اسے دیکھ کر میں اپنی بائیں جانب ہٹ گیا اور ٹھیک اسی وقت بچھو نے مجھ پر چھلانگ لگائی تھی لیکن میرے ہٹ جانے کی وجہ سے وہ اشرفیوں میں ڈھکے ہوئے فرش پر گر کر ناچ گیا اس کی پھیلی ہوئی ٹانگوں اور اٹھے ہوئے ڈنک کو دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا کہ بہت ہی غصے میں ہے۔ اب وہ دھیرے دھیرے جوتے کی طرف بڑھ رہا تھا ایک بار میرے جی میں آیا کہ میں اسے اپنے جوتے سے مسل دوں لیکن پھر یکایک مجھے یہ خوف لگا کہ کہیں اس کا خوفناک ڈنک میرے جوتے کے بھی پار نہ نکل جائے میں نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی ٹارچ کو جلا کر اس پر روشنی ڈالی میرا خیال تھا کہ روشنی کی وجہ سے وہ ایک جگہ سہم کر رک جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا اور وہ ٹارچ کی تیز روشنی میں بھی غصے کی حالت میں میری طرف بڑھ رہا تھا۔

اچانک اسے بہت زیادہ قریب دیکھ کر میں نے اپنی ٹارچ سے ہی اس کو مارنا شروع کر دیا یہ دیکھ کر دوسرا بچھو جو ابھی تک چوکھٹ پر کھڑا ناچ رہا تھا نیچے اتر آیا اور میری جانب بڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں تھا لہٰذا میں نے وہاں سے ہٹ کر چوکھٹ کے قریب کھڑے ہو جانا ہی مناسب سمجھا اور دروازے کے بالکل قریب جاکر کھڑا ہو گیا مجھے اس طرح دروازے کے باہر جاتے دیکھ کر وہ بچھو آدھے راستے تک آنے کے بعد لوٹنے لگا اور اس موقع کا فائدہ اٹھا کر میں دروازے سے باہر نکل آیا بچھو پھر چوکھٹ پر آکر ناچنے لگا تھا۔

باہر آتے ہی مجھے لگا کہ میرا سر چکرانے لگا ہے مجھے ڈر تھا کہ کہیں میں گر کر بے ہوش نہ ہو جاؤں لیکن اس کے باوجود میں اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے سونے کو باہر پھینکنا نہیں چاہتا تھا بار بار میرے جی میں آتا تھا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں اور میں نے ایسا ہی کیا بھی اس بھیانک اندھیری رات میں میں اس افیم والی کوٹھی سے نکل بھاگا۔ میرے ہوش ٹھکانے نہیں تھے مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کس سمت کو اور کہاں بھاگ رہا ہوں میں تمام رات بھاگتا رہا پھر کب کہاں گر کر بے ہوش ہو گیا یہ مجھے نہیں معلوم ہوا؟ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے دیکھا کہ گووندا سنگھ میرے پاس کھڑا ہے میں نہ جانے کہاں اور

کس کے گھر میں پڑا تھا۔ میں گووندا سنگھ کو پہچان رہا تھا لیکن میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ گووندا سنگھ سے کچھ پوچھوں اور ساری بات اسے کہہ سناؤں لیکن میرے بولنے کی تمام کوشش بے کار تھی مجھے لگ رہا تھا کہ میری زبان اینٹھ گئی ہے آخر تھک ہار کر میں چپ رہنے پر ہی مجبور ہو گیا۔ گووندا سنگھ مسلسل چار پانچ روز تک میری تیمارداری کرتا رہا۔ ڈاکٹر، حکیم اور منتر وغیرہ کرنے والوں تک جہاں تک اس کی پہنچ تھی اس نے سب کو دکھلا کر میرا علاج کرایا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ گووندا سنگھ بھی پریشان ہو گیا میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی اور میں گونگوں سے بھی بدتر ہو کر رہ گیا تھا۔

آخر تھک ہار کر ایک دن گووندا سنگھ نے مجھے اپنے کندھوں پر لاد لیا اور ایک میلے کپڑے میں اس نے وہ ساری اشرفیاں اور سونے کی گنیاں باندھ لیں جو میری جیبوں سے اس نے نکال لی تھیں پھر مجھے اٹھاتے ہوئے وہ افیم والی کوٹھی کی جانب چل پڑا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے تھارو دھن میں سے ہی یہ اشرفیاں وغیرہ نکالی ہیں لیکن میں ان سونے کی اشرفیوں اور گنیوں کو اپنی اس حالت کے باوجود خود سے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا میں اس کے کندھے پر پڑا پڑا پوری کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اس کی گرفت سے نکل جاؤں۔ اس کوشش میں میں نے بچوں کی طرح نہ جانے اس کو کتنے گھونسے مارے ہوں گے لیکن اس نے مجھے نہیں چھوڑا۔ آخر تھک کر میں نے دانتوں سے اس کے کندھے کو کاٹنا شروع کر دیا لیکن پھر بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

وہ پہاڑوں پر چڑھتا ہوا اس افیم والی کوٹھی کی طرف بڑھتا جا رہا تھا پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ کوٹھی دکھائی دینے لگی۔ جیسے جیسے وہ اس کوٹھی کے قریب پہنچتا جا رہا تھا ویسے ویسے میرا دل تیزی سے دھڑکتا جا رہا تھا۔ گووندا سنگھ میں کتنی طاقت تھی کہ وہ مجھے اس حالت میں بھی اٹھائے ہوئے اتنی دور تک چلا آیا تھا۔ اب وہ کوٹھی کے بالکل قریب آ چکا تھا۔ جوں ہی اس نے برآمدے میں قدم رکھا تو اسے بیچ والے کمرے کے دروازے کے اوپر ہی کالا ڈیڑھ بالشت لمبا بچھو بیٹھا ہوا دکھائی دیا لیکن اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی مگر اس بچھو کو دیکھتے ہی میرا تو سارا جوش ہی ٹھنڈا ہو کر رہ گیا تھا۔ یکایک میں گلا پھاڑ کر چلانے لگا۔ میں گووندا سنگھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میرے منہ سے باوجود کوشش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی مجھے دیکھ کر اس بچھو کا غصہ اور بڑھ گیا لیکن گووندا سنگھ نے اب بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا اس نے اشرفیوں اور سونے کی گنیوں کی اس پوٹلی کو اس کمرے کی طرف پھینک دیا یہ دیکھ کر وہ بچھو تیزی سے چوکھٹ سے اتر آیا اور اس پوٹلی کی طرف بڑھنے لگا اور پھر اس پوٹلی سے لپٹ کر بیٹھ گیا۔

گووندا سنگھ نے مجھے برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائی پر لٹا دیا اور خود گھوم پھر کر ٹارچ کی روشنی میں آس پاس کا جائزہ لینے لگا بیچ والے یعنی خزانے والے کمرے کا دروازہ اب بھی اسی طرح کھلا ہوا تھا لیکن اس کے برابر والے کمرے کا دروازہ اسی طرح بند تھا پھر اچانک ہی میرے دیکھتے ہی دیکھتے خزانے والے کمرے کا دروازہ بھی بند ہو گیا اور پھر دھیرے دھیرے وہی جھن..... جھن..... جھناجھن کا شور گونجنے لگا۔ تھوڑی دیر تک جھنجھناہٹ کا شور ہوتا رہا پھر یوں لگا جیسے وہ پیتل کی گاگریں پھر سے کھسکنے لگی ہوں۔ وہ گاگریں چلتے چلتے برآمدے میں آگئیں پھر وہاں سے صحن میں آکر ان کی چال تیز ہو گئی۔ اب وہ کنویں کی جانب بڑھ رہی تھیں اور آخر میں کنویں کے اندر سے چھپاک چھپاک کی آوازیں آنے لگیں اور پھر سارے ماحول پر سناٹا چھا گیا۔ یکایک گووندا سنگھ کی دردناک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور وہ دوڑتا ہوا میری چارپائی کے قریب آکر گر پڑا۔ میں نے اٹھ کر دیکھا تو وہ بری طرح کانپ رہا تھا اور اس سے کچھ فاصلے پر وہی کالا بچھو منڈلا رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے بچھو نے ہی گووندا سنگھ کو ڈنک مارا تھا۔ میں نے اٹھ کر زمین پر پڑی ہوئی ٹارچ اٹھا کر روشنی بچھو پر ڈالی۔ روشنی دیکھ کر جیسے بچھو واپس جانے لگا۔ دھیرے دھیرے وہ اسی خزانے والے کمرے کی جانب رینگ رہا تھا پھر تمام رات اسی طرح جاگتے ہی گزر گئی میں نے بولنے کی بہت کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

یکایک مجھے لگا کہ کوئی باہر کا دروازہ زور زور سے پیٹ رہا ہے پھر اچانک میرے کانوں میں وہی گیت کی آواز گونجنے لگی جو وہ نوجوان گاتا تھا جسے گووندا سنگھ بلا کر لایا تھا میں سمجھ گیا یہ وہی نوجوان ہو گا کچھ دیر تک تو میں چپ چاپ سنتا رہا پھر اٹھ کر اس آواز کا پتا لگانے لگا کہ نوجوان کہاں ہے؟ میں نے کوٹھی کا ہر کمرہ دیکھ ڈالا مگر مجھے وہ نوجوان کہیں دکھائی نہیں دیا میں نے صحن میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا تو لگا کہ نوجوان کی آواز کوٹھی کی چھت پر سے آ رہی ہے مگر وہاں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ تھک کر میں اپنے

اس کمرے میں آگیا جہاں میرا سامان اور کپڑے وغیرہ گووندا سنگھ نے رکھے تھے کمرے میں مجھے ایک سرکاری لفافہ پڑا ہوا دکھائی دیا اسے کھولنے پر پتا چلا کہ بیس جولائی کو سرکاری افسران خزانے کی جانچ کے لیے آنے والے ہیں جس کی اطلاع میں نے انہیں بذریعہ خط دی تھی۔ اس وقت مجھے دن تاریخ اور مہینے کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ میں نے خط کو جیب میں رکھ لیا صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی اور سورج نکلنے کی تیاری کر رہا تھا جب میں برآمدے میں آیا تو دیکھا تو گووندا سنگھ ابھی تک وہیں پڑا تھا اس کے منہ اور ناک سے کالا کالا خون نکل کر اس کے چہرے اور گردن پر جم گیا تھا۔ اس کے جسم میں ہر جگہ کالے کالے دھبے پڑ گئے تھے اور اس کے قریب وہی رات والا سیاہ بچھو منڈلا رہا تھا۔ میلے کپڑے کی وہ پوٹلی جس میں سونے کی اشرفیاں بندھی ہوئی تھیں اب کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں وہاں اب صرف میں تھا اور گووندا سنگھ کی لاش پڑی تھی اور وہی کالا بچھو رینگ رہا تھا۔

اچانک باہر کسی جیپ گاڑی کے رکنے کی آواز آئی میں دوڑا دوڑا باہر گیا دیکھا تو ایک سرکاری جیپ کوٹھی کے باہر کھڑی تھی اور کئی فوجی افسر جیپ میں سے اتر رہے تھے پھر میں ان کے ساتھ اندر آگیا۔ گووندا سنگھ کی لاش برآمدے میں اسی طرح پڑی تھی۔ بے چارہ گووندا سنگھ...... اس کی یاد مجھے زندگی بھر رہے گی۔

O☆O

گونٹگا کا مردم خور قبیلہ

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سیرادو نورنٹے کی چوٹیوں کی اوٹ سے زرد چاند آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔ گونٹگا آدم خوروں کو انسانی گوشت کی بھوک بری طرح ستا رہی تھی۔ دراصل آج وہ دریائے جرونا کے کنارے بسنے والے یارابو قبیلے پر حملے کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے اور تیز دھار خنجر، نیزوں اور لمبے لمبے بانسوں سے مسلح تھے جن کے سروں پر تراشے ہوئے تیز نوکدار پتھر بندھے تھے، کہیں حملہ آور ہونے سے پہلے یہ چاق و چوبند وحشی اپنی مسلمہ رسم کے مطابق جسم پر اورنٹو درخت سے نکلنے والا تیل ضرور ملتے تھے جس سے ان کے صحت مند جسم چاندنی میں چمک رہے تھے۔ ایک معمولی سی لنگوٹی کے سوا وہ بالکل ننگے تھے۔ ان کے سردار اومہ نے فضا میں نیزہ بلند کرتے ہوئے انہیں کوچ کا حکم دیا اور وحشی پہاڑ کی ڈھلان سے اترنے لگے۔ دور سے وہ بھیانک سایوں کی طرح رینگتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

وہ خاموشی سے ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے۔ ان کے قدموں کی آواز فضا میں عجیب سا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ جنگل عبور کرنے کے بعد وہ دریا کے کنارے کنارے ہو لیے اور بڑی سرعت سے یارابو گاؤں تک پہنچ گئے جس کے باسی یقیناً اس وقت میٹھی نیند سو رہے تھے۔ بڑے بڑے درختوں کے سائے دور سے بڑے خوفناک نظر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آرہے تھے اچانک دریا کنارے بڑے درختوں سے بندروں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ چھوٹے درختوں کے جھنڈ میں پرندے پھڑپھڑانے لگے اور دوسرے درختوں سے جنگلی طوطوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ جانے ان جانوروں کو شدید خطرے کا کیسے احساس ہو گیا تھا۔ چند لمحوں میں بندروں اور پرندوں کی چیخ و پکار نے فضا میں ہلچل سی پیدا کر دی۔

یارابو قبیلے کا ایک شخص گہری نیند سے بیدار ہوا اور اندھیرے میں کچھ دیر گھورتا رہا۔ پرندوں اور بندروں کی آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اس ہنگامے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے چٹائی سے اٹھا۔ ابھی وہ جھونپڑی کے دروازے تک پہنچنے نہ پایا تھا کہ فضا میں ایک دلدوز چیخ ابھری۔ گونٹگا سردار اُومہ نے اس کی چھاتی میں نیزہ گھونپ دیا اور "رشی" (مارو) کا نعرہ بلند کیا۔

"رشی" بستی کے چاروں طرف چھپے ہوئے گونٹگا وحشیوں کی آواز سردار کے نعرے کے جواب میں ایک ساتھ ابھری اور اس کے فوراً بعد وحشت، سنگدلی اور درندگی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ قتل و خون کا بازار گرم ہونے لگا اور ساتھ ہی قیامت کا وہ شور و غل کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بچوں اور عورتوں کی دردناک چیخیں پتھریلے پہاڑوں میں گونج رہی تھیں۔ اکثر افراد کو ان کی جھونپڑیوں میں ہی قتل کر دیا گیا۔ کچھ اپنی جان بچانے کے لیے دریا کی طرف دوڑے لیکن گونٹگا وحشیوں نے انہیں بھی گھیر گھیر کر ٹھکانے لگا دیا۔

یارابو قبیلے کا بوڑھا سردار ناپیی بڑھ بڑھ کر اپنے جوانوں کے حوصلے بڑھا رہا تھا چند یارابو جوان مچھلیاں پکڑنے کے بانسوں سے مقابلہ کر رہے تھے اور کئی عورتیں اور بچے سہمے ہوئے ان کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ناپیی بڑی بہادری سے میدان میں جما ہوا تھا لیکن یکے بعد دیگرے یارابو نوجوان ختم ہو رہے تھے۔ گونٹگا کے وحشیوں نے ان کے سردار کو گھیرے میں لے لیا۔ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود وہ ایک معمولی سی لاٹھی سے بڑھ بڑھ کر وار روک رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گونٹگا وحشی نیم دائرے کی صورت میں اس کے گرد جمع ہو گئے اور بوڑھے کی حماقت پر ہنسنے لگے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ بڑی حسرت بھری نظروں سے گاؤں کی طرف دیکھا۔ یارابو قبیلے کی پُرامن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زندگی گزارنے کی کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔ گوٹنگا وحشیوں نے یکبارگی حملہ کیا اور کئی نیزے سردار کے بوڑھے جسم سے پار ہو گئے۔

اس کے بعد عورتوں کی باری آئی۔ گوٹنگا وحشی عورتوں کو بہت کمزور اور بے ضرر مخلوق سمجھتے ہیں اور دشمن قبیلے کی عورتوں کو قتل کرنا ان کے نزدیک ایک دلچسپ کھیل ہے۔ جب یارابو قبیلے کی عورتیں موت کے خوف سے اِدھر اُدھر بھاگنے لگیں تو گوٹنگا وحشی قہقہے لگاتے ہوئے انہیں گھیر کر دریا کنارے لے آئے۔ وہ بڑے وحشیانہ انداز میں نیزوں کو بار بار فضا میں بلند کرتے اور عورتوں کے جسم میں گھونپ دیتے۔ تڑپتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر فرط مسرت سے ناچتے اور دوبارہ نیزے گھونپ کر انہیں ختم کر دیتے۔ کچھ عورتیں جان بچانے کے لیے بہت تیز بھاگیں اور دریا کنارے پھیلی ہوئی گھنی خاردار جھاڑیوں میں کود گئیں۔ گوٹنگا وحشیوں نے ان چھپی ہوئی عورتوں کو باہر نکالا۔ سب کو بھیڑ بکریوں کی طرح اکٹھا کیا اور پھر خنجروں سے ان کی گردنیں علیحدہ کر کے دریا کی طرف اُچھال دیں۔

بچوں کو سب سے آخر میں قتل کیا گیا۔ وحشی بچوں کو بالوں سے پکڑتے فضا میں دو تین مرتبہ اچھالتے اور زمین پر گرا کر ان کی چھاتی میں نیزے گھونپ دیتے۔ تھوڑی دیر بعد قتل و خون کا یہ ہنگامہ ذرا تھم گیا۔ یارابو قبیلے کا ایک فرد بھی زندہ نہ بچا تھا۔ گھنے جنگل کے وسطی حصے سے بندروں کے چیخنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور چند پرندے اِدھر اُدھر فضا میں پھڑپھڑا کر راہ فرار ڈھونڈ رہے تھے۔

زرد چاند سروں پر آ گیا تھا اور وحشی اب بھوک مٹانے کے لیے لاشوں کو بھوننے کی تیاری میں مصروف تھے۔ سب سے پہلے انہوں نے دریا کنارے ایک گڑھا منتخب کیا اور اسے نیزوں اور خنجروں سے کھود کھود کر کافی گہرا کر لیا۔ وہ گڑھے میں بیٹھے ہاتھوں سے مٹی کھرچ کھرچ کر باہر پھینک رہے تھے جب گڑھا کافی گہرا ہو چکا تو گوٹنگا وحشی اِدھر اُدھر پھیل گئے اور سوکھی جھاڑیاں اور لکڑیاں لا لا کر اس گڑھے میں پھینکنے لگے۔ گوٹنگا وحشیوں کی ایک پارٹی یارابو گاؤں کی طرف گئی۔ وہ ایک دوسرے کے سر پر ہاتھ مار مار کر ہنس رہے تھے۔ واپسی پر وہ لاشیں کھینچتے ہوئے لائے اور گڑھے کے قریب جمع کر دیں۔ اُومہ نے صرف نوجوانوں کی لاشوں کا انتخاب کیا۔ گڑھے کے قریب اُومہ اور لاکا کھڑے تھے۔ لاکا

گوٹنگا قبیلے کا جادوگر اور پیشوا سمجھا جاتا تھا اور ایسی تمام رسوم میں لاکا کی موجودگی ازبس ضروری تھی۔

بوڑھے یارابو سردار ناپیچی کی لاش لاکا کے نزدیک ہی پڑی تھی اُومہ اور لاکا نے خنجر سنبھالے، اس کا سینہ چاک کیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا دل کاٹ کر باہر نکال لیا۔ دونوں کے چہروں پر وحشت انگیز مسرت پھیلی ہوئی تھی۔ اُومہ نے دل کے چھوٹے چھوٹے دو ٹکڑے کاٹے۔ ایک خود چبانے لگا اور دوسرا لاکا کی طرف بڑھا دیا۔ باقی حصہ انہوں نے اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ گوٹنگا وحشی سارے خوشی سے اپنے ہاتھ فضا میں بلند کر کے وحشیانہ انداز میں ناچ رہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دشمن سردار کا دل چبانے سے قوت اور مردانگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ جونہی یہ رسم پوری ہوئی لاکا نے چقماق رگڑ کر لکڑی اور جھاڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگا دی۔ پلک جھپکتے میں سوکھی جھاڑیوں کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ وحشیوں نے لاشوں کو دہکتے ہوئے شعلوں پر پھینکنا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے لاشیں کوئلوں کی طرح سیاہ ہو گئیں۔ جلتے ہوئے گوشت کی بو نے فضا کو مکدر کر دیا۔ چاروں طرف سفید رنگ کا دھواں چھایا ہوا تھا اور وقفوں کے بعد انسانی گوشت سے چٹاخ چٹاخ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گوٹنگا وحشی الاؤ کے گرد والہانہ انداز میں محو رقص تھے۔ ان کی سرخ سرخ آنکھوں سے وحشت جھانک رہی تھی۔ ناچتے ناچتے لاکا تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک خاص آواز نکالتا اور اس کے ساتھ ہی ان کا یہ دیوانہ وار رقص اور بھی شدت اختیار کر لیتا۔ جب یہ درندے ناچتے ناچتے تھک گئے تو گڑھے کے گرد جم کر بیٹھ گئے اور عریاں لاشوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگے۔

گڑھے سے چند گز کے فاصلے پر لاکا یارابو سردار ناپیچی کی لاش پر جھکا سر اور چہرے کی کھال اتارنے میں مصروف تھا۔ اس نے بڑی صفائی سے گدی سے ماتھے تک تیز خنجر سے کھال کو کاٹا اور بڑے ماہرانہ انداز میں سر اور چہرے کی کھال کو غلاف کی طرح بالکل صحیح حالت میں اتار لیا۔ بغیر کھال کے سردار ناپیچی کا چہرہ آگ کی روشنی میں کتنا خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد لاکا نے اس کا سر دھڑ سے علیحدہ کیا۔ خنجر کی نوک سے دونوں آنکھیں نکال کر پھینک دیں اور کھوپڑی کو بڑی احتیاط سے ایک طرف رکھ دیا۔ لاکا نے چہرے کی کھال کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور خشک ہونے کے لیے زمین پر پھیلا دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھال سوکھنے کے بعد یہ لوگ اس میں خاص قسم کی خشک گھاس پھوس بھر دیتے ہیں جس سے کھال سڑنے نہیں پاتی اور اچھی طرح خشک ہونے کے بعد یہی کھال انسانی چہرے اور سر کا خول سا بن جاتا ہے جسے گوٹنگا اپنے غاروں کے باہر لٹکا دیتے ہیں۔ کچھ رسمیں ایسی بھی ہیں جنہیں پورا کرتے وقت لاکا اس کھال کو غلاف کی طرح اپنے چہرے پر چڑھا لیتا ہے اور پھر رسم پوری کرنے کے بعد اسے دوبارہ غاروں کے باہر آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ کھوپڑی کو اس طرح لٹکانے سے جنگل کی بدروحیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتیں۔

لاکا اس کام سے فارغ ہو کر اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹا۔ اب شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے نیم عریاں وحشی انسانی گوشت درندوں کی طرح کھا رہے تھے اور بڑے مزے لے لے کر ہڈیاں چبا رہے تھے۔ شکم سیری کی وجہ سے ان پر جلد ہی غنودگی طاری ہو گئی اور وہ اِدھر اُدھر درختوں کے نیچے پڑ کر سو گئے۔

کس قدر روح فرسا منظر تھا۔ دریا سے صرف ایک فرلانگ کے فاصلے پر یارابو بستی سنسان و ویران پڑی تھی اور بستی کے باسیوں کی لاشیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ رات گئے تک ہنسنے کھیلنے والے بچوں کی آوازیں خاموش ہو چکی تھیں۔ دریا کنارے اس منحوس گڑھے سے اب بھی ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ گڑھے کے گرد جا بجا انسانی ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دو شاخہ لکڑی پر یارابو قبیلے کے سردار ناپیی کی کھوپڑی لٹک رہی تھی۔ اور قریب ہی زمین پر اس کے چہرے کی کھال خشک ہو رہی تھی۔ وحشی گہری نیند سو رہے تھے۔ دریا کا پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ جھاڑیوں میں جھینگر زور زور سے بول رہے تھے جیسے وہ بھی یارابو قبیلے کی بربادی کا ماتم کر رہے ہوں۔ گوٹنگا وحشی جب نیند سے بیدار ہوئے تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔ اُومہ نے ایک اونچی سی جگہ کھڑے ہو کر اپنا نیزہ فضا میں بلند کیا۔ یہ واپسی کا نشان تھا' چنانچہ سب آدم خور اپنے سردار اُومہ کے پیچھے پیچھے اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس ہولناک واقعہ کو ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ فرانسس میلو نامی ایک تاجر دریائے جرونا کے راستے اس علاقے میں تجارت کی غرض سے آیا۔ اس کا ارادہ یارابو گاؤں کے نزدیک دریا کے کنارے شب بسری کا تھا۔ ریڈ انڈین قبائلیوں کو پہاڑوں اور

دریاؤں سے کبھی کبھار بڑے قیمتی ہیرے مل جاتے ہیں جو ان کے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ ریڈ انڈین قبائل نمک بہت پسند کرتے ہیں۔ کچھ چالاک اور ہوشیار تاجر برازیلی حکومت سے اجازت نامہ حاصل کرتے ہیں اور کشتیوں میں نمک کے تھیلے لا کر دریائے جرونا کے راستے چل پڑتے ہیں۔ ان تاجروں کو یقین ہوتا ہے کہ نمک کے بدلے میں کسی نہ کسی ریڈ انڈین سے کوئی قیمتی ہیرا ضرور مل جائے گا۔ میلو' یارابو گاؤں کے قریب پہنچا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا' لیکن ابھی سورج نہیں نکلا تھا۔ میلو نے کشتی کو ایک درخت کے ساتھ باندھا اور ستانے لگا۔

یارابو گاؤں پر ہولناک خاموشی چھائی ہوئی تھی فضا میں اکا دکا چیلیں منڈلا رہی تھیں۔ اس وقت بچے دریا کے کنارے کھیل میں مصروف نظر آتے اور گاؤں کے چولہوں کا دھواں فضا میں تیر رہا ہوتا تھا۔ میلو حیران تھا کہ آخر وہ چہل پہل کیا ہوئی۔ کیا پورے قبیلے نے بستی چھوڑ کر کہیں اور بسیرا کر لیا ہے؟ کچھ دیر کھڑا وہ حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر کچھ سوچ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ میلو نے ابھی چند قدم کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ بچوں کی کھوپڑیاں زمین پر اِدھر اُدھر بکھری دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے..... "یہ کیا ماجرا ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے اور مارے خوف کے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بھورے رنگ کی ہزاروں چیونٹیاں کھوپڑیوں اور لاشوں سے چمٹی ہوئی تھیں۔ جا بجا انسانی ہڈیاں اور ڈھانچے پڑے تھے۔ "اف میرے خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔" ابھی وہ بمشکل پندرہ بیس گز فاصلہ طے کرنے پایا تھا کہ اس کے قدم خود بخود رک گئے۔ اس نے دہشت سے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک بڑے سے گڑھے کے گرد لکڑیوں کے ادھ جلے ٹکڑے اور بازوؤں اور رانوں کی جلی ہوئی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ قریب ہی جھاڑیوں سے گوشت کی سڑاند اُٹھ رہی تھی۔ یہ تمام چیزیں یارابو قبیلے کی حسرت ناک بربادی کی گواہی دے رہی تھیں۔

میلو نے ریڈ انڈین آدم خور قبیلوں کے متعلق سنا ضرور تھا' لیکن اسے ایسا ہولناک منظر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا اس انتہائی ظلم و تشدد اور وحشت کے منظر نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا کشتی تک آیا اور فوراً ہی واپس روانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوگیا۔ کافی دنوں کی مسافت کے بعد وہ سانتا اسابل شہر پہنچا اور یارابو قبیلے کی ہولناک بربادی کی مکمل تفصیل متعلقہ افسران کو سنائی اور انہوں نے فوراً برازیل کی وزارت داخلہ کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا۔ ڈاکٹر رے منڈو کاروالہو' ریڈ انڈین بیورو کا انچارج تھا اس کے لیے دریائے جرونا کے علاقے میں آدم خوری کی اطلاع کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ اس سے قبل بھی کئی تاجروں نے ایسے حالات کی اطلاعات دی تھیں۔ اس سلسلے میں تحقیقات کے لیے ہیرلڈ شاز کو چنا گیا۔ ہیرلڈ شاز ریڈ انڈین قبائل کی تاریخ کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور ماتوگروسو کے قبائل کے متعلق اس نے ماضی میں تحقیق کی تھی۔ اس سلسلے میں ہیرلڈ شاز کی تحقیق کو نیشنل جیوگرافیکل سوسائٹی نے بھی اپنی کتابوں میں خاص جگہ دی اور اس کی خدمات کو بے حد سراہا تھا۔

آدم خوری کے سلسلے میں اب تک موصول ہونے والی اطلاعات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ جلے ہوئے انسانی اعضا اور ہڈیاں کچھ ایسے گڑھوں کے گرد بکھرے ہوئے پائے جاتے ہیں جن میں راکھ یا ادھ جلی لکڑیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ گڑھے چھ فٹ سے لے کر دس فٹ تک گہرے ہوتے ہیں۔ ایسے گڑھے اکثر دریا کے کنارے ہی ملتے ہیں۔ ان دل خراش واقعات کے پیش نظر فرانسس میلو کی رپورٹ زیادہ اہم معلوم ہوتی تھی۔ اس کی بروقت اطلاع نے ملک بھر کے باشندوں کو حیران کر دیا تھا۔ دن رات مختلف اخباروں کے نمائندے میلو کے پاس انٹرویو کے لیے آتے رہے اور اس طرح اس سانحہ کی دردناک تفصیل برازیل کے جولائی ۱۹۶۳ء کے تقریباً تمام اخبارات میں شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی۔ ۳۲ سالہ ماہر لسانیات اور مشہور انسان شناس آرتھر جے وارن بھی ان خبروں کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا۔ اخباری معلومات سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ گونگا قبیلے کے وحشیوں کا یارابو گاؤں پر حملہ کرنے کا واحد مقصد صرف آدم خوری ہے۔ گونگا وہ تمام چیزیں جو نیم تہذیب یافتہ قبائل میں متعارف ہو چکی تھیں جوں کی توں چھوڑ جاتے ہیں اور حملے کے بعد نمک' برتن ہتھیار غرض کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے اور نہ کسی مرد یا عورت کو قیدی بنا کر لے جاتے ہیں ان حقائق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ گونگا قبیلہ اب بھی واقعی پتھر کے زمانے کی زندگی گزار رہے ہیں اور روئے زمین پر قدیم ترین تہذیب سے صرف اسی قبیلے کے ڈانڈے ملتے ہیں۔ انہی دنوں آرتھر ڈاکٹر کاروالہو سے بھی ملا۔

اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بڑی تفصیل سے بات چیت کی۔ اگرچہ ڈاکٹر کاروالہو آرتھر کے خیالات سے متفق تھا' لیکن اسے اس کی اس تجویز سے اتفاق نہ تھا کہ گونگا قبیلے کے متعلق تحقیقات کرنے کے لیے ماتوگروسو کے علاقے میں ایک باقاعدہ مہم بھیجی جائے۔ اس نے کہا یہ بڑی خطرناک تجویز ہے ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ دریائے جرونا کے کنارے چند پولیس چوکیاں قائم کر دی جائیں جو ہمہ وقت ماتوگروسو کے قبائل کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ چونکہ آرتھر ڈاکٹر کاروالہو سے بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا' اس لیے خاموش رہا۔ وہ ایک باہمت اور بااصول انسان تھا۔ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا اس کی فطرت تھی۔ اس نے اکثر اپنے تحقیقی مقالوں میں ایک ضرب المثل کا ذکر کیا ہے۔ زندگی حادثوں کی گود میں پل کر جوان ہوتی ہے۔ حادثات نہ ہوں تو زندگی کا مقصد ہی فوت ہو جائے۔ اس نے متعلقہ سرکاری افسران سے اس موضوع پر گفتگو کی' لیکن بے سود چنانچہ اس نے وزارت داخلہ سے تجارت کے لیے اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس سلسلے میں نوجوان تاجر فرانسس میلو نے بھی آرتھر کا حصہ دار بننا منظور کر لیا۔ اصل میں فرانسس میلو ڈاکٹر کاروالہو کے کمرے میں آرتھر سے متعارف ہوا تھا اور جب اسے پتہ چلا کہ آرتھر تجارت کی غرض سے اجازت نامہ حاصل کر رہا ہے تو اسے بہت خوشی ہوئی اور ان کے مراسم چند ہی دنوں میں دوستانہ ہو گئے۔

آرتھر اور میلو طیارے کے ذریعہ جیکارکنگا کے ہوائی اڈے پہنچے جہاں انہوں نے ضروری سامان کی خرید و فروخت شروع کی اور ایک ۲۸ سالہ نوجوان الفریڈ فریزر کو بھی اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ آرتھر اور میلو نے ایک سیکنڈ ہینڈ موٹر بوٹ خریدی' ضروری سامان خورد و نوش ساتھ لیا اور تینوں ساتھی ۲ اگست ۱۹۶۳ء کی صبح کو دریائے جرونا کے راستے روانہ ہوئے۔ ان کی پہلی منزل یارابو بستی تھی۔ آرتھر اور میلو کو یقین تھا کہ یارابو کے گردونواح میں ماتوگروسو پہنچنے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور مل جائے گا۔ یہ دریائی راستہ میلو کے لیے جانا پہچانا تھا۔ اس روز سورج آگ کے گولے کی مانند دہک رہا تھا۔ چونکہ آرتھر کو گرم علاقوں کے دریاؤں میں سفر کا خاصا تجربہ تھا' اس لیے وہ تمام دن سٹیئرنگ پر بیٹھا رہا۔ شام کے وقت وہ اپنی پہلی منزل پر پہنچے اور دریا کے کنارے خیمہ لگایا۔ اچانک انہیں قریبی درختوں سے عجیب ہولناک سی آواز سنائی دی۔ وہ سانس روکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھڑے درختوں کی طرف دیکھ رہے تھے کہ جنگلی تیزی سے بھاگتے ہوئے دور نکل گ ان کی جان میں جان آئی اور ایک دوسرے کو دیکھ کر بے اختیار ہنس دیے۔ موٹر بوٹ کھینچ کر کنارے کے درخت سے باندھا۔ سورج بس اب ڈوبنے ہی والا تھا۔ شفق کی ا میں یارابو گاؤں کتنا بھیانک نظر آرہا تھا۔ مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ گردونواح کا علاقہ ا طرح کھنگالنا چاہتے تھے' چنانچہ میلو ان کے آگے آگے چل دیا' لیکن ہڈیوں اور ڈھانچو کہیں دور تک نام و نشان نظر نہ آیا۔ میلو نے اس کی وجہ یہ بتائی کہ جن دنوں اس متعلقہ حکام کو اس واقعے کی اطلاع دی صوبائی پولیس کی ایک پارٹی اس علاقے میں بھیجی تھی جس نے تمام ہڈیاں اور ڈھانچے ڈھونڈ کر دفن کر دیے تھے' البتہ وہ منحوس گڑھا ا بھی وہاں موجود تھا۔ آرتھر مہیب گڑھے کے قریب کھڑا غور سے دیکھتا رہا اور خوف کی ا لہر برقی رو کی طرح اس کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔

اگلے دن علی الصبح انہوں نے ضروری سامان اور خوراک تھیلیوں میں ڈالی ا خطرناک سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے پاس ۲۷۰ کی شکاری بندوق' ۳۰۳ کی رائف اور ۳۸ بور کا ریوالور تھا۔ انہوں نے گولیوں کی پیٹیوں کو کس کر باندھا اور احتیاط ک طور پر خاصی گولیاں اپنے تھیلوں میں بھی رکھ لیں۔

وہ یارابو گاؤں کے شمال کی طرف سفر کر رہے تھے۔ حد نظر تک گھنا جنگل پھیلا ہ تھا جس کے دوسرے کنارے پر بلند پہاڑ ہلکے سلیٹی سایوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ا پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہے تھے۔ پتا بھی ہلتا تو وہ اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ جاتے۔ یہا سے جنگل مستطیل کی شکل میں کافی دور تک چلا گیا تھا آرتھر نے ایک جگہ کھڑے ہو کر غ سے درختوں کی طرف دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کی کچھ شاخیں کٹی ہو تھیں۔ یہ خاصا بڑا درخت تھا۔ اس کی دائیں طرف انہیں ایک راستہ نظر آیا جو درخت کی زیادہ جھکی ہوئی شاخیں کاٹ کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ آرتھر نے بڑی معنی خیز نظروں ساتھیوں کی طرف دیکھا اس کا خیال تھا کہ حملہ کرنے کے لیے گونگا آدم خوروں نے راستہ استعمال کیا ہو گا' کیونکہ دور تک درختوں کی ٹہنیاں بالکل سیدھ میں کٹی ہوئی تھیں وہ اِدھر اُدھر دیکھتے' آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے اور ان کا شک یقین میں بدلتا تھا۔ یہی وہ راستہ تھا جس کے ذریعے گونگا دریا کے کنارے آباد قبائل پر حملہ کرتے تھ

کئی جگہ بڑی بڑی جھاڑیاں کاٹ کر راستہ صاف کیا گیا تھا اور ایک دو جگہ بڑے بڑے پتھروں کو بھی راستے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ تقریباً تین میل کا سفر طے کرنے کے بعد یہ راستہ ایک ساٹھ فٹ بلند پہاڑی کے دامن میں ختم ہو گیا۔ آرتھر نے غور سے پہاڑی علاقے کا جائزہ لیا۔ اس پہاڑی میں کئی جگہ بڑی بڑی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ بلندی پر پہنچ کر تقریباً ایک فرلانگ کا کھلا میدان نظر آیا جس میں کہیں کہیں درخت اور گنجان جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ انہوں نے صبح کا باقی حصہ ایک دوسری بلند پہاڑی سر کرنے میں گزارا۔ اس وقت وہ تقریباً ایک ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور دریائے جرونا کی میدانی آبادی سے تقریباً ساڑھے تین میل دور دوپہر کے وقت انہوں نے کافی راستہ طے کیا۔ پہاڑ کی چوٹی ابھی بے حد دور تھی اور گھنا جنگل شروع ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنی اپنی بندوقیں سنبھالیں۔ آرتھر سوچ رہا تھا شاید اس سے پہلے ماتوگروسو کے اس نو ہزار مربع میل کے علاقے میں باہر کا کوئی انسان نہ آیا ہو۔

انہیں تمام دن کوئی گونگا نظر نہ آیا۔ شام ہونے کو آئی۔ خونخوار وحشیوں کے دیس میں یہ ان کی پہلی شام تھی' چنانچہ انہوں نے تمام ممکن حفاظتی تدابیر اختیار کیں۔ رات گزارنے کے لیے میلو نے گھوم پھر کر مناسب جگہ کا انتخاب کیا۔ یہ نسبتاً کھلی اور محفوظ جگہ تھی۔ انہوں نے اپنے سامان سے ریشم کے بنے ہوئے لمبے جال نکالے اور جھولنے کی طرح درخت سے باندھ دیے۔ رات کو حفاظت کے لیے تینوں باری باری پہرہ دینے لگے۔ آدھی رات گئے فریزر نے آرتھر کو نیند سے بیدار کیا۔ "ذرا غور سے سنو آرتھر!" فریزر نے سرگوشی میں کہا۔

آرتھر لپک کر اپنے جھولنے سے اترا اور درخت کی کوکھ میں رکھی ہوئی شکاری بندوق اور سرچ لائٹ سنبھال لی۔ چاروں طرف دہشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آرتھر فریزر کے تیز سانس کی آواز محسوس کر رہا تھا۔ البتہ گھنے جنگل سے اس علاقے میں پائے جانے والے پرندے کیکو کی آواز تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد آرہی تھی۔ آرتھر کافی دیر اندھیرے میں ادھر ادھر گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ "فریزر تم مجھے کیا بتانا چاہتے ہو؟" آرتھر نے پوچھا۔

"یہ کسی پرندے کی آواز نہیں یہ گونگا کی آواز ہے کیکو کبھی رات کے وقت نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولتا۔"

آرتھر ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں پھر وہی آواز دائیں جانب کافی دور سے آئی اور اس کا جواب اسی آواز میں ان کے بائیں جانب سے سنائی دیا۔ فریزر تم ٹھیک کہتے ہو۔ آرتھر کی نظریں اندھیرے میں گڑی ہوئی تھیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہو گیا کہ گونٹگا ان کی آمد سے باخبر ہو چکے ہیں اور ان کے اردگرد گھنے جنگل میں چھپے ہوئے ہیں۔ آرتھر نے دوبارہ سرچ لائٹ کی مدد سے اس گھنے جنگل کی وسعتوں پر ایک گہری نظر ڈالی لیکن اس تاروں بھری رات میں بھی اسے درختوں کے بے ڈھب اور بھیانک سایوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا۔ میلو بھی جاگ اٹھا تھا۔ اس نے رائفل سنبھالی اور آرتھر کے دائیں جانب کھڑا ہوا۔ تینوں ساتھی بالکل خاموش تھے کہ اچانک قریبی درخت سے کسی پرندے کے پھڑپھڑانے کی آواز آئی۔ میلو نے آنکھ جھپکتے میں رائفل تان لی۔

"نہیں، ابھی گولی چلانے کا وقت نہیں۔" آرتھر نے ذرا تلخی سے کہا۔ "ہمیں گونٹگا کے آدم خوروں پر ثابت کرنا ہے کہ ہم پر امن ہیں۔"

میلو منہ میں بڑبڑایا اور بادل نخواستہ رائفل کو نیچے کرلیا۔ آرتھر نے سرچ لائٹ روشن کی اور آہستہ آہستہ چاروں طرف گھمائی، لیکن روشنی میں کوئی خاص چیز نظر نہ آئی۔

"شاید یہ روشنی گونٹگا وحشیوں کو روکنے میں مدد کرسکے گی۔ وہ اس روشنی پر ضرور حیران ہوں گے اور ہو سکتا ہے کہ اسے جنگل کی بدروح کا کرشمہ سمجھ رہے ہوں۔" آرتھر نے خیال ظاہر کیا۔

اگرچہ رات کے باقی حصے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا، لیکن اس کے باوجود وہ تینوں ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکے۔ وہ اپنی بندوقیں اور سرچ لائٹ سنبھالے چوکنے بیٹھے رہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ سرچ لائٹ روشن کرتے اور اپنے چاروں طرف درختوں اور دور تک پھیلی ہوئی جھاڑیوں کو اچھی طرح دیکھ لیتے۔ سرچ لائٹ کی تیز روشنی واقعی گونٹگا وحشیوں کے لیے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی اور وہ اس رات حملہ نہ کرسکے۔

صبح ہوتے ہی تینوں ساتھیوں نے ناشتہ کیا۔ کافی پیتے ہوئے انہوں نے حالات کا

روشنی میں ہر پہلو پر غور کیا کہ آیا انہیں آگے بڑھنا چاہیے یا نہیں۔

"فی الحال ہمارا اسی جگہ ٹھہرنا بہتر ہوگا۔" آرتھر نے کہا۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم ماتوگروسو کے علاقے میں پہنچ چکے ہیں اور گونٹگا وحشی ہمارے آگے بڑھنے کو اپنے قبیلے پر حملہ تصور کر سکتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ان کے گھیرے میں آکر کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔"

میلو اور فریزر نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ وہ دن بھر اِدھر اُدھر گھوم کر اس علاقے کی چھان بین میں مصروف رہے۔ ان کے کیمپ سے ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک ندی بہہ رہی تھی۔ انہوں نے کنارے پر کچھ چاکلیٹ اور نمک کا ایک تھیلا گونٹگا کے لیے بطور تحفہ رکھ دیا۔ آرتھر کو امید تھی کہ گونٹگا وحشی یہ تحفہ قبول کرلیں گے اور اس طرح انہیں یہ سمجھنے میں آسانی ہوگی کہ ان کی آمد کا مقصد محض دوستانہ ہے۔

رات خاصی بیت چکی تھی۔ آج سرِ شام ہی وہی کیکو کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ آرتھر کئی بار سرچ لائٹ روشن کر کے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے چکا تھا۔ یکایک ایک ساتھ جنگل سے کئی جانوروں اور پرندوں کی آوازیں اور پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔ آرتھر نے فوراً سرچ لائٹ روشن کی پہلی بار سرچ لائٹ کی تیز روشنی کے باوجود یہ آوازیں مسلسل آتی رہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ بالکل قریبی درختوں سے آرہی ہیں۔

"اب وہ روشنی سے نہیں ڈرتے۔ اب وقت ہے کہ ہم اپنی حفاظتی تدابیر اختیار کریں۔" میلو نے رائفل درختوں کی طرف سیدھی کرتے ہوئے کہا۔

"میلو یہ کیا کرنے لگے ہو۔ ٹھہرو۔" آرتھر نے درشتی سے کہا۔ "ابھی گولی چلانے کا وقت نہیں آیا۔" آرتھر نے سرچ لائٹ روشن کی اور آہستہ آہستہ گھمانا شروع کیا۔ فریزر اچانک چلایا۔ "دیکھو وہ جھاڑیاں ہل رہی ہیں ذرا لائٹ ادھر گھماؤ۔"

جونہی روشنی جھاڑیوں پر مرکوز ہوئی، یہ دیکھ کر ان کے دل خوف سے دھڑکنے لگے کہ تقریباً درجن بھر گونٹگا وحشی برچھے سنبھالے جھاڑیوں کی اوٹ سے ان کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ آرتھر نے روشن سرچ لائٹ ایک طرف رکھ دی۔ روشنی سے وحشیوں کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اور وہ وحشیانہ انداز میں اپنے نیزے بھالے ہوا میں بلند کر رہے تھے۔ یکبارگی وہ زور زور سے چیخنے لگے۔ آرتھر موقع کی نزاکت کا اندازہ کر چکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

یقیناً وہ چند لمحوں میں حملہ کرنے والے تھے۔

"رشی" وحشیوں کے سردار نے چیختے ہوئے فضا میں نیزہ بلند کیا اور بھاگتے ہوئے آگے بڑھا۔

میلو نے فائر کھول دیا۔ وحشیوں میں کھلبلی سی مچ گئی۔ آرتھر نے گوٹنگا سردار کے چوڑے چکلے سینے کا نشانہ لیا لیکن پھر ارادہ بدل کر ابھی سردار کی ران کا نشانہ باندھ ہی رہا تھا کہ سردار کے ساتھ کھڑا ہوا وحشی اچھل کر زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔ میلو کی رائفل سے نکلنے والی گولی اپنا کام کر چکی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے وحشی ایک دم رک گئے ان کے چہروں سے حیرانی ٹپک رہی تھی وہ سب اپنے تڑپتے ہوئے رفیق کار کے گرد اکٹھے ہوگئے۔ وہ کبھی حیرانی سے روشنی کی طرف دیکھتے اور کبھی خون میں لت پت ساتھی کی طرف۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گوٹنگا وحشیوں کو اس سے پہلے گولی سے سابقہ نہیں پڑا۔" آرتھر نے خیال ظاہر کیا۔ "غالباً وہ اپنے ساتھی اور گولی کی آواز کے متعلق قیاس آرائیاں کر رہے ہیں۔"

آرتھر کا اندازہ صحیح نکلا۔ وحشیوں نے آپس میں کچھ باتیں کیں اور زخمی گوٹنگا کو چھوڑ کر ایک دم بھاگے اور جنگل میں روپوش ہوگئے۔

"وحشی ابھی زندہ ہے۔" فریزر نے کہا۔ "وہ دیکھو جھاڑی کے پیچھے چھپنے کے لیے اپنے آپ کو کتنی مشکل سے گھسیٹ رہا ہے۔"

تینوں ساتھی بہت دیر تک چوکنے بیٹھے رہے ان کا خیال تھا کہ شاید گوٹنگا وحشی دوبارہ حملہ کریں گے لیکن اس انتظار میں تقریباً آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ جنگل پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تینوں دوست اس گوٹنگا وحشی کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ بڑی احتیاط سے آگے پیچھے دیکھتے ہوئے بڑھے۔ فریزر نے سرچ لائٹ اٹھائی ہوئی تھی اور میلو آگے آگے چل رہا تھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحشی مرچکا ہے یا اس پر گہری بے ہوشی چھائی ہوئی ہے۔" فریزر نے سرچ لائٹ گوٹنگا کے چہرے پر مرکوز کر دی۔ میلو اچانک پیچھے ہٹا۔ "وحشی زندہ ہے گولی اس کے کندھے میں لگی ہے۔"

ابھی وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ زخمی گوٹنگا چیتے کی سی پھرتی سے اٹھا۔

میلو کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر پلک جھپکتے میں چھاتی کے بل گرا دیا۔ زخمی گوٹنگا کے منہ سے جھاگ ابل رہا تھا اور وہ کسی وحشی درندے کی طرح غرا رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر میلو کی گردن دبوچنے کی کوشش کی لیکن میلو نے تیزی سے رخ بدلا اور وحشی کے منہ پر اس زور سے کہنی کی ضرب لگائی کہ وہ سنبھل نہ سکا اور چاروں شانے چت گر پڑا۔ وحشی کے کندھے سے فوارے کی طرح خون ابل رہا تھا۔ میلو نے لپک کر فریزر کے ہاتھ سے ریوالور چھینا۔ قریب تھا کہ وحشی کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دے ایکا ایکی آرتھر چیخا۔ "نہیں دوست۔ ایسا نہ کرو۔" اور لپک کر میلو کا ہاتھ تھام لیا۔ "آرتھر! مجھے مت روکو میں اس ذلیل کا بھیجا نکال دوں گا۔" میلو نے اپنا پھولتا ہوا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف نہ بنو دوست۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے بہتر ثابت ہو سکتا ہے۔"

آرتھر نے میلو کو بڑی سنجیدگی سے سمجھایا اور زخمی گوٹنگا کی طرف بڑھا۔ وحشی پر زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری غالب آچکی تھی، لیکن وہ اس بے بسی کے عالم میں بھی زمین پر پڑا غرا رہا تھا اور اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے نفرت برس رہی تھی۔ فریزر اپنے تھیلے سے ریشم کی ڈوری نکالو تاکہ میں اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ سکوں۔" آرتھر نے کہا۔

اگرچہ زخمی گوٹنگا نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن وہ اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھنے میں کامیاب ہوگئے۔ بری طرح زخمی ہونے کے باوجود گوٹنگا میں بلا کی طاقت تھی۔ وہ دہشت بھری نظروں سے ان تینوں آدمیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آرتھر زخمی گوٹنگا کے قریب بیٹھ گیا اور بڑے غور سے اس کے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ گولی کندھے کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ زیادہ خون بہہ جانے سے اس پر غنودگی سی طاری تھی۔ آرتھر نے وحشی کو تھپکی دی تو وہ چونک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے حسرت جھانک رہی تھی۔ انسانی ہمدردی عود آئی۔ آرتھر اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنے لگا۔ تھیلے سے ضروری سامان نکالا اور بڑی احتیاط سے وحشی کا زخم صاف کیا اور دو نئی پٹیاں اچھی طرح باندھ دیں۔ وحشی کے چہرے پر کچھ سکون نظر آرہا تھا۔

"میلو تم کافی عرصہ دریائے جرونا کے علاقے میں ریڈ انڈین قبائل کے افراد سے ملتے رہے ہو اور ان کی زبان سے آشنا ہو ذرا گوٹنگا سے کوئی بات کرو۔" آرتھر نے مشورہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔

دریائے جرونا کی زبان اگرچہ ہر تین چار میل کے بعد بدل جاتی ہے لیکن پھر بھی کافی مشترک الفاظ مل جاتے ہیں۔ میلو کو قبائل کی زبان پر عبور تو نہ تھا لیکن پھر بھی ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنا مطلب سمجھا سکتا تھا اور کچھ نہ کچھ سمجھ بھی لیتا تھا۔

میلو نے دریائی زبان میں گوٹنگا وحشی سے سوال کیا تو اس نے گردن گھما کر بڑی حیرانی سے میلو کی طرف دیکھا اور رک رک کر جواب دینے لگا۔

”اس کا نام چی ہے۔“ میلو نے کہا۔ ”اس کی بہن قبیلے کے سردار اُومہ کی بیوی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم اسے کھانا چاہتے ہیں لیکن وہ حیران ہے کہ اب تک ہم نے اسے قتل کیوں نہیں کیا اور بھوننے کے لیے گڑھا کیوں نہیں کھودا۔“

”بہت اچھے۔“ آرتھر خوشی سے چلایا اور میلو سے مخاطب ہوا۔ ”میلو اسے بتاؤ کہ ہم آدم خور نہیں ہیں اور گوٹنگا قبیلے سے دوستی کے خواہاں ہیں۔“ مزید گفتگو کے بعد میلو بولا۔ ”اسے تو ہماری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ وحشی کا خیال ہے کہ ہمارا پیٹ بھرا ہوا ہے اس لیے ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔“

رات کا بڑا حصہ انہوں نے آنکھوں میں گزارا اور اپنی بندوقیں سنبھالے وحشی کے گرد بیٹھے رہے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوا تو آرتھر نے گوٹنگا کے پاؤں کی رسی کاٹ دی اور وہ اسے آہستہ آہستہ ندی کی طرف لے گئے۔ ندی کنارے پہنچ کر آرتھر کے اشارے پر میلو نے وحشی کے ہاتھوں کی رسی بھی کاٹ دی اور دریائی زبان میں کہا۔ ”کونا (جاؤ)۔“

”کونا!“ گوٹنگا وحشی نے غیر یقینی لہجے میں دہرایا۔

وحشی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا غور سے میلو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وحشی کے لیے یہ اچنبھے کی بات تھی کہ وہ تینوں اسے قتل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی خوف عیاں تھا۔ وہ آہستہ آہستہ تین چار فٹ الٹے قدم چلا' لیکن اس کی نظریں آرتھر اور میلو کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی بندوقوں پر گڑی تھیں۔ یکایک وہ چیتے کی طرح جست لگا کر گھنے جنگل میں روپوش ہو گیا۔

آرتھر کو امید تھی کہ چی دوبارہ ضرور آئے گا۔ اور اسی دن دوپہر کو واقعی چی واپس آیا لیکن اکیلا نہیں بلکہ قبیلے کے اور لوگ بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ خاموشی سے

چلے آ رہے تھے۔ تقریباً پچیس تیس فٹ کے فاصلے پر آ کر وہ سب رک گئے اور غور سے تینوں ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگے جو اپنی اپنی جگہ ممکنہ حملے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ وحشیوں کی خاموشی بڑی معنی خیز تھی۔ آرتھر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان سے کس طرح بات شروع کی جائے میلو نے آرتھر کو دریائی زبان کے کچھ لفظ سکھائے تھے۔ اچانک آرتھر دو قدم آگے بڑھا اور بلند آواز میں بولا۔ ”پشا (دوستو)“ لیکن وحشی بدستور خاموش تھے۔

”مجھے ان لوگوں کی نیت میں کچھ فتور نظر آ رہا ہے۔“ میلو نے آہستہ سے کہا۔

”ہاں ہمیں سخت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“ آرتھر نے سرگوشی کی۔

گوٹنگا وحشیوں میں ایک لمبا تڑنگا گٹھے ہوئے جسم کا شخص سب سے آگے کھڑا تھا جو غالباً اُومہ تھا۔ اس کے سر پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ یہ وہی تھی جو آرتھر نے چی کے زخم پر باندھی تھی۔ اُومہ نے شاید اس پٹی کو جادو کا اثر سمجھ کر سر پر باندھ لیا تھا۔ اُومہ نے چی کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کی ہدایت کی۔ گویا یہ دوستی کی طرف پہلا قدم تھا۔ سب وحشیوں کی نظریں بندوقوں پر جمی ہوئی تھیں۔ آرتھر اس امید و بیم کے لمحے قدرے تذبذب میں تھا کہ کیا قدم اٹھائے۔ اس نے ایک نظر تمام وحشیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ذہن میں آیا شاید وحشی چی کے زخمی ہونے کی وجہ جاننا چاہتے ہیں۔ بے شک بندوق کے فائر سے ایک شخص کا زخمی ہو جانا گوٹنگا وحشیوں کے لیے جادو سے کچھ کم نہ تھا۔

آرتھر نے داہنے ہاتھ پر ایک قد آدم پودے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ سب وحشی آرتھر کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ گولی تنے کو چیرتی ہوئی نکل گئی اور وہ پودا ٹوٹ کر زمین پر آ رہا یہ دیکھ کر وحشیوں کے چہرے خوف سے زرد ہو گئے۔ وہ سب حیرت زدہ ہو کر پودے کی طرف گئے اور ٹوٹے ہوئے تنے کو غور سے دیکھنے لگے۔ غالباً اب وہ بندوق کی جادوئی طاقت کو سمجھ چکے تھے اور سرچ لائٹ اور بندوق کی طاقت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس سمجھ رہے تھے۔

آرتھر نے وحشیوں کے چہروں کو غور سے دیکھا اور اسے ایک ماہر انسان شناس کی ایک رپورٹ کے وہ الفاظ یاد آ گئے جو اس نے کولمبیا کے آدم خور قبیلوں کے علاقے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی پہلی مہم کے بعد لکھے تھے۔ "ریڈ انڈین قبیلے بندوق اور روشنی استعمال کرنے والے سفید لوگوں کو بدروحیں سمجھتے ہیں اور ایسے لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو بے دست و پا سمجھتے ہیں ریڈ انڈین قبائل کا اس بات پر پختہ اعتقاد ہے کہ بندوق اور روشنی استعمال کرنے والے لوگوں کو جنگل کی بڑی بدروحوں نے یہ دونوں ہتھیار "خوش ہو کر دیے ہیں اور ان کے سامنے وہ کچھ نہیں کرسکتے۔"

اگرچہ گوٹنگا وحشیوں کا حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور وہ دوستی کا ہاتھ بڑھا چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ تینوں اپنی جگہ چوکنے تھے اور اپنے گردوپیش پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔

چپی کے ذریعہ گوٹنگا قبیلے کے سردار اُومہ نے انہیں اپنے گاؤں آنے کی دعوت دی۔ آرتھر نے رضامندی ظاہر کی اور اس کے بعد تمام وحشی آہستہ آہستہ جنگل میں روپوش ہوگئے۔ اس وقت دن کے اڑھائی بجے تھے۔ آرتھر کے ذہن میں غیر مبہم سے خطرات سر اٹھا رہے تھے لیکن اس کے باوجود وہ گوٹنگا قبیلے کا گاؤں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور اگلے دن صبح سویرے گوٹنگا وحشیوں کے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔

اس رات کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ رات بڑے اطمینان اور سکون سے گزری' لیکن حفظ ماتقدم کے طور پر وہ رات کو اپنی باری کے مطابق جاگتے رہے۔ علی الصبح انہوں نے اپنا سامان باندھا اور اُومہ کے بتائے ہوئے راستے پر گوٹنگا گاؤں کی طرف چل پڑے۔ دوپہر کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے انہوں نے وحشیوں کا پہلا نشان دیکھا۔ ایک درخت کی موٹی سی شاخ کے ساتھ ایک انسانی کھوپڑی لٹک رہی تھی۔ اس درخت سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک ندی پتھریلے پہاڑوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی بہہ رہی تھی اور دوسرے کنارے پر حد نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ پھیلا ہوا تھا۔ پتھریلی پہاڑی کے دامن میں بے شمار تاریک غار نظر آرہے تھے۔ گوٹنگا آدم خوروں کا یہی گاؤں تھا۔ کچھ گوٹنگا وحشی ایک غار کے سامنے کھڑے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ آرتھر اس منظر میں کھو سا گیا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں سال پیچھے جاچکا ہے اور پتھر کے ابتدائی دور میں سانس لے رہا ہے۔ ایک سرسری اندازے کے مطابق گاؤں کی آبادی

چار سو کے لگ بھگ ہو سکتی تھی۔ "ہم ندی کے اسی کنارے پر اپنا کیمپ بنائیں گے۔" آرتھر نے فیصلہ کیا۔

دوپہر کے وقت وہ ندی پار کرکے گاؤں میں داخل ہوئے اور گوٹنگا وحشیوں کے نزدیک پہنچ گئے۔ جو انہیں بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ عورتیں اور بچے ایک اونچی جگہ کھڑے بڑی حیرانی سے ان اجنبی انسانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ غاروں کے باہر جابجا انسانی کھوپڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ عورتیں اور بچے بالکل برہنہ تھے اور ان کے بال پیشانی تک کٹے ہوئے تھے۔ لاکا گوٹنگا قبیلے کے سردار اُومہ کے ساتھ ایک غار کے دہانے پر کھڑا انہیں دور سے گھور رہا تھا۔ غار کے دائیں جانب کھوپڑیوں کے ساتھ ایک مکروہ لاش لٹک رہی تھی جو پہلی نظر میں کسی بچے کی لاش معلوم ہوتی تھی لیکن قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ سرخ بندر کی کھال تھی۔

لاکا نے ان مہمانوں کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کافی معمر وحشی تھا۔ اس کے چہرے' بازوؤں اور چھاتی کا گوشت ڈھلکا ہوا تھا اور اس نے گلے میں ہڈیوں کا ایک ہار پہنا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

"لاکا کہتا ہے کہ ہمارا سردار اُومہ آپ کو گاؤں میں داخلے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ گوٹنگا غیر لوگوں کو دوست بنانا نہیں چاہتے کیونکہ گھنے جنگلوں میں رہنے والی بدروحوں کی طرح یہ لوگ بھی اپنے ساتھ مصیبت اور بربادی لاتے ہیں۔" میلو نے ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔

"انہیں بتاؤ کہ ہم بڑے پرامن لوگ ہیں اور آپ لوگوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے۔" آرتھر میلو سے مخاطب ہوا۔

اس کے بعد اگرچہ انہیں سارے گاؤں کو گھوم پھر کر دیکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ اس کے باوجود گوٹنگا وحشی تینوں اجنبیوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ آرتھر اور اس کے دونوں ساتھیوں نے گاؤں کی ایک ایک چیز کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور کئی تصویریں اتاریں گوٹنگا قبیلے کے رہن سہن سے صاف ظاہر تھا کہ ان میں اور ہزاروں سال قدیم پتھر کے دور کے انسانوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔

آرتھر کو یہ معلوم کرکے بڑی حیرانی ہوئی کہ آدم خور قبیلے کی عورتیں انسانی گوشت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کھاتیں۔ اس کا خیال تھا کہ شاید عورتوں کے لیے یہ پابندی ہو لیکن یہ بات نہیں تھی۔ دراصل عورتیں چونکہ مردوں کے ساتھ "شکار" پر نہیں جاتی تھیں' اس لیے انہیں انسانی گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا اور نہ یہ مرد ان کے لیے واپسی پر انسانی گوشت لاتے تھے۔

اس قبیلے میں شادی وغیرہ کی کوئی رسم رائج نہیں تھی جب کوئی مرد کسی عورت کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے تو وہ اس عورت کو اپنے غار میں کچھ عرصہ ساتھ رکھتا ہے۔ اگر وہ وفادار بیوی ثابت ہو تو بہتر ورنہ اسے نکال دیتا ہے۔ اور اگر یہ عورت اس دوران دوسرے مرد سے شادی کی خواہش کرے تو وہ شخص اپنے ساتھیوں کی مدد سے عورت کے پسندیدہ مرد کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کی آتش انتقام صرف قتل سے ہی نہیں بجھتی بلکہ وہ مقتول کی دونوں آنکھیں نکال کر اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے دونوں ہاتھ کاٹ کر اس کے پیٹ پر رکھ دیتا ہے' لیکن عورت کو اس کے گناہ کی کوئی سزا نہیں دی جاتی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آدم خور قبیلے میں مرد کم اور عورتیں زیادہ ہیں۔

جب کوئی عورت بچہ جنتی ہے تو کوئی دوسری عورت اس کے قریب نہیں ہوتی' بلکہ حاملہ عورت کو ایک غار میں تنہا لٹا دیا جاتا ہے اور کھانے کے لیے روزانہ کچھ نہ کچھ پہنچا دیا جاتا ہے۔ یہ بیچاری اسی غار میں بچہ جنتی ہے اور اس تکلیف کے وقت میں کوئی دوسری عورت اس کی خبرگیری کے لیے موجود نہیں ہوتی۔ بچے کی پیدائش پر اس کا کوئی نام نہیں رکھا جاتا۔ جب اس کی عمر ڈیڑھ سال کی ہوتی ہے تو لاکا بچے کو زمین پر لٹا کر اور نٹو درخت کا تیل اس کے دونوں کانوں میں ڈالتا ہے اور دونوں کان اور ناک چھیدنے کے بعد اس کا نام تجویز کرتا ہے۔ اگر بچہ جسمانی اعتبار سے نارمل نہ ہو تو اس کے باپ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بچے کو دلدل میں پھینک دے۔ اگر کسی عورت کے ہاں جڑواں بچے پیدا ہوں تو بعد میں پیدا ہونے والے بچے کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ لاکا اور تمام قبیلے کا عقیدہ ہے کہ بعد میں پیدا ہونے والا بچہ انسان نہیں بلکہ پہلے بچے کی بدروح ہوتی ہے۔

کسی لڑکے کے بالغ ہونے پر ایک عجب رسم منائی جاتی ہے جس میں کامیابی کے بغیر وہ لڑکا آدم خوری میں حصہ نہیں لے سکتا۔ آرتھر کو ایک ایسی ہی انوکھی تقریب دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک پندرہ سالہ الی نامی لڑکے کو اس کا باپ ساتھ لے کر سردار کی خدمت میں

حاضر ہوا۔ اس کے باپ کے ہاتھ میں چمکتا ہوا نیزہ تھا جو اس نے سردار کو پیش کر دیا۔ سردار نے نیزے سے زمین پر تقریباً چار فٹ کا ایک مربع بنایا اور نیزے کو اس کے درمیان گاڑ کر اس لڑکے کو اس کے سامنے کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اس کے بعد سردار نے کسی ریڈ انڈین قبیلے کے سردار کے چہرے کی سوکھی ہوئی کھال منگوائی۔ اُومہ نے یہ کھال اپنے چہرے پر چڑھائی اور ایک نوجوان کو کچھ لانے کا حکم دیا۔ یہ نوجوان بھاگتا ہوا ایک غار کی طرف گیا اور واپسی پر بانس کے دو ٹکڑے لایا۔ بانس کے ان ٹکڑوں کے منہ ایک طرف سے بند تھے اور اندر سے کھوکھلے تھے بانس کے ایک ٹکڑے میں شہد بھرا تھا۔ لاکا نے ایک پودے سے چھوٹی سی ٹہنی توڑی جو اندر سے کھوکھلی تھی اور اس ٹکڑے کا سارا شہد اپنے منہ میں بھر لیا اور نالی کے ذریعے الی کے ایک نتھنے میں بھرنا شروع کیا۔ شہد جوں جوں ناک کے راستے اس کے سر کی طرف جا رہا تھا اس کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی آہستہ آہستہ لاکا نے منہ میں بھرا ہوا شہد الی کے دونوں نتھنوں کے ذریعے اس کے سر میں داخل کر دیا۔ دفعتاً اس لڑکے کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں اور وہ بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھال سکا۔ اس کے بعد بانس کا دوسرا ٹکڑا لایا گیا۔ اس کے دونوں سرے بند تھے۔ لاکا نے بانس کے ٹکڑے کے منہ پر بندھے ہوئے پتے کو کھولا اور الی کے نتھنوں کے ساتھ لگا دیا۔ ایکاایکی اس کے ساتھ چمٹی ہوئی بے شمار بھورے رنگ کی زہریلی چیونٹیاں اس کے چہرے پر رینگتی ہوئی میٹھے کی خوشبو پا کر اس کے نتھنوں میں گھسنے لگیں۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہی تھیں اس لڑکے کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے شدید اذیت کا احساس ٹپکنے لگا۔ اگرچہ ان چیونٹیوں کے ڈنک مارنے سے تکلیف تو بہت ہوتی ہے تاہم ان کا زہر انسانی موت کا باعث نہیں بنتا۔ اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ چند چیونٹیاں اس کے دماغ میں بھی رینگنے لگی تھیں اور وہ اس تکلیف میں مسلسل کوئی آدھ گھنٹہ تک مبتلا رہا۔ لاکا بار بار اسے خبردار کر رہا تھا کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلا یا اس نے کربناک حالت میں ذرا سی آواز نکالی تو وہ کبھی آدم خور نہیں بن سکتا۔ الی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وحشی اس کے گرد گھیرا ڈالے والہانہ انداز میں ناچ رہے تھے۔ اس کا باپ بڑی بے تاب نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا اگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اس کا باپ قبیلے میں سر اونچا کر کے چل سکے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاکا نے ایک سفید سا سفوف چھوٹی سی سوراخ دار نالی میں ڈالا اور اسے دائیں نتھنے میں ٹھونس دیا۔ اس نالی کے ایک طرف بنسری کی طرح ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ لاکا نے الی کو حکم دیا کہ وہ اس زور سے سانس لے کہ سوراخ دار نالی سے آواز پیدا ہو سکے۔ اس نے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے سانس لیا۔ اس وقت تمام وحشی سانس روکے کھڑے تھے۔ نالی سے ہلکی سی آواز کیا پیدا ہوئی کہ آنکھ جھپکتے میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کے گرد کھڑے ہوئے تمام قبیلے نے ایک فلک شگاف نعرہ لگایا اور اچھل اچھل کر بڑی تیزی سے ناچنے لگے۔ الی نے بڑے فخر سے زمین میں گڑا ہوا نیزہ کھینچا اور دیوانہ وار ناچ میں شامل ہو گیا۔ اب رات ہو چکی تھی۔ تینوں ساتھی اپنے کیمپ واپس آئے کھانا کھایا اور بڑی ذائقہ دار کافی تیار کر کے اپنی سلامتی کی دعائیں کرنے لگے۔

"کل صبح ہماری واپسی ہو گی۔" آرتھر نے کافی کا لمبا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ وہ بڑی دیر تک گوٹنگا قبیلے کی عجیب و غریب رسموں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میلو نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے' لیکن نیند تھی کہ آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سیرادونورٹے کے پہاڑوں پر چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ "کتنی سہانی چاندنی ہے دوستو' کیوں نہ ندی کی سیر کی جائے۔" فریزر نے تجویز پیش کی اور ایکا ایکی ٹارچ سنبھالے اٹھ کھڑا ہوا وہ بندوقیں لیے بہت دیر تک ندی کنارے گھومتے رہے۔

"ادھر دیکھو!" میلو اچانک چلایا۔ ایک گوٹنگا وحشی ہاتھ میں نیزہ لیے سیدھا ان کی طرف چلا آرہا تھا۔ اچانک گولی کی آواز فضا میں گونجی اور وہ وحشی تڑپنے لگا۔ گولی میلو نے چلائی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ فریزر نے سرچ لائٹ روشن کی' سات آٹھ گوٹنگا چمکدار نیزے لہراتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آرتھر نے فوراً نشانہ لے کر یکے بعد دیگرے دو فائر کیے فضا میں ایک ساتھ چیخیں ابھریں اور دو وحشی خون میں لت پت خاک پر لوٹنے لگے۔ یکایک فضا میں یکبارگی خونخوار وحشیوں کی ہولناک آوازیں بلند ہوئیں اور "رشی۔ رشی" کی صداؤں سے آن کی آن میں سارا جنگل گونجنے لگا۔

"جلدی بھاگو۔ وحشی دونوں طرف سے حملہ کر رہے ہیں۔" آرتھر بھاگتے ہوئے چلایا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے پیچھے ہٹتے ہوئے متواتر گولیاں چلا رہے تھے' لیکن اس آپا دھاپی میں فریزر کا بازو ایک وحشی کے نیزے سے بری طرح زخمی ہو چکا تھا۔

انہوں نے درخت کے پاس رکھے ہوئے تھیلے سے گولیاں نکالیں اور میگزین بھر کر باقی گولیاں جیبوں میں ڈال لیں۔ وہ مسلسل فائر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ واپسی کے راستے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک آرتھر کی نظر فریزر کے بازو پر پڑی جو کندھے سے کہنی تک بری طرح زخمی تھا اور خون سے اس کی قمیض سرخ ہو رہی تھی۔ "ٹھہرو ہم فرسٹ ایڈ کا تھیلا تو درخت کے نیچے بھول آئے ہیں۔ میں ابھی لاتا ہوں۔" آرتھر نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آرتھر دیکھنا کوئی ایسی حماقت نہ کر بیٹھنا پورا آدم خور قبیلہ ہمارا پیچھا کر رہا ہے۔" فریزر نے سرچ لائٹ کا کنٹرول بٹن ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

آدھے گھنٹے کی مسلسل فائرنگ کے بعد وہ ذرا تھم گئے ہر طرف ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گوٹنگا واپس جا چکے ہیں۔ تقریباً آدھا میل چلنے کے بعد انہوں نے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے پناہ لی۔ ایک گھنٹہ گزر گیا لیکن انہوں نے "رشی" کی کوئی منحوس آواز نہ سنی۔ گوٹنگا واقعی گاؤں واپس جا چکے تھے۔

فریزر کے بازو سے کافی خون بہہ گیا تھا۔ آرتھر نے قمیض پھاڑ کر پٹیاں بنائیں اور فریزر کے بازو کو مضبوطی سے باندھا۔

ہمیں کوئی ایسی محفوظ جگہ تلاش کرنی چاہیئے جہاں ہم رات کا باقی حصہ آرام سے گزار سکیں۔ رات کے وقت سفر کرنا ہرگز خطرے سے خالی نہیں۔ علاوہ ازیں فریزر کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔" آرتھر نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہم چھپ سکیں۔ گوٹنگا اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہیں۔ اگر وہ اس جنگل میں موجود ہوئے تو ہمیں ضرور ڈھونڈ نکالیں گے بہتر یہی ہے کہ ہم رات کے اندھیرے میں ہی دریا کنارے پہنچ جائیں۔" میلو نے قدرے ترشی سے کہا اور فریزر نے بھی میلو کی تجویز سے اتفاق کیا۔

رات کا پچھلا پہر تھا جنگل پر مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے قدم اٹھا رہے تھے۔ درختوں میں سے پرندے کے پھڑپھڑانے پر بھی ان کے خوفزدہ دل زور زور سے دھڑکنے لگتے۔

وہ رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے دریا کنارے پہنچ گئے۔ موٹر بوٹ اسی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درخت سے بندھی ہوئی تھی۔ کوئی ایک فرلانگ دور یارابو گاؤں چاندنی میں بڑا بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔ فریزر کی حالت ہر لحظہ ابتر ہو رہی تھی اور اس کا ایک ہی حل تھا کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے وہ نزدیکی شہر سانتا اسابل پہنچ جائیں جہاں سرکاری ہسپتال ہے اور فوری طبی امداد کا بندوبست ہو سکتا ہے۔

سانتا اسابل کے ہسپتال میں فریزر کے زخم کا معائنہ ہوا اور ضروری دوا کے بعد پٹیاں وغیرہ باندھ دی گئیں۔ لیکن فریزر کی نازک حالت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے اسے سنتریم پہنچا دیا جہاں وہ بہت دنوں تک ہسپتال میں زیر علاج رہا۔

کچھ دنوں کے بعد آرتھر اپنے وطن امریکہ روانہ ہوگیا جہاں اس نے نومبر ۱۹۶۳ء میں ماتوگروسو کے آدم خور قبیلے کی زندگی عادات' خصائل اور خوفناک رسوم کے متعلق اخبارات میں ایک تفصیلی رپورٹ شائع کرائی۔ ادھر برازیل کی حکومت نے دریائے جرا کے کنارے اور ماتوگروسو کے علاقے میں پولیس کی مستقل چوکیوں کا انتظام کر دیا تاکہ ماتوگروسو کے دوسرے پرامن ریڈ انڈین قبیلے گوٹنگا آدم خوروں سے محفوظ رہ سکیں۔

کئی دنوں تک اخباری نمائندے آرتھر سے اس خوفناک واقعہ کی تفصیلات دریافت کرتے رہے۔ ایک اخباری نمائندے نے سوال کیا۔ "یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ جب گوٹنگا آدم خوروں نے ایک بار آپ کی دوستی کا دم بھر لیا تو پھر آپ لوگوں پر حملے کی کیا ضرورت تھی؟" "میرے خیال میں اس حملے کی صرف ایک ہی وجہ ہوسکتی ہے اور وہ ہے گوٹنگا قبیلے کا عقیدہ۔ ان آدم خوروں کا عقیدہ ہے کہ ان کی بستی میں باہر سے صرف بدروحیں آسکتی ہیں۔" آرتھر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں حیران ہوں تہذیب و تمدن سے کوسوں دور غاروں میں رہنے والے یہ برہنہ آدم خور ہم تہذیب یافتہ لوگوں کو بدروحیں کیوں تصور کرتے ہیں؟"

O☆O

غار کا راز

"خوف میں بھی عجب نرالا پن ہے' لیکن اس کے نسبتی تاثر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔" ولسن نے اپنے چشمے کے دھندلے شیشے رومال سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "شاید آپ میرا مفہوم نہیں سمجھے۔ خوف آپ کے لیے مختلف شے ہے اور میرے لیے کچھ اور۔ اس میں مزاج کا بڑا دخل ہے۔ کوئی بلندیوں سے خوفزدہ ہے' کوئی پستیوں سے ہراساں' ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو محض تاریکی کے احساس سے دم بخود ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے سرپھرے بھی ہیں جو منطق سے ذرا پرے پھسلتے ہی خائف ہو جاتے ہیں۔"

طعام خانے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے لیے یہ بات بڑی سنسنی خیز تھی۔ وہ باہم سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف متحیر نظروں سے دیکھنے لگے' پھر ایکا ایکی یوں چپ ہوگئے جیسے اچانک انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔ ولسن نے جب یہ حالت دیکھی تو پھر گویا ہوا:

"قصے کہانی میں عموماً غیر منطقی' پراسرار یا ہیبت ناک مقام کا ڈھانچہ قائم کیا جاتا ہے۔ جس کے پس منظر میں اتھاہ تاریکی طوفان برق و باراں' اڑتے ہوئے بادل اور مہیب سائے ضرور نمایاں ہوتے ہیں' حالانکہ حقیقی زندگی میں ایسا ممکن نہیں۔ سچ پوچھو تو خوف عموماً دوپہر کے سناٹے میں جنم لیتا ہے اور بلاشبہ یہ انتہائی دہشت ناک بات ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے پینڈر سمیت اپنے اخبارات میز پر پٹخ دیے اور ہمارا مختصر سا گروپ ہمہ تن گوش ہو کر ولسن کی باتیں سننے لگا۔

"مجھے ایک ایسا واقعہ یاد ہے جس کا کوئی منطقی جواز موجود نہیں، لیکن یہ دوپہر کے خوف کی آنکھوں دیکھی روداد ہے۔ فرانس کے ایک گاؤں میں عین دوپہر کے وقت سنورشے نامی ایک کسان گندم کے کھیت میں اچانک اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس معتدل موسم میں ضرب آفتاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ کھیت ویسے بھی جھاڑ جھنکار سے بالکل صاف تھا۔ اس کم بخت کی دیوانگی مدتوں ایک سربستہ راز بن کر رہ جاتی لیکن تین عینی شاہدوں نے اس بات کی گواہی دی کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے گندم کے خوشوں میں گھرے ہوئے اس کسان کے گرد تین بگولوں کو آتشیں ہیولوں کی طرح رقصاں دیکھا، حالانکہ اس دن ہوا کا دباؤ بہت کم تھا۔ آخر وہ کیا شے تھی جس نے آنکھ جھپکتے میں سنورشے کو روز روشن میں مخبوط الحواس بنا دیا۔ مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کوئی خبیث روح تھی جو بگولے کی صورت میں دندناتی اور غراتی ہوئی وادیوں میں اپنے شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی تھی۔ خدا جانے سنورشے نے اسے سچ دیکھا بھی یا نہیں، لیکن یہ بات ضرور ماننا پڑے گی کہ دوپہر کے وقت خوف کی اچانک گرفت نے اس کی عقل و ہوش کو یکبارگی نگل لیا۔ موپساں نے بھی اپنے ایک افسانے میں انسانی ذہن پر خوف کے گہرے اثرات کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ واقعہ ایک پہاڑی جھونپڑی کا ہے جس کا مکین کھڑکی سے باہر نظر آنے والے بھیانک چہرے سے خوفزدہ ہو کر شب بھر پسینے میں شرابور کروٹیں بدلتا رہا، حالانکہ وہ مکروہ چہرہ اس کے اپنے رکھوالے کتے کے سوا کسی دوسرے کا نہ تھا، لیکن رات کے اندھیرے میں احساس تنہائی اور تیز ہواؤں کی سائیں سائیں نے اس کے دل کی تہوں میں چھپا ہوا خوف معاً بیدار کر دیا۔

"میں اپنے عہد شباب میں اس افسانے سے سخت متاثر تھا اور میں نے اس کا بار بار مطالعہ محض اس لیے کیا کہ میرے عقل و فہم کو ذرا تازگی مل سکے۔ مجھے بھی کوہ پیمائی کے سلسلے میں کچھ اسی قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا جو اگرچہ بظاہر لاکھ قابل بیان تاہم وہ ایک بے کیف دہشت سے بھرپور تھے۔ میری اس تجربے کی بنیاد اس ہولناک تماشے پر ہے جو میری آنکھوں کے سامنے کھیلا گیا اور جس کا میرے غیر شعوری محسو

کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔"

کمرے میں گہری خاموشی طاری تھی، البتہ آتشدان سے کندوں کے بار بار چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔ سب لوگ سچ مچ ولسن کی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے جو اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھے آگ کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھا تھا۔

"یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں آسٹریا کے کوہستانی علاقے کی سیر کو نکلا۔ اس وقت میری عمر یہی کوئی انتیس تیس برس کی ہوگی۔ میں بالکل تندرست و توانا تھا اور کسی قسم کے مریضانہ جذبات یا توہمات کا میری زندگی میں دخل نہ تھا۔ اس فرحت بخش فضا میں میرا ارادہ کوئی دو مہینے ٹھہرنے کا تھا، کیونکہ مسلسل تین ہفتے کی آوارہ گردی سے میرے مزاج کی کیفیت اپنے پورے عروج پر تھی اور ان دنوں میں کسی کے پرتو حسن سے مسحور بھی ہو چکا تھا۔ دراصل میں ذرا دور دراز وادیوں میں گھوم پھر کر فطرت کی بکھری ہوئی رنگینیوں کا نظارہ کرنا چاہتا تھا اور ساتھ ساتھ پرانے گرجاؤں کی بے مثال نقاشی اور کندہ کاری کی تصویریں اتارنا چاہتا تھا۔ میں دن بھر پہاڑ کے دامن میں ڈھلانوں پر پھسلتا سرو اور صنوبر کے گنجان جنگلوں میں ٹھوکریں کھاتا پھرا اور بالآخر راستہ بھول گیا، کیونکہ سرشام مجھے جس وادی تک پہنچنا تھا، اس کا کہیں کوئی نشان موجود نہ تھا۔ اب میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ یا تو میں وہیں شب بھر کے لیے پڑاؤ ڈال دوں یا اس وادی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا پھروں۔ چونکہ میرے پاس اس وقت سامان رسد کی سخت کمی تھی اور اوڑھنے بچھونے کے لیے بس دو ایک چادریں ہی تھیں، اس لیے میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ تھکا ماندہ تو تھا ہی تھوڑے دیر ستانے کے لیے لیٹ گیا اور سگریٹ سلگا کر دھوئیں کے مرغولے بناتا اس کوہستانی فضا کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، چاکلیٹ کا پورا پیکٹ ملا اور میں فرط مسرت سے فوراً ہی اٹھ کر سیٹی بجاتا اور اپنے لوک گیت گاتا ہوا چوٹی کی طرف چل دیا۔ کوئی ایک میل دور پگڈنڈی نما سڑک دکھائی دی میں لپک کر اس پر ہو لیا اور ڈھلانوں پر پھسلتا ہوا، گرتا پڑتا ایک گاؤں تک پہنچ گیا جہاں کوئی تیس چالیس گھر آباد تھے۔ اچانک مجھے صنوبر کے درختوں میں گھرا ہوا ایک ہوٹل نظر آیا جس کے چاروں طرف مخملیں گھاس اور جابجا رنگ برنگ پھولوں سے لدی پھندی کیاریاں تھیں۔ میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مزید سفر کی تکان سے بچنے کے لیے رات بھر وہیں قیام کرنے کا فیصلہ کیا اور تیزی سے بڑھ کر ہوٹل کے دروازے پر دستک دی۔ ایک موٹی تازی عورت باہر نکلی اور مسکرا کر کہنے لگی ان دنوں ہوٹل مہمانوں کے لیے بند ہے۔ یہ سن کر میرے دل کو دھچکا سا لگا اور یہ معلوم کرکے اور بھی افسوس ہوا کہ اس علاقے کے دوسرے ہوٹل بھی سیزن کے خاتمے کی وجہ سے بند ہو چکے ہیں۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ اس عورت کے دائیں بائیں دو خونخوار کتے لپک لپک کر غرانے لگے۔ میں بڑی خاموشی سی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا واپس جانے لگا تو اس نے مجھے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ اس ہوٹل کے قریب ہی ہر سٹیز کا مہمان خانہ ہے ممکن ہے وہ مجھے ایک رات کے لیے ٹھہرنے کی اجازت دے دے۔ میں بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہوا کوئی پچیس منٹ میں وہاں پہنچ گیا۔ مہمان خانہ بالکل سرائے کی طرح بنا ہوا تھا جس کے عقبی حصے میں ادھیڑ عمر کے جرمن میاں بیوی رہتے تھے جو اس مہمان خانے کے مالک بھی تھے۔ انہوں نے جس گرمجوشی سے میرا استقبال کیا' اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دونوں بڑے مہمان نواز ہیں۔ ہر سٹیز کو اخبار بینی کا بڑا شوق تھا اور وہ باورچی خانے میں آگ کے قریب بیٹھ کر گھنٹوں اخبار کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس کی بیوی مرتھا اس سے عمر میں کوئی پندرہ برس بڑی تھی لیکن نہایت خاموش طبع اور کم سخن۔ مہمان خانہ بڑا صاف ستھرا تھا اور لذیذ کھانا پابندی سے پر تکلف انداز میں پیش کیا جاتا۔

مجھے سٹیز کے ہاں ٹھہرے ابھی صرف تین ہی دن ہوئے تھے لیکن اس کے اچھے سلوک کے باوصف مجھے اس کی آنکھوں میں شدید کرب اور بے چینی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ ایک عجب انداز میں بیٹھا دکھائی دیتا اخبار اس کے گھٹنوں پر اور سر ایک طرف کو ڈھلکا ہوا' جیسے وہ ہمہ تن گوش ہو کر کوئی خفیہ سرگوشیاں سن رہا ہو۔ اس کا مہمان خانہ جنگلی علاقے سے گھرا ہوا تھا اور آبادی سے کٹ جانے کے باعث وہاں کی فضا پر اکثر بڑی اداسی اور افسردگی سی چھائی رہتی۔

پہلے ہی روز شام کو جب میں نے اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھولیں تو رات کے سناٹے میں کسی قریبی آبشار کے گرنے کی آواز نے میرے دل کے تہ خانے میں رنج والم کی لہر دوڑا دی۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں پورا ہفتہ قیام کروں' لیکن حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ میرے لیے مزید رکنا ناممکن ہو گیا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر میں ملحقہ علاقے کی چھان بین

کے لیے باہر نکلا اور قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہوا جونہی لوٹنے لگا' مجھے اپنے قریب ہی سرخ رنگ کی کوئی شے نظر آئی۔ ایک ایسے مقام پر' جہاں چاروں طرف سبزہ اور سرو و صنوبر کے درختوں کی بھرمار ہو' یہ سرخی کچھ عجب سی معلوم ہوئی۔ میں تیزی سے قدم اٹھاتا اس طرف گیا' لیکن یہ دیکھتے ہی میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہر طرف تازہ خون ہی خون بکھرا پڑا ہے اور قریبی چٹان بھی خون کے چھینٹوں سے سرخ ہو رہی ہے۔ میں کھوج لگانے کی غرض سے ذرا چند قدم آگے گیا۔ مجھے ایک موٹی تازی بکری کی لاش دکھائی دی جسے شاید تھوڑی ہی دیر پہلے مارا گیا تھا۔ میرا خیال تھا بکری چٹان سے گر کر ہلاک ہو گئی ہے' لیکن بعد میں یہ خیال غلط نکلا' کیونکہ بکری کا گلا کٹا ہوا تھا اور سینہ بھی بڑے وحشیانہ انداز میں چاک کیا گیا تھا۔ یہ یقیناً کسی بڑے خطرناک درندے کا کام تھا۔ میں نے اپنی حفاظت کی خاطر درخت سے ایک بڑی سی شاخ توڑی اور اسے لہراتا ہوا سیدھا مہمان خانے کا رخ کیا۔ راستے میں میری ملاقات ایک بوڑھے سے ہوئی جو وضع قطع اور لباس سے گڈریا معلوم ہوتا تھا۔ جب میں نے بکری کا ذکر کیا تو اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ منہ بسور کر کہنے لگا: "یہ بلا ہمیں بڑے دنوں سے تنگ کر رہی ہے گلے سے بھیڑ بکریوں کو اٹھا لے جاتی ہے اور گائے بھینس کو بھی نہیں چھوڑتی۔" مہمان خانے پہنچ کر جب میں نے سٹیز کو اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کیا تو اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا اور ذرا ہکلاتے ہوئے بولا: "کسی خوفناک درندے نے پچھلے چند ہفتوں سے اس علاقے میں بڑا اودھم مچا رکھا ہے' بھیڑ بکریوں اور گائے بھینسوں کو بے تکان اٹھا لے جاتا ہے اور ان کا خون پی کر عموماً لاشوں کو گلنے سڑنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ اسے گردن چبانے کا بڑا شوق ہے۔ مقامی شکاریوں نے اسے ہلاک کرنے کے لیے بڑی تگ و دو کی' مگر بے سود کیونکہ لمبی چوڑی تلاش کے باوجود اس کی صورت تک بھی دکھائی نہ دے سکی۔ خدا جانے وہ کوئی جنگلی حیوان ہے یا وحشی درندہ' مجھے تو خدشہ ہے کہ کہیں وہ بکری میرے ہی گلے کی نہ ہو اگرچہ میں نے اپنی چراگاہ کے گرد خار دار تاروں سے احاطہ بندی کی ہوئی ہے۔

میں نے سٹیز کی توضیح کو بظاہر قبول کرلیا لیکن میرا دل اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ صاف جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ اس کے چہرے سے خطرے کی دہشت نمایاں تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مرتھا کا بھی یہی حال تھا لیکن یہ چونکہ ان کا ذاتی معاملہ تھا میں نے مزید دخل دینا مناسب نہ سمجھا لیکن یہ واقعہ میرے ذہن پر ایک بھوت کی طرح سوار ہو کر رہ گیا۔ مجھے اس مقام سے جہاں بکری کی لاش پڑی تھی اپنی اندھا دھند واپسی پر سخت ندامت تھی اور اسی لیے میں لنچ سے فارغ ہو کر مزید کھوج لگانے کے لیے ایک بار پھر دامن کوہ کی طرف نکل گیا تاکہ معاملے کی تہ تک پہنچ سکوں۔ راستے میں ایک لکڑہارا نظر آیا میں نے آنکھ بچا کر اس کی چھوٹی سی دستی کلہاڑی اٹھا کر اپنے دفاع کی خاطر اپنی پیٹی میں ٹھونس لی۔ اس کارآمد ہتھیار کے ملنے سے میرا حوصلہ اور بھی بلند ہو گیا اور میں بڑی پھرتی سے قدم اٹھاتا ہوا منٹوں میں ٹھیک اسی مقام پر پہنچ گیا۔ خون کے چھینٹوں نے سورج کی تمازت سے خشک ہو کر سیاہ رنگ اختیار کرلیا تھا اور وہ بکری کی لاش بھی غائب تھی۔ شاید اسے جنگل کے لوگ اٹھا کر لے گئے تھے یا وہ وحشی درندہ میری غیر حاضری میں اسے اپنی کھوہ میں گھسیٹ کر لے گیا تھا۔ میرے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے دفعتاً کلہاڑی کو اپنے دائیں ہاتھ میں سنبھالا اور بڑے دلیرانہ انداز میں اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اس مظلوم بکری کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ چند گز کے فاصلے پر خون کے نشانات معدوم ہونے لگے لیکن زمین پر بکری کی پچھلی ٹانگوں کے گھسٹنے کی واضح لکیریں موجود تھیں جن سے صاف ظاہر تھا کہ وہ درندہ کچھ زیادہ قوی نہیں ورنہ وہ اسے گھسٹنے کی بجائے ضرور منہ میں اٹھا کر لے جاتا۔ میرا تجربہ شاہد ہے کہ ایک طاقتور شیر ایک مردہ بیل کی پیٹھ میں اپنے دانت مضبوطی سے گاڑ کر اسے بآسانی منہ میں اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس وقت پہاڑ کے دامن میں مکمل سکوت تھا اور سورج کی روپہلی کرنوں میں پتوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ زمین پر پچھلی ٹانگوں کے نشانات مٹتے چلے جا رہے تھے اور لمبی لمبی گھاس کے قریب پہنچ کر بالکل معدوم ہو گئے۔ میں اپنے اندازے کے مطابق اس چٹان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا اور کوئی دو میل کی مسافت طے کر کے جب منزل مقصود پر پہنچا تو سہ پہر ہونے کو آئی تھی لیکن مجھے اس بارے میں کسی قسم کی کوئی تشویش نہ تھی کیونکہ سورج غروب ہونے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں وہاں گھنٹہ دو گھنٹے ٹھہر کر مزید پتہ چلانے کی کوشش کروں اور غروب آفتاب سے پہلے ہی مہمان خانے واپس پہنچ جاؤں کیونکہ کچھ عجب نہیں کہ مجھے راستے میں اس خوفناک وحشی سے دوچار

ہونا پڑے۔

میں نے پہاڑ کی چوٹی سے اِدھر اُدھر دور تک نظر دوڑائی لیکن بکری کا کوئی نشان تک نظر نہ آیا۔ میں کلہاڑی کو مضبوطی سے تھامے قریبی گھاٹی میں اتر گیا لیکن وہاں بھی کچھ نہ تھا۔ حالات سے ناامید ہو کر میں نے واپسی کی ٹھان لی اور ابھی چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ذرا دور مجھے ایک غار کا تاریک دہانہ دکھائی دیا جو ایک حد تک پتھروں اور سنگریزوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ قریب جا کر معلوم ہوا کہ یہ بہت بڑا غار ہے جس کا رخ پہاڑ کی چوٹی کی جانب ہے۔ غار کے منہ سے ذرا پرے ہٹ کر بکری کی لاش پڑی تھی۔ اس کا سر غائب تھا اور بقایا جسم کسی لاوارث مال کی طرح ریتلی زمین پر پڑا تھا۔ قریب ہی دوسرے جانوروں کی ہڈیاں اور گلے سڑے گوشت کے لوتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ اس کے علاوہ ران کی ہڈیاں اور ٹوٹی ہوئی پسلیاں بھی سینکڑوں کی تعداد میں موجود تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر پہلے تو میں ذرا ہچکچایا لیکن پھر شدت جذبات سے بے قابو ہو کر بے خوف و خطر اندر داخل ہو گیا۔ چاروں طرف ہو کا عالم تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس ہولناک ماحول میں میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اچانک میرے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ گئی اور ایک خوفناک جھرجھری سے میرا سارا بدن تھرتھر کانپنے لگا۔ دفعتاً مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ غار میلوں زمین کے اندر دھنسا ہوا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ مہم ضرور جان لیوا ثابت ہو گی لیکن میں بغیر سوچے سمجھے اپنی پیاری جان کو داؤ پر لگانے کو ہرگز تیار نہ تھا۔ میں نے اس اندھیرے میں بمشکل اپنی کلہاڑی تلاش کی اور سخت گھبراہٹ کے عالم میں ٹھوکریں کھاتا، گرتا پڑتا غار سے باہر نکل آیا۔ اچانک مجھے غار کے اندر سے کسی کے کھجانے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑے جارحانہ انداز میں دیوار سے اپنا جسم رگڑ رہا ہو۔ مجھے پورا یقین تھا کہ ضرور وہاں کوئی میری گھات میں بیٹھا ہے لیکن اس وقت فوری دہشت سے میری موت واقع ہو سکتی تھی اس لیے میں نے پوری قوت اور صبر و تحمل سے کلہاڑی پر اپنی گرفت مضبوط رکھی، کیونکہ وقتی طور پر خوف سے بچاؤ کا یہی واحد ذریعہ تھا۔ میں آہستہ آہستہ الٹے پاؤں چلتا اس منحوس جگہ سے تھوڑی دور نکل گیا جہاں چٹانوں کے آس پاس لمبی لمبی گھاس اور خودرو پودے اگے ہوئے تھے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ایکا ایکی ایک عجیب واقعہ نے میرے ہوش و حواس کو سخت مجروح کر کے میری قوت ارادی کو بالکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مفلوج کر دیا۔ ہوا یہ کہ وہاں رکتے ہی غار کی جانب سے میری کانوں میں کسی کی خشک اور بڑی ناگوار قسم کی کھوں کھوں کی آواز آئی جو بالکل کسی بن مانس کی مشابہ تھی۔ یہ آواز سن کر میرا ماتھا ٹھنکا کہ ہو نہ ہو یہ اسی خبیث درندے کی آواز ہے۔ جونہی یہ آواز دوبارہ میرے کانوں میں آئی میری حالت غیر ہونے لگی اور میں نے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا شروع کیا۔ میں کلہاڑی کو لہراتا ہوا بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑ رہا تھا اور مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھ سکوں لیکن میں محض تھوڑی دیر کے لیے اپنی ہمت اور حوصلے کو برقرار رکھ سکا کیونکہ صرف آدھ میل کے فاصلے پر ہی میں دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گیا۔ رات گئے جب میرے حواس ذرا قائم ہوئے تو میں سٹپٹائی ہوئے انداز میں یکبارگی اٹھ بیٹھ اور کلہاڑے کو مضبوطی سے تھامے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا مہمان خانے پہنچ گیا۔

میری غیر متوقع تاخیر کی وجہ سے رات کے کھانے میں کافی دیر ہو گئی اور میں بار بار یہی سوچتا رہا کہ آیا سٹیز سے اس نئی دریافت کا ذکر کرنا مناسب بھی ہوگا یا نہیں۔ مجھے پہلے واقعہ کے ردعمل کا پورا پورا احساس تھا۔ بہرحال میرے اس انکشاف پر اگرچہ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا لیکن وہ بڑی خاموشی سے میری باتیں سنتا رہا اور کہنے لگا کہ اگر مال مویشی کی غارت گری کا یہی حال رہا تو مقامی سول عہدیداروں سے کہہ سن کر اس درندے کی فوری ہلاکت کا مناسب بندوبست کیا جائے گا۔ میں نے اس سے اس مسئلے کے تاریک پہلو کا کوئی ذکر نہ کیا۔ صرف اتنا کہا کہ چونکہ میں نے وہ غار دریافت کر لیا ہے جو اس وحشی کی آماجگاہ ہو سکتی ہے اس لیے گلے کی حفاظت اور ذاتی عافیت کو ترجیح دینا اشد ضروری ہے۔ میاں بیوی کی باتوں سے یہ صاف ظاہر تھا کہ وہ اس کریہہ مخلوق سے بخوبی واقف ہیں جو ان کے مویشیوں کا خون پینے پر تلا ہوا ہے لیکن چونکہ وہ دل ہی دل میں اس سے سخت خوفزدہ تھے اس لیے اس کے خلاف کسی قسم کی خطرناک کارروائی سے جان بوجھ کر گریز کر رہے تھے۔ اس غار کے واقعہ اور جنگل کی سنسان اور ہیبت ناک فضا کے پیش نظر ان کا یہ ردعمل ایک فطری اور یقینی بات معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال میں نے اس معاملے پر زیادہ سنجیدگی سے غور کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میری حیثیت محض ایک مسافر کی تھی جو آج یہاں کل وہاں' سٹیز جانے اور اس کا کام جانے میں انہی خیالات میں کھویا خوابوں کے

جزیرے میں پہنچ گیا۔ صبح اٹھا تو میری طبیعت کچھ بجھی بجھی سی تھی۔ اس غار کے واقعہ نے میرے دل و دماغ کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا اور میں طبیعت کا یہ ناگوار بوجھ جھٹکنے کی خاطر پہاڑی کے دامن میں واقع گاؤں کی سیر کو نکل گیا۔ وہاں اتفاق سے بلیک کافی مل گئی جس نے میرے رگ و پے پر بڑا خوشگوار اثر کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں پولیس اسٹیشن پہنچا اور سارجنٹ سے بکری اور غار کا سارا ماجرا بیان کیا لیکن اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی کیونکہ بقول اس کے اس علاقے میں جنگلی جانوروں کے ہاتھوں بھیڑ بکری کی ہلاکت کوئی نئی بات نہیں۔ غار والے واقعہ کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ محض واہمہ ہے جس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں۔

مہمان خانے میں لنچ کے لیے واپسی سے پہلے میں نے ذرا قریبی گرجے کا جائزہ لیا اور اپنے کیمرے سے اس کی دیواروں کی شاندار نقاشی کی مختلف تصویریں اتاریں' ان نقاشوں کی فنکاری کے کیا کہنے' ان کی دیدہ ریزی دیکھ کر میری آنکھیں فرط حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایک تصویر البتہ نظروں کو بڑی گراں گزری اگرچہ اس کی نفاست اور رنگ آمیزی کا کوئی جواب نہ تھا لیکن وہ خباثت سے لتھڑا ہوا منظر سخت نفرت انگیز تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں گرجے کی تاریکی پراسرار ماحول اور سکوت کو بھی دخل ہو لیکن نجانے تصویر اتارتے وقت میرے ہاتھ کیوں کانپنے لگے تھے۔ یہ ایک نہایت کریہہ قسم کی مخلوق تھی جس کی بل کھاتی ہوئی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی اور بے ڈول سر کھمبے کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کا باقی سارا جسم سرکنڈوں اور گھاس پھوس میں چھپا ہوا تھا۔ اس کی زرافہ ایسی لمبی گردن پر بے شمار گلٹیاں ابھری ہوئی تھیں۔ دانت مڑے ہوئے سے اور کسی سئور کی طرح بڑے تیز اور چمک دار دکھائی دیتے تھے۔ دونوں آنکھیں بالکل سانپ ایسی تھی اور وہ بلا اپنے دونوں پنجہ نما ہاتھوں میں انسانی جسم کو مضبوطی سے تھامے سر کو چبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ مکروہ اور گھناؤنا منظر دیکھ کر مجھے متلی سی آنے لگی۔ یہ مصور کی اختراعی قابلیت کا کمال تھا کہ فریم میں جڑی ہوئی یہ تصویر بسا اوقات حرکت کرتی نظر آتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ ابھی فریم کی چوکھٹ سے دھم سے کود کر کہیں دور بھاگ جائے گی۔ سچ پوچھیے تو میں اس تصویر کے بارے میں اپنے صحیح تاثرات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا البتہ میرا ارادہ ضرور تھا کہ لندن پہنچ کر اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کوشش کروں۔ جونہی میں نے کیمرے کی مدد سے اس ہولناک منظر کی تصویر کھینچی گرجے کے عقب میں عجب قسم کا شوروغل سنائی دیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید کلیسا کے عصابردار کی آمد پر ملازمین اس کے استقبال کے لیے نعرے لگا رہے ہوں۔ میں بھاگا بھاگا باہر صحن میں گیا لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی ایسے شے بھی نظر نہ آسکی جس سے اس کرخت آواز کا سبب معلوم ہوسکے۔ اس وقت گرجے میں میرے سوا کوئی دوسرا موجود نہ تھا اس لیے یہ ہنگامہ میرے عقل و فہم سے بالا تھا۔

اب لنچ کا وقت ہوگیا تھا اس لیے میں اپنا کیمرہ سنبھالے تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے پہنچ گیا۔ کھانے سے فارغ ہوکر میں نے دوستوں کو چند خطوط لکھے اور انہیں پوسٹ کرکے دن بھر اپنے کمرے میں لیٹا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو کافی اندھیرا ہوچکا تھا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا رات کے ساڑھے نو بج چکے ہیں۔ میں کھڑکی میں کھڑے ہوکر نیچے وادی کا نظارہ کرنے لگا۔ ساری فضا چاندنی میں ڈھلی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سرو اور صنوبر کے درخت قطار اندر قطار کھڑے دکھائی دے رہے تھے اچانک سٹیز کے رکھوالے کتے کے بے اختیار بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اِدھر اُدھر جھانکا لیکن کچھ نظر نہ آ سکا۔ کتا ابھی تک بری طرح غرا رہا تھا اور نیچے جھاڑیوں سے مسلسل کھڑکھڑاہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ ایکا ایک وہ کتا زور زور سے چیخنے اور رونے لگا۔ سٹیز بھاگا ہوا آیا اور اسے برا بھلا کہتے ہوئے اندر صحن میں زنجیر سے باندھ دیا۔ کھڑکھڑاہٹ کی آواز سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی درندہ یا بھاری بھرکم شے جھاڑیوں سے اپنے منحوس جسم کو بار بار رگڑتے ہوئے کسی خاص مقصد یا ارادے سے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہی ہے غالباً تھوڑی دیر بعد یہ بلائے ناگہانی پہاڑ کی ڈھلان سے ہوتی ہوئی مہمان خانے سے دور کہیں جنگل میں گم ہو گئی۔ میں نے اپنے ذہنی انتشار سے لاتعلق ہوکر جی بھر کر رات کا لذیذ اور پرتکلف کھانا کھایا اور سگریٹ سلگا کر اپنے کاغذات اور نقشے وغیرہ نکال کر تحقیقی کام میں منہمک ہوگیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ سرد رات میں باورچی خانے کا حرارت آمیز ماحول بڑا خوشگوار معلوم ہورہا تھا۔ سٹیز کی عادت تھی کہ وہ رات سوتے وقت باورچی خانے کو کبھی مقفل نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھار ضرورت کے وقت اسے محفوظ کرنے کے لیے ایک لکڑی کا شہتیر اس کے دروازے پر فٹ کردیا جاتا لیکن اس نے بے حد وزنی ہونے

کی وجہ سے وہ اسے عموماً کھلا ہی چھوڑ دیتا۔ میں کافی رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہا اور جونہی آتشدان میں آگ بھڑکانے کے لیے اٹھا میرے کانوں میں پھر وہی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ یہ آواز سرائے کے اندر سے نہیں بلکہ باہر سے آرہی تھی اور ہوا کی سرسراہٹ' بہتے پانی کی مدھم آواز یا کسی پاپیادہ انسان کے قدموں کی چاپ سے قطعی مختلف تھی۔ میں پنجوں کے بل بڑی آہستگی سے رینگتا ہوا کھڑکی کے نزدیک پہنچا۔ وہی آواز ایک بار پھر سنائی دی جو ہو بہو اس ناخوشگوار کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ تھی جو میں نے شروع رات میں سنی تھی۔ کبھی یہ کھڑکھڑاہٹ کھرونچ کی صورت اختیار کرلیتی اور یوں لگتا جیسے کوئی اپنے جسم کو آہستہ آہستہ دیوار سے رگڑ رہا ہو۔ یہ آواز یقیناً غیرارادی لیکن بڑی پراسرار تھی جیسے کوئی اپاہج اپنی دونوں بیساکھیوں کو زمین پر گھسٹ گھسٹ کر چل رہا ہو۔ اچانک ایک بار پھر کتے کے بڑے دردناک انداز میں بھونکنے اور غرانے کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر میری روح فنا ہوگئی کیونکہ میرا ذہن پہلے ہی بری طرح متاثر ہوچکا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کتے کو کوئی ایسی ہیبت ناک اور غیرفطری شے نظر آ رہی ہے جو سرائے کے اندر گھسنے پر مصر ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا تاکہ اسے کسی نہ کسی طرح مقفل کرسکوں۔ اگرچہ میں کوئی اعصابی مریض یا ڈرپوک انسان نہیں لیکن نجانے مجھے اس رات کیا ہوگیا۔ میں غیرشعوری طور پر اپنے آپ سے باہر ہوا جاتا تھا۔ لکڑی کے اس وزنی شہتیر کو اٹھا کر باورچی خانے کے دروازے پر فٹ کرنا میرے بس کا روگ نہ تھا چنانچہ میں برقی قمقمے کی روشنی میں ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا تاکہ اس درندے کو میرا سایہ نظر نہ آسکے۔ میں ہرگز روشنی بجھانے کو تیار نہ تھا کیونکہ اس طرح شاید میں تاریکی میں اپنی ہی ذات سے خوفزدہ ہوجاتا۔

کھڑکھڑاہٹ اب بتدریج تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں نے کسی کارآمد ہتھیار کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر بے سود۔ تھوڑی دیر تک فضا پر خاموشی طاری رہی اور پھر اچانک وہی کھوں کھوں کی کراہت آمیز آواز سنائی دی جو میں نے پہلی بار غار کے قریب سنی تھی۔ کتا ایک بار پھر بڑے زور سے بھونکا اور غرانے لگا جس سے میرے رگ و ریشے میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ پھر دفعتاً چرچراہٹ کی آواز سنائی دی شاید کوئی باہر دروازے کے تختے کو زبردستی اوپر اٹھانے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر مجھے جان کے لالے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑ گئے۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا سخت مشکل تھا کہ باہر دروازے پر کوئی وحشی درندہ ہے یا بھٹکی ہوئی بدروح لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ اس کا سامنا کرنا ہرگز میرے بس کی بات نہیں۔ عین ممکن تھا کہ اس کی مکروہ صورت دیکھتے ہی میرے ہوش و حواس جواب دے جائیں۔ میں نے کھٹکے پر زور دے کر اپنی پوری قوت سے دروازہ بند رکھنے کی کوشش کی لیکن میرے لیے باہر کا شدید دباؤ ناقابل مزاحمت معلوم ہوتا تھا۔ اسی آپا دھاپی میں دروازے کا تختہ کوئی دو انچ اوپر کو اٹھ گیا۔ مارے خوف کے میرا برا حال تھا لیکن عافیت کے خیال سے میں نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لا کر اسے پھر سے بند کر ہی دیا اور خود کھٹکے کے ساتھ چمٹ گیا۔ میں سٹیز کو پکارنا چاہتا تھا لیکن میری گھگی بندھ گئی۔ میں نے ایک اینٹ کے سہارے اپنے دونوں پاؤں جما کر اپنا سارا زور صرف کر کے دروازے پر زبردست دباؤ ڈالا تاکہ اس درندے کو اندر آنے سے روک سکوں۔ اگرچہ میرے جسم کا رواں رواں سخت لرزاں تھا اور میری قوت ارادی ہر لحظہ ناکارہ ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تاکہ شاید کوئی ایسا ہتھیار ہاتھ لگ جائے جو اس نازک وقت پر میرا مددگار ثابت ہو سکے۔ مجھے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر لکڑی کا وہی شہتیر پڑا دکھائی دیا اور میں اپنی دونوں ایڑھیاں دروازے کی پشت پر جما کر الٹا لیٹ گیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شہتیر کا سرا اٹھا کر اسے اپنی طرف کھسکانا شروع کیا۔ بیرونی دباؤ اب ہر لحظہ بڑھتا جا رہا تھا اور جونہی میں نے ذرا اٹھنے کی کوشش کی میرا پاؤں پھسل گیا اور وہ شہتیر ایک دہشت ناک آواز کے ساتھ زمین پر آ رہا۔ ساتھ ہی آتش دان کے اوپر رکھا ہوا چائے کا سماوار بھی ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ فرش پر گر گیا۔ یہ شور سنتے ہی کتے نے اور بھی زور سے بھونکنا اور غرانا شروع کر دیا اور سٹیز نیند سے بیدار ہو کر کتے کو بلند آواز میں ملامت کرتا ہوا سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اس کی بیوی مرتھا نے فوراً بالائی منزل کی سب بتیاں روشن کر دیں۔ اگرچہ اس وقت دروازے پر بیرونی دباؤ کے کوئی آثار نمایاں نہ تھے مگر میں نے والہانہ جذبے سے کام لے کر اس شہتیر کو دروازے کے سامنے مضبوطی سے فٹ کر ہی دیا۔ اس جدوجہد میں میرے [illegible] پاؤں شل ہو چکے تھے اور میں بے اختیار چکرا کر دھم سے فرش پر گر گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ سنبہ، شہتیر اور خوفزدہ چہرہ' کتے کا باؤلا

پن' میری جنونی کیفیت اور بے ربط بیان۔ یہ سب کچھ سنا کر میں بار خاطر نہیں ہونا چاہتا۔ ہم شب بھر جاگتے رہے اور بڑی کوشش اور محنت سے گھر کا سارا بھاری سامان اٹھا کر تینوں دروازوں کے آگے رکھ دیا تاکہ کسی قسم کے شدید بیرونی دباؤ سے بھی دروازہ نہ کھل سکے۔ دراصل مجھے زندگی بھر کبھی ایسی ہولناک صورت حال سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سارے اعضاء چکنا چور ہو گئے ہیں اور میری قوت ارادی مکمل طور پر سلب ہو گئی ہے۔ کبھی یوں لگتا جیسے میری روح میرے جسم سے بغاوت پر تلی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود میں نے جی کڑا کر کے سٹیز کے ساتھ مل کر تمام دروازوں کو بالکل محفوظ کر دیا اور ہم ساری بتیاں روشن کر کے بالائی منزل پر چلے گئے۔ سٹیز کے ذہن میں ایک اچھوتا خیال آیا۔ اس نے زینے کے نیچے اور ابتدائی سیڑھیوں پر بہت سے برتن بکھیر دیئے تاکہ ان کی کھڑکھڑاہٹ سے اس درندے کی آمد کا فوراً پتہ چل سکے۔ ہم تینوں نے ایک ایک رائفل سنبھال لی اور شب خوابی کے کمرے میں مقفل ہو کر پاس پاس بیٹھ گئے۔ اس وقت رات کا کوئی ڈیڑھ بجا تھا اور پو پھٹنے میں ابھی پورے چار گھنٹے باقی تھے لیکن اس ہیبت ناک ہنگامے کے بعد رات کے سناٹے میں کسی قسم کی آواز سنائی نہ دی۔ ہم آفت کے ماروں نے رات آنکھوں میں کاٹی اور ایک دوسرے سے صرف سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ ہوا کی سرسراہٹ یا پتوں کی معمولی کھڑکھڑاہٹ سے ہمارے کان کھڑے ہو جاتے۔ ہم نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے اس واقعہ پر تھوڑی بہت روشنی ڈالی۔ ان میاں بیوی کی بات چیت سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس واقعہ کی حقیقت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہیں لیکن نجانے کیوں وہ دل کی بات کہنے سے گریز کر رہے تھے۔ اچانک میں نے مرتھا کی بڑبڑاہٹ سنی۔ "وہ کبھی اتنا نزدیک تو نہ آئے تھے۔" لیکن فوراً ہی اس کے شوہر نے آہستگی سے اس کے کندھے کو دبایا اور وہ یکبارگی خاموش ہو گئی۔ میں نے ذرا گہری نگاہ سے اس واقعہ کی نوعیت پر غور کیا تو ساری حقیقت آشکارا ہو گئی۔ خدا کی مخلوق میں بھلا ایسا کون سا حیوان ہے جو انسان کی طرح دروازے کے تختوں کو اوپر اٹھا سکے۔ شاید بندر یا لنگور میں یہ صفت موجود ہو لیکن بظاہر یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی ہرن یا بارہ سنگھے کے سینگ دروازے کے تختے میں پھنس جائیں اور وہ انہیں چھڑانے کی کوشش میں اپنے سر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے زور سے تختے کو اوپر اٹھا لے لیکن اس دروازے کے باہر موجود اس درندے یا بدروح نے تو بڑی آسانی سے ایک انسان کی طرح اس تختے کو اوپر اٹھا لیا تھا اور اس کی خوفناک قوت کا مسلسل دباؤ کچھ کم اذیت ناک نہ تھا۔ اس اچانک حملے نے میرے ذہن میں ہوش و خرد کی کوئی رمق باقی نہ چھوڑی لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ کام کسی اور انسان کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے تنگ آکر سوچنا بند کر دیا اور کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے ٹیک لگا کر اپنا سر گھٹنوں پر رکھے اونگھنے لگا۔ میرے دائیں ہاتھ میں رائفل تھی اور اسی کرب و بے چینی کی حالت میں میری آنکھ لگ گئی۔ صبح آنکھ کھلی تو چھ بج رہے تھے۔ میں نے تہہ دل سے خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کیونکہ جنگ کے دنوں میں بھی ایسے صبر آزما حالات سے واسطہ نہ پڑا تھا۔ باہر پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سٹینز کا مرغا اذانیں دے رہا تھا۔ مرغیاں بھی اُدھر اُدھر کٹ کٹ کرتی پھر رہی تھیں اور کتا بھی بھونک بھونک کر شاید رات کے اس دردناک واقعہ کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ ہماری ذہنی پسپائی کا یہ عالم تھا کہ صبح سات بجے تک نیچے اترنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ ہم نے سب سے پہلے چاروں طرف کھڑکیاں کھول کر اِدھر اُدھر دور تک نگاہ دوڑائی مگر کہیں بھی اس خطرناک درندے کی موجودگی کا امکان نظر نہ آیا۔ قریب ہی ایک بیل گاڑی چرچراتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس پر ایک آدمی سوار تھا اور دوسرا اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ اس وقت نچلی منزل میں سب بتیاں روشن تھیں اور باورچی خانہ بھی جگمگا رہا تھا۔ سیڑھیوں کے آس پاس سب برتن جوں کے توں دھرے تھے۔ مرتھا یوں ناشتہ تیار کرنے میں مصروف تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر میں اپنی رہی سہی قوت سے اس بھاری شہتیر کو پرے ہٹا کر باہر پھیلتی ہوئی دھوپ میں نکل گیا اور اس دروازے کی طرف دیکھنے لگا جو گزشتہ شب ہماری قوت آزمائی کا مرکز تھا۔ اسی سوچ بچار میں رات کا وہ بھیانک ناٹک ایک ہوا بن کر میرے سامنے آگیا اور میں ٹھوکر کھا کر بمشکل گرتے گرتے بچا۔ دروازے کے عین باہر کچھ عجیب سے قدموں کے نشان موجود تھے۔ نہ تو آپ اسے نقش پا کہہ سکتے ہیں نہ پنجوں کے نشان۔ قریب ہی زمین پر دو سوراخ بھی تھے جو ایک دوسرے سے چھ انچ کے فاصلے پر تھے۔ وہ ذرا لمبان میں تھے لیکن ان کی بناوٹ بیضوی شکل کی تھی۔ میں بڑی حیرانی سے ان دونوں سوراخوں اور پیروں کے نشانوں کو تکتا رہا اور عین ممکن تھا کہ میں اس گھڑی سراسر دیوانگی

کی حالت میں اپنے کپڑے پھاڑ کر چیختا ہوا جنگل کی طرف بھاگ جاؤں۔ میری دانست میں خدا تعالیٰ کی کوئی مخلوق اس دنیا میں ایسی موجود نہیں جس کے پیروں یا پنجوں کے نشان اس قسم کے ہوں۔ میں شوق تجسس میں ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک بار پھر غار کے قریب جا نکلا جہاں پہنچ کر یہ نشانات بالکل معدوم ہو گئے۔ معاً میرے کانوں میں وہی کھوں کھوں کی ہولناک آوازیں آنا شروع ہوئیں اور میں سخت خوفزدہ ہو کر اپنے آپ کو کوستا سرپٹ دوڑتا ہوا واپس مہمان خانے پہنچ گیا۔ میں نے دروازے پر قدم رکھا ہی تھا کہ کتا مجھے دیکھ کر خلاف معمول بھونکنے اور غرانے لگا۔ شاید اسے میری آنکھوں میں اس درندے کا کوئی شائبہ نظر آنے لگا تھا!"

کمرے کی فضا پر ایک گہرا سکوت طاری تھا اور ولسن اپنی بات ختم کر کے بڑی سنجیدہ نظروں سے آتش دان میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ رہا تھا۔

"شاید وہ کسی ہرن کے پیروں کے نشان ہوں۔" پینڈر نے ذرا مضطرب لہجے میں کہا۔

"ہرگز نہیں۔" ولسن نے پلٹ کر جواب دیا۔ "میں ہرن کے پیروں کے نشان اسی طرح پہچان سکتا ہوں جیسے آئینے میں اپنی شکل و صورت' نہ صرف مہمان خانے کے سامنے بلکہ راستہ بھر اس درندے کے پیروں کے نشان کی جوڑی موجود تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ درندہ یا بدروح اپنی پچھلی ٹانگوں کے سہارے چل پھر رہا تھا یا ممکن ہے اس کی صرف دو ہی ٹانگیں ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ غار سے واپسی پر میں نے دہشت ناک تاثر کی وجہ سے غصے میں آ کر اکثر جگہوں سے اپنے بھاری جوتوں سے اس کے پیروں کے نشان مٹا دیئے تھے حالانکہ یہ میری سراسر حماقت تھی۔ میں نے سٹینز کو لاکھ سمجھایا کہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر وہ کچھ دنوں کے لیے سرائے سے کہیں دور چلا جائے لیکن وہ دونوں میاں بیوی اپنے پرانے گھربار کو چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے کیونکہ یہ ان کے روزگار کا سوال تھا۔ مجھے ان کی آئندہ سلامتی کے متعلق سخت تشویش تھی اس لیے میں نے مشورہ دیا کہ وہ کم از کم دو چار خونخوار کتے اپنے حفاظت کے لیے ضرور رکھ چھوڑیں اور تمام دروازوں پر آہنی چٹخنیاں لگوا لیں۔ معاً سٹینز کے لبوں پر ارتعاش پیدا ہوا لیکن وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا اور پھر ذرا توقف کے بعد بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "ان بلاؤں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو روکنے کے لیے چٹخنیوں سے کیا ہو گا۔" میں نے اس کی بیوی مرتھا کی چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے آنسو چھلکنے ہی والے تھے۔ یہ منظر دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا کیونکہ ان چند دنوں میں ان دونوں کے حسن سلوک نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا لیکن اس رات کے ہیبت ناک واقعے کے بعد میں وہاں ایک منٹ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اپنا رخت سفر باندھا اور سہ پہر کو بڑے مضطرب انداز میں ان سے رخصت چاہی کیونکہ میں اس وقت انتہائی روحانی کرب میں مبتلا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے تن بدن میں گرمی پھنک گئی ہے۔ میں نے جاتے جاتے انہیں سخت تاکید کی کہ وہ شکاریوں کی پارٹی کو بھیج کر غار کے اندر چھپی ہوئی اس بلائے ناگہانی کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کریں کیونکہ مجھے سخت خدشہ تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور ان کے لیے وبال جان بن جائے گی۔ سٹیز نے بڑی اداس نظروں سے میری طرف دیکھا اور شکریہ ادا کرتا ہوا دروازے تک چھوڑنے آیا۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق غار سے کوسوں دور راستے کے ایک نزدیکی گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

میں متواتر تین ہفتے تک دامن کوہ میں واقع سرسبز دیہی علاقوں کی سیر و تفریح میں مصروف رہا اور مجھے رہ رہ کر اس جرمن میاں بیوی کا خیال آیا جو درحقیقت اس وقت موت کے چنگل میں تھے لیکن مجبوری کی وجہ سے اپنے بچاؤ کے لیے کوئی قدم اٹھانے سے قاصر تھے۔ کبھی مجھے اس مہمان خانے کی تنہائیوں کا خیال آتا تو کلیجے پر سانپ لوٹ جاتا اور اس کے ساتھ ہی اس منحوس غار اور بدروح کے شبانہ حملے کے تصور سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں نے لندن جانے سے پیشتر تھوڑی دیر کے لیے سٹیز سے ملنے کا فیصلہ کیا اور پاپیادہ سفر کی صعوبتیں جھیلتا طویل پہاڑی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا اس علاقے میں پہنچ گیا۔ لوگوں میں بھگدڑ سی مچ رہی تھی میں نے پولیس سارجنٹ سے اس کا سبب پوچھا تو یہ معلوم کر کے مجھے سخت صدمہ ہوا کہ سٹیز اور اس کی بیوی کو کل رات کسی درندے نے چیر پھاڑ دیا۔ شب خوابی کے کمرے میں ان کے جسم کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے اور در و دیوار خون کے چھینٹوں سے یوں سرخ ہو رہے تھے جیسے ہلاکت کے وقت ان کے جسم سے خون کے فوارے چھوٹ گئے ہوں۔ غالباً انہیں انتہائی ایذا رسانی کے بعد بڑے وحشیانہ انداز میں ہلاک کیا گیا تھا اور سب سے عجیب بات یہ کہ ان دونوں کے سر غائب تھے۔ یہ واقعہ سن کر مجھے گرجے کی وہی خوفناک تصویر یاد آنے لگی اور میں ایکا ایکی سخت آزردہ خاطر ہو گیا۔ مجھے اس بات کا سخت قلق تھا کہ میری منت سماجت کے باوجود انہوں نے مہمان خانے کو وقتی طور پر چھوڑنے سے انکار کر دیا ورنہ ان کی جان ضرور بچ جاتی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں اس بلا کی زد سے محفوظ رہا لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا۔

مجھے اس بات کا بھی سخت رنج تھا کہ میری بروقت رپورٹ کے باوجود پولیس نے ضروری کارروائی سے گریز کیا ورنہ اس غار میں بسنے والے درندے یا بن مانس کو کبھی کا ختم کر دیا گیا ہوتا۔ میری باتیں سن کر پولیس سارجنٹ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سٹیز اور مرتھا کی ہلاکت محض اس کی غفلت کا نتیجہ تھی اور فوری ردعمل کی طور پر اس نے چند گھنٹوں کے اندر ماہر شکاریوں کی ایک جماعت کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ غار میں گھس کر اس خبیث روح کو ہمیشہ کے لیے فنا کر دیں۔ میں بھی اس پارٹی کے ہمراہ ضرور جاتا لیکن میرا دل نہیں مانتا تھا' کیونکہ اس رات کے گھناؤنے واقعہ کا ابھی تک میرے دل و دماغ پر گہرا اثر تھا اور ان دونوں کی دردناک موت نے میری دفاعی قوتوں کو سخت خوفزدہ کر دیا تھا۔ سرشام جب یہ پارٹی واپس آئی تو سارجنٹ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اس نے صرف اتنا کہا وہ جگہ بڑی تاریک اور خطرناک ہے اور ٹارچ کی مدد سے بھی وہاں کسی درندے کا شکار کرنا سخت مشکل ہے۔ وہ لوگ غار کے بھیانک ماحول سے سخت خوفزدہ تھے اگرچہ انہوں نے تاریکی میں اندھا دھند کئی فائر بھی کیے لیکن کوئی کارآمد نتیجہ نہ نکل سکا۔ اگلے دن ایک ماہر کی مدد سے اس غار کو چٹان سمیت ڈائنا میٹ سے اڑا دیا گیا اور یقیناً وہ خونخوار درندہ ہمیشہ کے لیے اس لاکھوں من پتھروں کے بوجھ کے نیچے دب کر رہ گیا۔"

ولسن نے بڑی دزدیدہ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔ "یہ سارا مسئلہ خوف کا ہے۔ الٰہی توبہ ایسا خوف جس سے کبھی زندگی بھر واسطہ نہ پڑا تھا۔ اور جس کا دوبارہ سامنا کرنا میرے بس کا روگ نہیں۔ میں اس کی پوری توضیح نہیں کر سکتا لیکن ذرا آپ سوچیے تو آخر میں نے اس روز کیا دیکھا۔ وہی زمین پر دو سوراخ اور کُھروں کے نشان' میرے کانوں میں دبی دبی کھوں کھوں اور بار بار جسم کو کھجانے اور دیوار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے رگڑنے کی آواز برابر آتی رہی۔ یقین جانیے یہ سب کچھ محض اتفاق نہیں تھا کیو
بالآخر کسی درندے یا خبیث روح نے سٹیز اور اس کی بیوی مرتھا کے جسم کو نوچ نوچ
اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ خون بھی پیا اور اس کے چھینٹے بھی اڑائے۔ میرے خیال
تو وہ بلا پورے کے پورے دونوں سر بھی نگل گئی۔"

"عجب واقعہ ہے۔" حاضرین میں سے کسی نے ذرا دھیمی آواز میں کہا۔ "اور سب
سے عجب بات یہ کہ جب لندن واپس پہنچ کر میں نے گرجے کی تصویروں کے پرن
نکلوائے تو ایک تصویر بالکل کوری نکلی۔ اس کا پورا عکس غائب تھا اگرچہ وہی تصویر میر
لیے سب سے زیادہ اہم اور قابل تحقیق تھی۔ آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے وہ کون
تصویر تھی۔"

کمرے میں موت کا سکوت طاری تھا اور ولسن کی بات سن کر ایکا ایکی سب
نظروں میں اس کریہہ مخلوق کی تصویر گھومنے لگی جس کی بل کھاتی ہوئی گردن ایک طر
کو ڈھلکی ہوئی تھی اور بے ڈول سر کھمبے کی طرح تنا ہوا تھا۔ انہیں دفعتاً یوں محسوس
جیسے وہ اپنے دونوں پنجہ نما ہاتھوں میں سٹیز اور مرتھا کے جسم کو بڑی مضبوطی سے تھا
ان کے سروں کو چبانے کی کوشش کر رہی ہے!

○☆○

پُراسرار شیطان

دہشت سے میرا جسم برف کی طرح سرد ہو گیا تھا اور ذہن ماؤف' سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود تھی۔ یہی حالت میری بیوی کی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے حلقوں سے ابل پڑیں گی۔ خوف نے چہرے کا خون نچوڑ لیا تھا۔ سرخ و سفید چہرہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹی جا رہی تھی۔ اس کی مخروطی انگلیاں میرے بازو میں دھنستی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں ہاتھ جھٹک دیتا لیکن میں تو خود سکتے کے عالم میں تھا۔ میری آنکھیں کرسی پر لگی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر پہلے وہ کرسی خالی تھی۔ کھنڈر نما کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر اس کرسی پر پڑی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی کہ ایسی قیمتی کرسی کس بے وقوف نے وہاں ڈال رکھی ہے لیکن اس پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا' جان کے لالے پڑے تھے۔ انسانی درندوں سے جان بچانا مقدم تھا اس لئے میں نے کرسی پر غور کرنا وقت کی بربادی خیال کیا۔ وہاں سے فوراً نگاہیں ہٹالی تھیں۔ کرسی سے جب نگاہیں ہٹیں تو مجھے ایک خوبصورت مگر قدیمی چھپرکھٹ نظر آیا۔ اس بیڈ پر ایک لاش پڑی تھی۔ کسی عورت کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لاش۔ حالانکہ اس کا سر غائب تھا لیکن جسم پر ایک بھی کپڑا نہ ہونے کی وجہ سے میں نے پہچان لیا تھا کہ وہ لاش کسی عورت کی ہے۔ میں نے فوراً نظریں ہٹا لیں۔ میرا دل بھر آیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی مظلوم لڑکی کی لاش ہے جسے نوچنے کھسوٹنے کے بعد قتل کیا گیا ہے۔ وہ وقت ہی ایسا تھا جب پانی مہنگا اور خون سستا تھا۔ کھٹمل' مچھر کی طرح انسانی درندے انسانیت کو مسل رہے تھے۔ ہر طرف ظلم کا بازار گرم تھا۔ ایسے وقت میں انسان' انسان سے ڈرتا ہے لاش سے نہیں۔ لاش کو دیکھ کر بھی ہم دونوں کو خوف محسوس نہیں ہوا تھا اور ہم دونوں اس بیڈ کے نیچے چھپنے کے لیے بڑھے تھے بس میں نے دوسرا قدم اٹھایا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ لاش کے بدن میں حرکت ہوئی تھی اس نے انگڑائی لی تھی۔ بھرپور انگڑائی جیسے وہ سوتے سوتے اٹھی ہو اور پھر اس نے بیڈ سے نیچے قدم رکھا تھا۔ لاش کو حرکت کرتے دیکھ کر جو کیفیت ہم پر طاری ہوئی اس کے اظہار کا یارا نہیں۔ وہ لاش بیڈ سے اتر کر کرسی کی طرف بڑھتی چلی گئی اور پھر وہ بید کی کرسی پر اس انداز میں جا کر بیٹھ گئی تھی جیسے تھکے ہوئے بدن کو آرام دینا مقصود ہو۔ اس نے ایک پیر زمین پر ٹکا رکھا تھا اور دوسرا پیر موڑ کر گھٹنے پر آڑا رکھ لیا تھا۔ مڑے ہوئے پیر کا اگلا حصہ تھرک رہا تھا۔ اکثر میں بھی سرشاری کے عالم میں اسی طرح پیر پر پیر چڑھا کر ہلاتا ہوں شاید وہ لاش مسرور تھی' انسانی کیفیات کا عکاس چہرہ ہوتا ہے لیکن اس لاش کا تو چہرہ ہی نہیں تھا۔ ورنہ میں بہ آسانی سمجھ لیتا کہ اس پر کس قسم کی کیفیت طاری تھی۔ اس کے تو کندھوں پر سر ہی نہیں تھا۔ گردن جڑ سے کٹی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی ماہر قاتل نے سر اتار لیا ہے۔ دونوں کندھوں کے درمیان سے جہاں گردن کٹی ہوئی ہے وہاں سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے بکرے کو ذبح کرنے کے بعد اس کی شہ رگ سے خون ابلتا ہے لیکن تعجب خیز بات یہ تھی کہ خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر گرتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہوا میں اچھلتے ہی غائب ہو جاتا تھا۔ یہ تماشا کئی منٹ سے جاری تھا اور دوسرا تماشہ باہر ہو رہا تھا جس کے خوف سے ہم دونوں یہاں چھپنے آئے تھے۔ آگ اور خون کا تماشہ' ہنستے کھیلتے خاندانوں کو اجاڑنے کے منظر' ہر سمت موت کا رقص جاری تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس قسم کی موت کو ترجیح دی جائے باہر نکل کر خونی بھیڑیوں سے اپنے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کروا لیں یا اس عفریت کے ہاتھوں موت کو گلے لگا لیں۔ یہی سوچ رہا تھا کہ

باہر خونی بھیڑیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے اور میری بیوی سہم گئی اور اس نے سرگوشی کی۔ "لگتا ہے وہ لوگ ادھر ہی آ رہے ہیں۔"

"آں۔" میں نے چونک کر کہا۔

"وہ ادھر ہی آ رہے ہیں۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔

"اللہ اللہ کرو۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔" کہتے ہوئے میں نے بھی آیت الکرسی کا ورد کرنا چاہا لیکن ذہن پر زور دینے کے بعد بھی یاد نہیں آیا۔ یاد تو تب آتا ہے جب برابر پڑھی جائے۔ میرا شمار تو ان بدبختوں میں ہوتا ہے جو صرف مسلمان گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے مسلمان ہو جاتے ہیں۔ میں نے تو عید کے علاوہ کبھی نماز نہیں پڑھی۔ یہی حالت میری بیوی کی ہے۔ اس بے چاری کو تو وحید مراد کی فلمیں دیکھنے اور احمد رشدی کے گانوں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ پھر عبادت کے لیے وقت کہاں سے لاتی۔

نعروں کی آواز دوبارہ ابھری تو وہ سہم کر میرے جسم میں پیوست سی ہو گئی' باہر کے خوف نے اندر کے منظر کو بھلا دیا تھا۔ میں نے چونک کر کرسی کی جانب نظر ڈالی وہ خالی پڑی تھی۔ بیڈ کی طرف دیکھا وہ بھی خالی تھا۔ لاش غائب ہو گئی تھی' اسے نظروں سے اوجھل دیکھ کر ہم دونوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ بمشکل تمام آدھا گھنٹہ گزرا تھا کہ بچہ کلبلانے لگا۔ اتنی دیر سے وہ اپنی ماں کی گود میں سہما سہما بے خبر تھا شاید اسے بھی حالات کی مار نے دہلا دیا تھا ذرا سا سکون پاتے ہی وہ بے چین ہو گیا تھا۔ اسے بے چین دیکھ کر میں نے کہا۔ "پروین' اسے دودھ پلاؤ کہیں یہ چیخنے نہ لگے۔"

حالات کی نزاکت نے اسے میرا حکم ماننے پر مجبور کر دیا۔ ساڑی کے آنچل سے اھک کر وہ اسے دودھ پلانے لگی۔ ہم دونوں بات چیت بھی نہیں کر رہے تھے کہ آواز باہر نہ چلی جائے کیونکہ باہر سے رہ رہ کر نعروں کی آواز آ رہی تھی۔ اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر وہ خونی بھیڑیئے اپنے ہی کلمہ گو بھائیوں کو ذبح کر رہے تھے۔ اگر ہم لوگ بروقت اپنے گھر سے نہ نکلتے تو ہمارا بھی حشر ان جیسا ہوتا جو نرغے میں پھنس گئے تھے۔

حالات کی نزاکت کا احساس مجھے کئی دن پہلے ہی ہو گیا تھا۔ میرے ایک بنگالی دوست نے آ کر بتا دیا تھا کہ ان کے علاقے میں میٹنگ ہو رہی ہے' ایک دو دن کے اندر اردو بولنے والے گھروں کو لوٹا جائے گا۔ سب کو قتل کیا جائے گا۔ سب کچھ سننے کے بعد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ڈھاکا جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سڑکوں پر رکا
کھڑی کر دی گئی تھی اور پیدل اتنی دور جا نہیں سکتے تھے۔ مجبوری میں ہم سب ا
چھوٹے سے محلے میں محصور ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ عام دنوں میں نارائن گنج اور ڈھاکا
ہی شہر کے دو حصے مانے جاتے تھے لیکن عوامی لیگ کی عدم تعاون کی تحریک شروع ہو
ہی نارائن گنج شہر سے کٹ گیا تھا۔ اردو بولنے والے محصور ہو گئے تھے۔ مجبور و محصور
پر پہلے عرصہ حیات تنگ کیا گیا اور پھر زندگیاں چھینی جانے لگیں۔ وہ تو خدا کو بچانا تھا جو
دونوں محلے سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور اس کھنڈر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے
کھنڈر میں داخل ہوتے ہی اس عفریت سے سامنا ہو گیا جو خدا معلوم کہاں غائب ہو
تھا۔

اس کے فرار سے ہم دونوں بے خوف ہو گئے تھے اور انتظار کر رہے تھے کہ بلو
چلے جائیں تو باہر نکلیں لیکن حالات پر سکون ہونے کا انتظار تھا۔ آہستہ آہستہ فضا پر سکو
ہو گئی۔ نعرۂ تکبیر کی آواز تھم گئی۔ شاید بلوائی واپس چلے گئے حالات کا جائزہ لینے کے
جیسے ہی میں نے باہر دیکھا میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میرے محلے کے گھروں سے شعلے
رہے تھے۔ بلوائیوں نے جاتے جاتے گھروں میں آگ لگا دی تھی۔ ان گھروں میں
ایک گھر میرا بھی تھا۔ تنکا تنکا چن کر میں نے آشیانہ سجایا تھا جسے نفرت کی آندھی نگل
تھی۔ میرا دل رو پڑا تھا لیکن جیسے ہی مڑا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ سر کٹی لاش پھر
آنے لگی تھی۔ شاید تکبیر کی آواز نے بھگا دیا تھا۔ آواز معدوم ہوتے ہی نمودار ہو
تھی اور پیر پر پیر چڑھائے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں بھاگ کر بیوی کے پاس پہنچ
تھا۔ پروین نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور شاید خوف نے اس کے ہاتھوں میں طاقت بھر
تھی تبھی تو اس نے بچے کو کس کر سینے سے چمٹا لیا تھا۔ دباؤ کی وجہ سے بچہ چیخنے لگا تھا
سنسان کھنڈر میں بچے کی آواز خوفناک سی محسوس ہو رہی تھی۔ کانوں کے پر
پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے لیکن ہم دونوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا کہ بچے کو
کرائے۔ بچے کے چیخنے کی آواز کے درمیان ایک اور آواز ابھری۔ وہ آواز تھی لاش
چلنے کی۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی اور ایک ایک قدم اٹھاتی ہم دونوں کی طر
بڑھ رہی تھی۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ بالکل ایسے جیسے

عورت کسی بچے کو گود میں لینے کے لیے مانگتی ہے۔ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر میں نے اچھل کر دونوں لاتیں اس کے سینے پر ماریں۔ میری ضرب کافی زوردار تھی لیکن وہ جھیل گئی اس کے سینے سے ٹکراتے ہی میں چاروں شانے چت گرا تھا لیکن فوراً پھرتی سے اٹھ گیا تھا۔ اٹھتے ہی میں نے پھر لات گھما دی۔

دوسری لات کھاتے ہی لاش میری جانب مڑ گئی۔ اس نے میرے گلے کو پکڑا اور جس طرح مردہ چوہے کی دم پکڑ کر دور پھینکا جاتا ہے' اسی طرح اس نے مجھے دور اچھال دیا۔ پتہ نہیں اس نے مجھے کتنی طاقت سے پھینکا تھا۔ کافی دیر تک میں نے اپنے آپ کو ہوا میں اڑتے ہوئے پایا۔ کسی توپ کے گولے کی طرح میرا جسم آگے ہی آگے اڑتا جا رہا تھا۔ کافی دور جا کر میں گرا تھا۔ اتنی دور کہ وہاں سے مجھے کھنڈر نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالکل نئی جگہ تھی وہ۔ میں نے ذہن پر کافی زور دیا لیکن مجھے یاد نہیں آیا کہ وہ کون سی جگہ ہے۔ نارائن گنج کا چپہ چپہ میرا دیکھا بھالا تھا لیکن ایسا سنسان علاقہ آس پاس نہیں تھا۔ ڈھاکا اور نرائن گنج کے درمیان پگلا کا علاقہ غیر آباد تھا لیکن وہاں بھی فلم اسٹوڈیو کی عمارت تھی لیکن اس جگہ تو عمارت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ دور دور تک چٹیل میدان کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ایک بڑا سا میدان "چاشہرا" میں تھا۔ چاند ماری کا میدان لیکن وہ بھی ایسا لق و دق نہیں تھا۔ یہ تو بالکل نیا علاقہ تھا۔ ایسا علاقہ جہاں سے میرا گزر ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ کس طرف جاؤں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر کار میں نے اپنے سامنے کی سمت چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ کافی دیر تک چلتا رہا۔ ٹانگیں دکھنے لگیں لیکن میدان کا سرا نظر نہیں آیا اور میں تھک کر بیٹھ گیا۔

مایوسی نے میرے وجود کو گھیر لیا تھا۔ دل پھوٹ پھوٹ کر رونے پر اکسا رہا تھا۔ بچے اور بیوی کی یاد آ رہی تھی۔ پتہ نہیں وہ زندہ ہیں بھی یا نہیں یہ سوچ کر کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روتے روتے جب آنسوؤں کے سوتے سوکھ گئے تو میں پھر نئے عزم سے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دور ہی چلا ہوں گا کہ مجھے دور ایک عمارت کا احساس ہوا اندھیری رات میں یہ ٹھکانہ غنیمت محسوس ہوا اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ فاصلے گھٹنے لگے اور عمارت نزدیک آنے لگی۔ نزدیک پہنچتے ہی میں نے اس مقام کو پہچان لیا۔ وہی کھنڈر تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھنڈر کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ ہر روز کھنڈر کو دیکھا کرتا تھا لیکن آس پاس کبھی میدان نظر نہ آیا تھا۔ میدان نظر آتا بھی تو کیسے؟ ندی اور بورائی جھیل کے درمیان ایک چھوٹی سی خشک پٹی تھی جہاں راجہ کا محل تھا۔ راجہ کو جادو کا شوق تھا اور یہی شوق اسے لے ڈوبا تھا۔ رعایا بھڑک اٹھی تھی اور اس نے محل کو آگ لگا دی تھی اور راجہ کو قتل کر دیا تھا۔ ضعیف الاعتقاد لوگوں میں مشہور تھا کہ کھنڈر میں آج بھی راجہ کی روح بھٹکتی ہے اسی لئے کوئی بھی ادھر نہیں جاتا تھا۔

بلوائیوں نے جب محلے پر حملہ کیا تو اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر میں بیوی کے ساتھ کشتی پر سوار ہو کر اسی خشک پٹی کی جانب بھاگا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو کھنڈر کی طرف آنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ بنگالی کچھ زیادہ ہی ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں' اسی خیال نے تقویت دی تھی۔ لیکن ادھر آ کر وہ حساب ہوا کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ اگر بیوی اور بچہ اندر پھنسے نہ ہوتے تو میں کسی حالت میں دوبارہ جانے کی ہمت نہ کرتا لیکن بچے کی محبت کشاں کشاں کھینچے لئے جا رہی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر قدم رکھا۔ پہلا کمرہ خالی تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں مجھے وہ عفریت نظر آیا تھا لیکن وہ کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ بیوی اور بچے نظر نہیں آ رہے تھے۔ کرسی اور بیڈ بھی غائب تھا۔ دوسرے کمرے میں جھانکا وہ بھی خالی تھا۔ ٹوٹی ہوئی چھت سے تاروں کی ملیالی روشنی میں دونوں کمروں کا جائزہ لے کر پچھلے برآمدے میں پہنچا۔ برآمدہ بھی سنسان پڑا تھا۔ شاید نیچے تہہ خانہ ہے یہ سوچ کر میں نیچے اترنے لگا۔ دو تین سیڑھیاں طے کرتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ سیڑھیوں پر دھندلی دھندلی سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سیڑھیوں سے متصل دیوار میں طاق بنے ہوئے تھے اور ان میں انسانی کھوپڑیاں رکھی تھیں۔ جن میں چربی جیسی کوئی شے بھری تھی اور وہ دیئے کی طرح جل رہی تھیں۔ یہ دھندلی روشنی انہی سے پھوٹ رہی تھی۔ دل کو کڑا کر کے میں پھر نیچے اترنے لگا۔ مردوں کے کفن پر چھڑکے جانے والے کافور کی بو ہر جانب پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس بو میں لوبان کی بو بھی شامل ہو گئی۔

سیڑھیاں اترنے کے بعد ایک بڑا سا دالان آ گیا۔ پتہ نہیں کیوں نیچے اترتے ہی مجھے اپنے جسم میں ایک ٹھنڈی سی لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں اس دالان سے گزر کر

ایک وسیع کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے کے درمیان ایک بیڈ بچھا تھا اور اس پر وہی عفریت محوخواب تھا۔ میں پھرتی سے واپس مڑا اور باہر نکل کر دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔ برابر میں ہی ایک اور کمرہ تھا۔ میں اس جانب بڑھا۔ اس کمرے میں جھانکتے ہی میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کمرے کے فرش پر آڑی ترچھی حالت میں پروین پڑی تھی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ایسی حالت میں پڑی تھی کہ میری نگاہیں آپ ہی آپ جھک گئیں۔ اس کے جسم پر کپڑے کی ایک دھجی تک نہیں تھی۔ اس کے کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے زبردستی نوچ کر پھینکے ہوں۔ پتہ نہیں وہ زندہ ہے بھی یا نہیں' یہ سوچ کر میں آگے بڑھا۔ نزدیک پہنچتے ہی میری جان میں جان آئی۔ سانس کا رشتہ قائم ہے اور جب زندگی کی رمق نظر آئی تو میں نے ساڑی اٹھا کر اس کے جسم پر ڈال دی اور پھر بچے کی جانب لپکا۔ وہ بھی ایک جانب بے ہوش پڑا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کے لیے میں نے گود میں اٹھایا۔ کئی بار ہلایا لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اسے گود میں اٹھائے میں پانی کی تلاش میں باہر نکلا۔ دالان میں پہنچتے ہی میری نظر ایک خوبرو نوجوان پر پڑی۔ وہ میری ہی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”وہ عورت آپ ہی کے ساتھ ہے؟“

”جی ہاں لیکن آپ کون ہیں؟“

”میں نے ہی اسے بچایا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ میرے کچھ اور قریب آ گیا پھر بولا۔ ”کیا بچے کو ہوش نہیں آیا؟“

”جی نہیں۔“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”فکر نہ کریں آ جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس سنسان کھنڈر کے ہیبت ناک ماحول میں تہہ خانے کے اندر ایک انسانی شکل مجھے امداد غیبی نظر آئی اور میں بھی اس کے پاس بیٹھ گیا پھر پوچھا۔ ”کیا یہاں پانی نہیں ملے گا؟“

”آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ بچے کو ہوش آ جائے گا۔“

”آپ تہہ خانے میں کیسے چلے آئے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ نہ پوچھیں۔“ اس نے ٹالنے کی کوشش کی اور پھر بولا۔ ”آپ کیسے آ گئے؟“

”اپنی جان بچانے کے لیے۔“ میں نے جواب دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اور یہاں راجہ نیل منی کے راج محل میں پھنس گئے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہی کھنڈر راجہ نیل منی کا ہے۔"

"جی ہاں برسوں پہلے یہاں ایک عظیم الشان محل تھا۔" اس نے کہا۔

"لگتا ہے' آپ پوری تاریخ جانتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں راجہ نیل منی کا راج بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اٹھائیس پرگنہ پر اس کی حکومت تھی۔ اس کے پاس طاقت تھی' دولت تھی' وجاہت تھی پھر بھی ہوس باقی تھی۔ وہ عمر دوام حاصل کرنا چاہتا تھا۔ شاید تم نے کہیں پڑھا ہوگا۔ عمر دوام حاصل کرنے میں ماہر فلکیات ابن حیان' مشہور کیمیادان چنگ ہو جانے مانے شاستر گیا تھا گیانیو شور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کیونکہ انہوں نے صرف ایک راستہ اختیار کیا تھا جبکہ عمر دوام کے لیے بیک وقت دو راستوں کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔ کیمیا کے ذریعے جسم کی قوت کو برقرار رکھنا ہوتا ہے اور یوگ کے ذریعہ روح کو۔ تم نے سنا ہوگا ہمالیہ کی ترائی میں پچاسوں سادھو سنت یوگ کے ذریعہ زندگی کی ڈور کو برقرار رکھے بیٹھے ہیں۔ کیسے؟ صرف "پران آئم" کے بل پر۔ سانس روک کر پران آئم تو کیا جا سکتا ہے۔ جسم پر تو قابو پایا جا سکتا ہے لیکن ادھورا جبکہ راجہ نیل منی نے پورا علم حاصل کر لیا تھا۔ جانتے ہو کیسے؟"

میں اس کے فن داستان گوئی میں کھو چکا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں نیل منی کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوں۔ میری نظروں کے سامنے حد نظر برفیلی پہاڑیاں پھیلی تھیں۔ دائیں اور بائیں جانب دور دور تک برف کے تودے بکھرے ہوئے کسی وسیع برفیلے سمندر کی مانند نظر آ رہے تھے اور جب میں نے نگاہیں اٹھائیں تو کوئی دو تین سو گز کے فاصلے پر ایک پہاڑی سلسلہ نظر آیا جو میلوں تک دائیں بائیں پھیلا ہوا تھا۔ اسی وقت میری نظریں آسمان کی طرف اٹھیں جو شفق رنگ ہو رہا تھا۔ شاید شام ہو رہی تھی۔ البتہ مجھے سورج غروب ہوتا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پوری فضا پر ایک دھند سی طاری ہو چلی تھی۔ ایک خواب ناک ماحول نے فضا میں جادو جگا رکھا تھا۔

کسی انجانے خیال کے تحت میرے قدم آپ ہی آپ اس پہاڑی کی سمت اٹھنے لگے جو کوئی دو تین سو گز کے فاصلے پر سر اٹھائے کھڑی تھی۔

میرے قدم سے قدم ملا کر نیل منی چل رہا تھا یا پھر میں اس کا سایہ بن کر آگے ہ رہا تھا۔ وہ رکے بغیر آگے بڑھتا رہا اور پہاڑی سلسلہ اس کے قدموں کو چومنے لگا تھا۔ ہاڑیوں پر برف ہی برف پھیلی تھی یا پھر برف کے تودے جم کر پہاڑ بن گئے تھے۔ اس پہاڑ ں ایک غار نظر آ رہا تھا۔ اس غار کے اندر چربی کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ نیل منی یر جھجکے اندر داخل ہو گیا۔ غار کے اندر ایک تنگ دھڑنگ سادھو بیٹھا تپسیا میں کھویا ہوا ا۔ اس کی عبادت میں خلل نہ پڑے اس خیال سے نیل منی ایک کونے میں خاموشی سے ٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں سادھو کا احاطہ کئے تھیں۔ سادھو کی داڑھی زمین کو چھو رہی تھی۔ نہیں کتنے برسوں کا جھاڑ جھنکار تھا وہ۔ اس طرح اس کے سر کی جٹائیں بھی کافی لمبی ھیں۔ بال چپٹ چپٹ کر جٹا بن گئے تھے' موٹی چٹیا جیسے۔ لیکن چہرے کی شادابی میں کمی نہیں آئی تھی۔ وہ کسی نوجوان سے کم نہیں تھا۔ اس عجیب الصورت بوڑھے کے سامنے مسمی صورت بنائے بیٹھا تھا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ جب گھڑی کی ٹک ٹک سنائی نہ ے تو دل کی دھک دھک وقت گزرنے کی آوازیں سناتی ہیں۔ وقت کسی کے روکے نہیں رکتا اور شام نے رات کا چولہ پہن لیا تو سادھو نے آنکھیں کھول دیں اور اسے سامنے بیٹھے دیکھ کر حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ "تم کون ہو بالک؟"

"آپ انتریامی ہیں۔ آپ سے کیا پردہ۔ میں حیات دائمی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"بیکار ہے بالک تو تھک جائے گا جیسے میں تھک گیا ہوں۔ انسان ازل سے تبدیلی کا خواہاں ہے یکسانیت اسے اکتا دیتی ہے تو لوٹ جا۔ جتنی عمر ہے اس پر قناعت کر۔ زیادہ کی امید مت کر ورنہ پچھتائے گا۔"

"نہیں گرو جی میں نہیں پچھتاؤں گا۔" نیل منی نے کہا۔

"یہ تیرا وہم ہے۔ میں بھی یہی سمجھتا تھا لیکن پندرہ سو سال گزار کر پچھتا رہا ہوں۔ میں نے بھی ہٹ دھرمی کی تھی۔ ضد کی تھی اور اپنے گرو سے اپنے استاد سے زبردستی عمر دوام کا راز سیکھا تھا۔ اس نے بھی مجھے منع کیا تھا لیکن میں تو ہٹ کا پکا تھا۔ راز جان کر ہی دم لیا۔ گرو نے جھنجلا کر راز بتانے کے ساتھ شراپ بھی دے دیا۔ بددعا دیتے ہوئے اس نے کہا تھا اگر تو نے ہمالیہ کی ترائی سے باہر قدم رکھا تو باقی زندگی اذیت میں گزارے گا۔ اسی لئے میں یہاں سے نیچے نہیں اتر سکتا۔ اب مرنے کی تمنا جاگی ہے تو موت کو گلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگانے کا راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔ میں تجھے عمردوام کا راز بتا سکتا ہوں لیکن میری شرط ہے۔"

"کون سی شرط؟" نیل منی نے پوچھا۔

"مجھے موت لا کر دینی ہوگی۔"

"موت؟ میں موت کہاں سے لاؤں؟" نیل منی نے جواب میں کہا۔

"مرد کی موت کا نام ہے عورت۔ مجھے کہیں سے بھی ایک عورت لا دے۔ تجھے عمردوام کا راز بتادوں گا۔ تیری عمر طویل تر ہو جائے گی۔"

"جو آگیا مہاراج۔" کہتے ہوئے راجہ نیل منی باہر نکل آیا۔ اس کے قدم پہاڑ نیچے کی طرف بڑھنے لگے۔ چاند نکلا پھر ڈوبا اور پھر سورج نکل آیا لیکن وہ رکا نہیں چلتا چلتے چلتے دوپہر بھی گزر گئی اور پھر شام کا سایہ اتر آیا۔ شام کی مٹیالی روشنی میں دور بستی سے اٹھتا ہوا دھواں آبادی کا پتہ دے رہا تھا۔ اس کے قدم اسی جانب اٹھنے لگے بستی میں پہنچ گیا بستی کے سب سے بڑے گھر کے سامنے وہ جا کر کھڑا ہو گیا۔

"کون ہو بھئی؟" دروازہ کھول کر باہر آنے والے نے پوچھا۔

"ایک مسافر۔ رات گزارنے کے لیے جگہ چاہیے۔" نیل منی نے کہا۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"شہر سے۔"

"جانا کہاں ہے؟"

"گنگوتری۔"

"او' یاتری ہو۔ گنگوتری درشن کے لیے جاؤ گے لیکن گنگوتری کا راستہ تو کئی ادھر سے جاتا ہے۔"

"راستہ بھٹک گیا ہوں۔"

"اندر آجاؤ۔" کہتے ہوئے وہ دروازے سے ہٹ گیا۔

نیل منی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "میں یاتری ہوں' پن کمانے نکلا اور ایک زائر اپنے ثواب میں کسی کو حصے دار نہیں بناتا۔ آپ کو قیام و طعام کی ر ہوگی۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" صاحب خانہ شری کانت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نیک کام میں دیر نہیں۔" کہتے ہوئے نیل منی نے کمر سے بندھا توڑا کھولا اور سونے کے چمکتے ہوئے سکے نکال کر اسے تھما دیئے۔ اتنی ساری اشرفیاں دیکھ کر شری کانت کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

بالکل ویسی ہی لپلپاتی چمک نیل منی کی آنکھوں میں بھی لہرائی لیکن وہ چمک سونے کے سکوں کی نہیں تھی۔ سونے جیسے بدن کی تھی۔ اس سیم تن کے بدن کی آب نیل منی کی آنکھوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی۔ جبکہ شگفتہ کلی کی مسکراہٹ گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں پر سجائے وہ فتنہ ساماں نیل منی کو خوش آمدید کہتی نگاہوں سے جائزہ لے رہی تھی۔ شری کانت نے دوشیزہ کی نگاہوں میں چھپے سوال کو پڑھ لیا اور تعارف کراتے ہوئے بولا۔ "بیٹی یہ گنگوتری کے یاتری ہیں۔" اور پھر نیل منی کی طرف مڑ کر بولا۔

"اور یہ میری بیٹی مینکا ہے۔"

"واقعی یہ مینکا ہے۔" نیل منی کے دماغ میں سرگوشی گونجی۔ "راجہ اندر کے دربار کی رقاصہ مینکا بھی اسی جیسی ہوگی تبھی تو اس نے وشومتر جیسے مہان سادھو کی تپسیا کو چور چور کر دیا تھا۔ اپنے حسن کے جال میں پھانس لیا تھا۔ کہیں میری ریاضت خاک میں نہ مل جائے۔"

"نہیں میں اس کے جال میں نہیں پھنسوں گا۔" اس نے دل ہی دل میں عہد کیا۔

انسان بڑے اعتماد کے ساتھ عہد کر لیتا ہے لیکن جذبات کی طغیانی اس کے عہد کو بہا لے جاتی ہے۔ صرف ایک ہفتے میں اسے بھی جذبات کی طغیانی نے اپنے گرداب میں کھینچ لیا اور اس نے شری کانت کے سامنے دامن پھیلا دیا کہ مینکا کو اسے دے دیا جائے۔ اس کی مانگ سن کر شری کانت نے کہا "لیکن ہم اس قابل کہاں ہیں۔ آپ ٹھہرے دھن دان' دولت والے' اور ہم غربت کی گود میں پلنے والے' ہمارا آپ کا کیا مقابلہ؟"

"کوئلے کی کوکھ میں جنم لینے والا ہیرا اپنی قدر و قیمت سے ناآشنا ہوتا ہے۔ میں آپ کے صحیح مقام سے آشنا ہوں۔ آپ صرف ہاں کہہ دیں۔"

"میں راضی' میرا بھگوان راضی۔" شری کانت نے خوش ہو کر کہا۔ شری کانت کے راضی ہوتے ہی ڈھولک کی تھاپ سے گھر گونج اٹھا۔ پنڈت نے رسوم ادا کیں اور مینکا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیل منی کی ہو گئی۔

سہیلیوں نے کمرۂ عروسی کو پھولوں سے سجایا تھا۔ رنگ برنگے پھولوں کے درمیان شباب کے گلدستے کو بٹھا کر وہ سب نیل منی کو کھینچتی ہوئی لے آئیں اور کمرے میں دھکیل کر دروازہ بند کر دیا۔ خوشبوؤں سے بسے کمرے میں سب سے تیز خوشبو ابٹن لگے کنوارے بدن کی تھی۔ مینکا کے مساموں سے پھوٹتی مہک نیل منی کو پاگل بنائے دے رہی تھیں۔ وہ سحرزدہ سا پھولوں کی سیج کی طرف بڑھ رہا تھا اور مینکا کی سہیلیاں دروازے سے کان لگائے پہلی رات کی پہلی باتیں سننے کو بے چین تھیں کہ اندر سے ایک تیز چیخ دروازے کو پار کرتی ہوئی سب کو بے چین کر گئی۔ سہیلیاں پہلے گھبرائیں اور پھر مسکرا اٹھیں لیکن چیخوں کا تسلسل نہیں ٹوٹا۔ اندر سے مینکا کی ہذیانی چیخیں ابھرتی رہیں۔ پاگلوں جیسی چیخوں نے مہمان خواتین کو کمرے کی جانب کھینچ لیا تھا۔ ہر چہرے پر تجسس تھا لیکن کمرۂ عروسی پر دستک دیتے ہوئے حجاب مانع تھا۔ عورتیں چاہتے ہوئے بھی مینکا کو آواز دینے سے گریز کر رہی تھیں۔ وہ حیران بھی تھیں اور پریشان بھی۔ سہاگ رات سب نے منائی تھی لیکن کسی نے اس طرح چیخیں نہیں ماری تھیں۔ وہ سب اسی بے ہودگی پر سرگوشی میں بحث کر رہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور مینکا باہر آ گری۔ اس کے منہ سے کف جاری تھا اور ساڑی کا آنچل ڈھلکا ہوا تھا۔ کھلے ہوئے کمرے میں کئی متجسس آنکھوں نے جھانکا اور اندر کی طرف دوڑ پڑیں۔ کمرے کے درمیان نیل منی بے ہوش پڑا تھا۔ کچھ عورتیں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگیں اور کچھ عورتیں مینکا کو۔ ان کی کوشش بار آور ثابت ہوئی اور مینکا نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہوا تھا' کیوں چیخی تھیں؟" کئی عورتوں نے ایک ساتھ سوال کیا۔

"وہ اندر' دو ہاتھ" مینکا نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "دو ہاتھ؟ کس کے ہاتھ؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟" کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

"وہ جب میرا گھونگھٹ اٹھانے لگے تو دو ہاتھ کھڑکی سے نمودار ہوئے۔ ہاں وہ کھڑکی سے ہی آئے ہوں گے اور تو کوئی راستہ تھا نہیں۔ ہے بھگوان وہ ہاتھ اف میں کیسے بتاؤں۔ وہ ہاتھ نہیں استخوانی شکنجہ تھا۔ ان جیسے شکتی شالی' طاقتور جوان کو اٹھا کر ہوا میں بلند کیا اور پھر دور اُچھال دیا۔ وہ پھر میری طرف بڑھے تھے کہ اس ہاتھ نے ان کے گلے کو

پکڑ کر دبانا شروع کر دیا۔ وہ چیخ بھی نہ سکے اور مری ہوئی چھپکلی کی طرح پٹ سے گر گئے۔" پھر اس نے چونک کر عورتوں سے پوچھا۔ "ان کی حالت کیسی ہے؟"

"صرف بے ہوش ہیں۔" ایک عورت نے جواب دیا۔ عورتوں سے ہوتی ہوئی یہ خبر مردوں تک پہنچ گئی تھی۔ شری کانت کے ساتھ کئی آدمی اندر آ گئے۔ انہوں نے نیل منی کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ کچھ دیر کی کوشش سے اسے ہوش آ گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"بیٹے تمہیں کیا ہو گیا تھا؟" شری کانت نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ میں یاتری ہوں نا۔ گنگا مائی کے درشن کو نکلا تھا اور راستے میں ہی رک گیا اس لیے گنگا میا نے سزا دی ہے۔ میں صبح ہوتے ہی یاترا پر نکل پڑوں گا۔" نیل منی نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"ہاں چلے جانا۔ اب جا کر آرام کرو۔ جاؤ بھئی تم بھی آرام کرو۔"

"نہیں میں الگ کمرے میں سونے جاؤں گا۔ جب تک گنگوتری درشن کا فرض ادا نہیں ہو جاتا مینکا میرے لیے پرائی استری (عورت) ہے۔" نیل منی نے کہا۔

وہ رات اس نے الگ کمرے میں گزاری اور صبح ہوتے ہی گنگا کی زیارت کے لیے نکل پڑا۔ مینکا کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ دونوں برف پوش پہاڑوں کی طرف بڑھ رہے تھے' شری کانت نے خچر دینے کی پیشکش کی تھی تاکہ سفر میں آسانی ہو لیکن نیل منی نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا تھا "پیدل جانے میں زیادہ ثواب ہے۔" ثواب کمانے کے لیے مینکا بھی دشوار گزار پہاڑوں کو عبور کرتی جا رہی تھی لیکن اس کی رفتار بہت زیادہ سست تھی۔ وہ چیونٹی کی رفتار سے چل رہی تھی اور نیل منی ہرن کی۔ دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ فاصلے کو گھٹانے کے لیے نیل منی نے پکار کر کہا۔ "قدم تیز کرو۔" اس کا چیخ کر کہنا غضب ہو گیا۔ پوری گھاٹی میں بھونچال آ گیا۔ زلزلہ سا محسوس ہونے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سینکڑوں آدمی مل کر چیخ رہے ہوں۔ بازگشت کی بازگشت نے وادی کے سکون کو درہم برہم کر دیا تھا۔ پہاڑ سے ٹکرا ٹکرا کر آتی ہوئی کان پھاڑ دینے والی آوازوں کے ساتھ ایک گرجتی آواز بھی شامل ہو گئی۔ توپ داغنے جیسی آواز۔ اس آواز کو سنتے ہی مینکا نے چیخ کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بھاگئے۔ سامنے والے غار میں گھس جایئے۔" پھر اس نے بھی اسی جانب
دی۔ غار تک پہنچتے پہنچتے وہ ہانپ گئی تھی۔ اس پر برف کی کنکریاں برسنے لگی تھیں
ننھی سوئیوں کی طرح اس کے جسم کے کھلے حصوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی
وہ ان سے بچنے کے لیے گرتی' سنبھلتی غار تک پہنچنے کے لیے دوڑنے لگی تھی لیکن
تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کی پیٹھ سے ایک بڑا سا برفیلا گولہ ٹکرایا اور وہ منہ کے
پڑی۔ اسے گرتے دیکھ کر نیل منی دوڑتا ہوا باہر نکلا اور اسے اٹھا کر اندر کی طرف
پڑا۔ غار میں پہنچ کر اسے زمین پر لٹا کر اس کی ہتھیلی پر اپنی ہتھیلی رکھ کر رگڑنے
جسم کی حرارت بحال ہو سکے۔ پائمال ہوتی زندگی کو بچا سکے۔

موت کی بانہوں سے کھینچ کر لائی گئی زندگی کو بچانے کے لیے وہ سرتوڑ کو
رہا تھا اور باہر موت کی بارش ہو رہی تھی۔ تودوں کی شکل میں موت برس رہی تھی

موت کے جبڑے سے چھین کر لائی گئی زندگی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر
مینکا نے پٹ پٹا کر آنکھیں کھول دیں اور بکھرے حواس کو یکجا کرتے ہوئے نقاہت
آواز میں بولی۔ "بھگوان کی کرپا تھی کہ آپ نے وہ غلطی غار کے نزدیک پہنچ کر
یہی غلطی دس بیس قدم پیچھے کرتے تو ہمارا بچنا مشکل تھا۔"

"آں' میں نے کون سی غلطی کی؟" نیل منی نے پوچھا۔

"کیا آپ نہیں جانتے کہ پہاڑوں میں بازگشت پیدا ہوتی ہے اور بازگشت
ارتعاش جنم لیتا ہے اور ارتعاش برف کے تودوں کو گرانے لگتا ہے؟"

"نہیں۔" کہتے ہوئے اس نے مینکا کے چہرے پر نظر ڈالی۔ برفیلی ہوا نے
قیامت خیز بنا دیا تھا۔ رخساروں کی سرخی بڑھ گئی تھی جو اسے پکار پکار کر دعوت
تھی۔ نیل منی کی رگوں میں لاوا سا بہنے لگا تھا۔ دنیا اسے ہیچ نظر آنے لگی تھی۔ اس
انجان منزل کی طرف بڑھنے کے لیے پر تولتے ہوئے بانہیں پھیلا دیں۔ وقت
عورت اپنی خواہش کو تیاگ کر مرد کے سامنے سر جھکا دیتی ہے۔ مینکا نے
احساسات کا گلا گھونٹ کر اپنے پورے وجود کو نیل منی کی بانہوں میں سمو دیا
تڑپتے ہونٹ منزل کی طرف بڑھے تھے کہ وہ جھٹکے سے الگ ہو گیا۔ ایسے
اسے پیچھے دھکیل دیا ہو۔ پیچھے دھکیلنے میں کسی غیر مرئی طاقت کا ہاتھ نہیں تھا

رات کی طرح ہوا سے اڑتا ہوا نادیدہ ہاتھ آیا تھا بلکہ اس کی قوت سماعت نے اسے پرے
اچھل دیا تھا۔ اس نے چونک کر کہا۔ "یہاں اور بھی کوئی ہے؟"

"یہاں کون آئے گا؟"

"غور سے سنو۔ کسی کے سانسوں کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔"

"لگتا ہے اس اندھیرے حصے میں کوئی درندہ چھپا بیٹھا ہے۔" نیل منی نے کہا۔

"اس علاقے میں تو برفانی ریچھ بھی نہیں ہوتے۔"

"ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔" کہتے ہوئے نیل منی نے ایک بڑا سا برف کا گولا اندر کی
طرف اچھالا اور پھر جب نتیجہ سامنے آیا تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اندھیرے سے ایک عجیب
ہیئت جانور باہر آ رہا تھا۔ اس کا دھڑ چوپائے جانور جیسا تھا اور اوپر کسی حسین عورت
کا۔ وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ
رہی تھی۔ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر مینکا بھی بانہیں پھیلا کر آگے بڑھی۔ مینکا کو بڑھتے دیکھ
کر وہ انسان نما جانور رک گیا۔ اس نے تیز نگاہوں سے مینکا کو دیکھا اور پھر دو قدم بڑھا۔
مینکا بھی دو قدم بڑھی۔ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر نیل منی نے کہا۔ "مینکا یہ کیا کر رہی ہو؟
رکو' باہر بھاگو۔"

"باہر موت ہے صرف موت۔ برف کے تودوں میں چھپی موت اور اندر...... اندر
ممتا کی دیوی ہے۔ ڈرو نہیں' یہ مم ہے۔"

"مم...... یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں' تم نے اس کے بارے میں سنا نہیں؟ یہ قسمت والوں کو ہی نظر آتی ہے اب
اس کی نسل بھی ناپید ہو رہی ہے۔ یہ انسانوں کی سب سے بڑی دوست ہے۔ برف کے
طوفان میں پھنس جانے والے مسافروں کی مددگار۔ یہ بھگوان کا انوکھا چمتکار ہے' معجزہ
ہے۔ اسے پرنام کرو۔" اور نیل منی نے سلام کرنے کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ مم
نے نزدیک پہنچ کر انہیں بغور دیکھا اور پھر ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اپنا جسم ان
سے لگا کر بیٹھی تھی گویا محبت کا اظہار کر رہی ہو۔ نیل منی نے ڈرتے ڈرتے اس کے جسم
پر ہاتھ پھیرا۔ اسی وقت باہر سے چنگھاڑ سنائی دی۔ ایسی تیز چیخ ابھری تھی جس نے پہاڑ
کو بھی دہلا دیا تھا اور مم چونک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مینکا بھی چونک گئی تھی۔ خوف سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ بڑے بڑے تودوں کے گرنے کی گڑگڑاہٹ کے درمیان وہ بہت پراسرار لگی تھی جیسے موت نے اپنے آنے کا اعلان کیا ہو۔

"یہ...... یہ آواز کیسی تھی؟" نیل منی نے پوچھا۔

"یہ آواز "یتی" کی ہے۔ برفیلے آدمی کی۔ وہ برفیلے تودوں کی بارش میں گو ہے۔" مینکا نے جواب دیا۔

"بھگوان کرے اسے یہ غار نظر آ جائے۔" نیل منی نے کہا۔

"بھگوان نہ کرے۔" مینکا نے کہا۔ "اگر وہ ادھر آ گیا تو ہم دونوں اور مم کا بچنا ہے۔ پورا دیو ہوتا ہے دیو۔ ہم جیسے لوگ اس کے سامنے کیڑے مکوڑے ہیں اور مم کی دشمن۔ جس علاقے میں مم رہے گی وہاں یہ نہیں آتا لگتا ہے یہ کہیں سے بھٹک گیا ہے۔" مم اس طرح باری باری ان کے چہرے دیکھ رہی تھی گویا وہ ان کی باتیں رہی ہو۔

"دیکھو تو، یہ کیسے ہم دونوں کو دیکھ رہی ہے، کتنی خوبصورت ہے یہ، اگر اس جسم پر کمبل ڈھک دیا جائے تو لوگ اس پر دھڑا دھڑ عاشق ہوں گے۔"

"رام رام، یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ مم ہم سب کی ماتا ہے۔ پاروتی میا کی داس ہے۔ توبہ کیجئے توبہ ورنہ پاروتی میا کا شراپ لگے گا۔ وہ بددعا دیں گی۔" مینکا نے اپنے گالوں پر ہلکے ہلکے طمانچے مارتے ہوئے کہا۔

"بھئی میں ٹھہرا دور دیش بنگال کا۔ وہاں ایسی کوئی گائے ہوتی نہیں ہے۔"

"پھر گائے کہا۔ یہ گائے نہیں مم ہے مم۔" کہتے ہوئے اس نے مم کے گلے باہیں ڈال دیں۔ مم نے بھی اپنا چہرہ اس کے چہرے سے لگا دیا۔ وہ زبان سے بول رہی تھی، مگر اس کی بڑی بڑی آنکھیں ممتا کی بولی بول رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر سا شفقت کا پرتو چھایا ہوا تھا۔ کافی دیر تک وہ دونوں ایک دوسرے کے گالوں سے لگائے بیٹھی رہیں اور نیل منی خاموش نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ اسے "یتی" کا دھڑکا لیکن وہ نہیں آیا۔

"تودوں کی برسات بند ہو گئی ہے۔ چلئے اب چلتے ہیں۔" کہتے ہوئے مینکا کھڑی ہو گئی۔ اسے کھڑا ہوتے ہوئے دیکھ کر مم نے عجیب سی آواز نکالی اور اندھیرے کی

دوڑتی چلی گئی۔ وہ دونوں تھم کر کھڑے ہو گئے۔ جس تیزی سے مم اندر گئی تھی اسی تیزی سے وہ لوٹ آئی۔ اس نے ایک بڑی سی ڈالی کو منہ میں پکڑ رکھا تھا۔ اس ڈالی میں سیب جیسے پھل لگے ہوئے تھے۔ اس نے مینکا کے سامنے ڈال دیا۔ مینکا نے خوش ہو کر مم کو چوم لیا۔ نیل منی نے پھل توڑ توڑ کر الگ کر لئے اور ایک پھل کو چکھ کر دیکھا۔ اس کا ذائقہ بھی سیب جیسا تھا۔ باقی پھل مینکا نے اپنی ساڑی کے پلو میں پوٹلی بنا کر باندھ لئے۔ دونوں اسے دانتوں سے کترتے ہوئے باہر نکل آئے۔ مطلع بالکل صاف ہو چکا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے اوپر کی جانب بڑھنے لگے۔ کچھ دور جانے کے بعد انہیں "یتی" نظر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی نیل منی کے جسم میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔

"یتی" بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کی ناک سے بہنے والا خون دور دور تک برف پر پھیلا ہوا تھا۔ دیکھنے میں انسانوں جیسا تھا لیکن قد انسانوں سے دوگنا تھا۔ پندرہ ہاتھ لمبا تھا وہ اور اس کا جسم بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

"جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں سے دور نکلنے کی کوشش کریں۔ بدن کی خوشبو کے سہارے اس کی مادہ اسے ڈھونڈتی ہوئی آ رہی ہو گی۔" کہتے ہوئے مینکا نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔

وہ ایک دن اور ایک رات مسلسل چلتے رہے۔ جسم تھکن سے چور ہو چکا تھا۔ چلنے کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ پھر بھی مینکا اپنے آپ کو گھسیٹ رہی تھی۔ آخرکار یہ تھکا دینے والا سفر ختم ہوا اور وہ دونوں سادھو کے غار تک پہنچ گئے۔ انہیں دیکھتے ہی سادھو نے کہا۔ "نیل منی، واقعی تم ہٹ کے پکے ہو۔ اپنا کہا سچ کر دکھایا اور میرے لئے موت لے آئے۔ میں تمہیں زندگی دوں گا۔ ضرور دوں گا۔" پھر وہ اسے ساتھ لے کر اندرونی حصے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ مینکا نے بھی بڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے سادھو نے روک دیا تھا۔ سادھو اسے آخری حصے میں لے کر گیا اور پھر ایک کتاب دیتے ہوئے بولا۔ "اس میں دی گئی ہدایت پر عمل کرو۔ جتنے قسم کے عملیات ہیں، یوگ ہیں، یکے بعد دیگرے کرتے چلے جاؤ لیکن کامیابی تمہیں تب ہی ملے گی جب کام روپ دیش کی لکھیا میا کے مندر کا پجاری تمہیں جیون پراش کھلائے گا۔"

"جیون پراش کی اجزائے ترکیبی تو جیون رشی کے ساتھ ختم ہو گئیں۔" نیل منی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا۔

"نہیں۔ تب تمہیں اس کی حقیقت کا پتہ نہیں ہے۔ یہ تو جانتے ہی ہوگے کہ جیون رشی بھگوانوں کا وید تھا؟"

"جی ہاں' جانتا ہوں۔ وہ بھگوانوں کے حکیم تھے۔"

"اور یہ بھی جانتے ہوگے کہ انہوں نے جیون پراش کیوں بنایا تھا؟"

"جی ہاں' اپنی جوانی برقرار رکھنے کے لیے۔ ڈھائی سو سال کی عمر میں بھی وہ اپنے آشرم کی دیو بالاؤں کی گود ہری کرتے تھے اور جب وہ اپنی لمبی عمر سے اکتا گئے تو انہوں نے جیون پراش کھانا ترک کر دیا نتیجتاً ان کی موت واقع ہو گئی۔" نیل منی نے جواب دیا۔

"اور یہ بھی جانتے ہو گے کہ اس فارمولے کو دھنوتری' چرک اور کامیشر وید نے بھی بنایا لیکن تینوں حکیموں کے پاس صحیح صحیح اجزائے ترکیبی نہیں تھی۔ لکھیا مندر کے پجاری ہری ونش کے پاس بھی صحیح اجزائے ترکیبی نہیں ہے پھر بھی اپنی رسائین (کیمیا) کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ اسے خوش کر کے یا چھین کر تمہیں پینا ہوگا۔ باقی کمی یوگ (ورزش) پوری کرے گا۔ آج رات آرام کر لو۔ صبح ہوتے ہی چل دینا۔" کہتے ہوئے وہ مڑ گیا۔ نیل منی بھی دہانے کی طرف چل پڑا۔

"تم یہاں سو رہو۔" سادھو نے دہانے کے نزدیک بچھی ریچھ کی کھال کی جانب اشارہ کیا۔ "اور مینکا کو وہاں سلانا۔" چلتے ہوئے سادھو نے غار کے وسط میں بچھی ہوئی کھال کی جانب اشارہ کیا۔ وہ تو پہلے ہی سونے کے لیے بے تاب تھا اجازت ملتے ہی لیٹ گیا۔ وہ بے خبر نیند میں تھا کہ مینکا نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا اور پھر بولی۔

"لو' یہ پھل کھالو۔"

بے دلی سے اس نے پھل لے لیا اور دانتوں سے کترتے کترتے ہی پھر سو گیا' ریچھ کی کھال دو آدمیوں کے لیے ناکافی تھی۔ مجبوراً مینکا کو غار کے وسط میں بچھی کھال پر سونا پڑا۔ تھکن نے اس کے جوڑ جوڑ کو ہلا دیا تھا۔ کھال پر لیٹتے ہی اسے نیند نے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ سوئے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اسے احساس ہوا جیسے دو مضبوط بازوؤں نے اسے دبوچ لیا ہو۔ وہ دباؤ کچھ ایسا تھا کہ اس کا دل دہشت سے ایک دم ٹھہر گیا تھا۔ جیسے کسی نے اس کے جسم میں چاقو اتار دیا ہو۔ درد کی تیز لہر بھی محسوس ہوئی تھی

اور اس کے حواس کے چراغوں کی لو مدہم ہوتے ہوئے بجھ گئی تھی۔

اس کی تیز چیخوں کی آواز بھی نیل منی کو بیدار نہیں کر سکی۔ وہ ساری رات دنیا و مافیہا سے بے خبر رہا لیکن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ اٹھ بیٹھا۔ اس نے غار میں پھیلی ہلکی روشنی میں دیکھا مینکا آڑی ترچھی پڑی ہے اس کے برابر ایک عجیب بدہیئت سا بوڑھا سو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نیل منی کا سارا وجود کانپ اٹھا۔ اس کا بدن کوڑھ کی وجہ سے سفید ہو رہا تھا۔ کوڑھ نے اس کے جسم ہی نہیں چہرے کو بھی مسخ کر دیا تھا کہ اس کی طرف دیکھنے سے کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

خوف کی تیز لہر نے نیل منی کو مفلوج کر دیا تھا لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر تک نہیں رہی اور وہ ڈولتے دل پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دھیرے دھیرے اس کوڑھی کے نزدیک پہنچا۔ نزدیک پہنچتے ہی اس نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی سادھو تھا۔

نیل منی نے اس کے شانوں کو پکڑ کر ہلاتے ہوئے آواز دی۔ "رشی ور' اٹھئے بھور ہو گئی۔" کوڑھی نے پہلے پلکیں جھپکائیں اور پھر اٹھ بیٹھا۔

"بالک' میں نے نروان پا لیا۔ اب میری موت زیادہ دور نہیں ہے۔ موت کے آنے کا اشارہ میرے جسم پر نمودار ہو چکا ہے۔ میرے گناہ جسم پر پھوٹ چکے ہیں۔ اب تو جا سکتا ہے۔ اس بالیکا کو بھی لے جا لیکن خبردار' اب اس کی پیاس بہت بڑھ گئی ہے لیکن اس کے نزدیک کبھی نہ جانا اگر تو اس سے ملا تو سمجھ لے تیری شکتی لوپ ہو جائے گی۔ سارا علم غارت ہو جائے گا۔ اس لئے جذبات میں اندھا کبھی نہ بننا۔ ہاں' کسی شکتی شالی پنڈت' رشی' سادھو سے دشمنی نکالنا ہو تو اسے اس کے قریب کر دینا' میرا گناہ اس کے جسم میں داخل ہو چکا ہے وہ اسے بھی دبوچ لے گا۔ اب جا اور سن۔" کہتے کہتے وہ رک گیا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد پھر اس نے کہا۔ "عمر دوام حاصل کرنے سے پہلے میں نے واپس جانے کے لیے ایک کشتی بنائی تھی جو اب بھی یدر ندی کے کنارے بندھی ہے۔ ندی کا بہاؤ نیچے میدانی علاقے کی طرف ہے اس لیے تم بغیر کسی محنت کے کشتی کے ذریعہ بہ آسانی پہنچ جاؤ گے۔ اب جاؤ۔"

سادھو کا حکم پاتے ہی وہ مینکا کے نزدیک پہنچا اور پھر اس نے اسے بیدار کرنے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے جھنجھوڑا لیکن وہ نہیں اٹھی۔

"مورکھ' یہ سوئی ہوئی نہیں ہے۔ بے ہوش ہے۔ اس کے چہرے پر برف رگڑو تب اسے ہوش آئے گا۔"

سادھو نے کہا۔ نیل منی اس کے مشورے پر باہر سے برف کا گولا لایا اور اس کے چہرے پر ملنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اسے ہوش آ گیا۔ شوہر کو دیکھتے ہی وہ اس سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور نیل منی اسے تسلیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد کہا۔ "اب ہمیں یہاں ایک پل بھی نہیں رکنا ہے چلو واپس چلتے ہیں۔" وہ سسکتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور لنگڑاتی ہوئی غار کے دہانے کی طرف بڑھی تو نیل منی نے بلکتی ہوئی مینکا کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا اور غار سے باہر نکل آیا۔ مینکا چل نہیں گھسٹ رہی تھی۔ گویا وہ ایک چلتی پھرتی لاش ہو۔ اس زندہ لاش کو سہارا دیئے ہوئے وہ یدر ندی کے کنارے پہنچ گیا۔ ندی کا تیز بہاؤ نیچے کی سمت پُرشور آواز سے بہہ رہا تھا۔ نیل منی نے تیز بہاؤ پر نگاہ ڈالی اور پھر متلاشی نگاہوں سے دور تک دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ساحل سے کچھ دور پیڑ سے بندھی کشتی نظر آ گئی جو برف میں آدھی سے زیادہ دھنسی ہوئی تھی۔ نیل منی نے مینکا کو کنارے پر بٹھایا اور خود کشتی کی جانب بڑھ گیا۔ برف سے کشتی کو نکال کر اس نے پانی میں ڈالا اور پھر مینکا کو آواز دی۔ مینکا اپنے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی کشتی میں بیٹھ گئی۔ نیل منی نے آدھا دھڑ کشتی سے نکال کر ہاتھوں سے کنارے کو پیچھے دھکیلنا شروع کیا۔ کشتی پوری کی پوری ندی کے بہاؤ میں آ گئی۔ وہ پورے ایک ماہ کا سفر طے کر کے آسام کے شہر کام روگ پہنچا۔ کمکھیا کا مندر ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا اور وہاں تک پہنچنا کار دارد تھا۔ بہرحال بہ دقت تمام یہ لوگ وہاں پہنچ گئے جہاں شاید گیان دھیان کا کوئی تہوار منایا جا رہا تھا اور بہت بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ بڑے پجاری نے مورتی کی آرتی اتاری اور پھر تمام لوگوں کو باہر نکل جانے کا کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ نیل منی کی نظریں اس کا احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ جوں ہی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا نیل منی بھی اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اپنے پیچھے پیچھے ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ چونک گیا۔ "کہیئے شریمان' آپ کی کیا سیوا کروں؟" پجاری ہری ونش نے پوچھا۔

"میں آپ کا شاگرد بننا چاہتا ہوں۔" نیل منی نے کہا۔

"لیکن میں کسی کو اپنا شاگرد نہیں بناتا۔" پجاری نے ٹکا سا جواب دیا۔

"لیکن میرا وعدہ ہے کہ میں آپ کو اپنا استاد بناؤں گا۔"

"وہ تمہاری پرتگیا ہے لیکن میں تمہارا گرو نہیں بنوں گا۔"

"مینکا نے وشومیتر کی' پاروتی نے شیو کی' بھولا نے راجہ اندر کی' ساوتری نے یم دوت کی پرتگیا توڑی تھی۔ میں بھی آپ کی پرتگیا توڑ کر دم لوں گا۔" نیل منی نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"ہٹ کے پکے لگتے ہو۔ ٹھیک ہے میں کل سے تمہیں سکھا دوں گا۔ اب جاؤ۔ میری پوجا کا سمے ہو گیا ہے۔" نیل منی باہر نکل آیا۔

دوسرے دن سے پنڈت ہری ونش نے اسے منتر کی تعلیم دینا شروع کر دی۔ کس منتر کے ذریعے کون سا کام نکالا جاتا ہے' یہ بتاتے ہوئے انہوں نے ایک ماہ گزار دیا اس ایک ماہ میں پنڈت ہری ونش کا سارا علم نیل منی کے دماغ میں منتقل ہو گیا تھا۔ وہ سفلی علوم کا ماہر بن چکا تھا لیکن یہ اس کی منزل نہیں تھی۔ اسے تو ہری ونش کا رسائین حاصل کرنا تھا اور وہ تبھی حاصل کر سکتا تھا جب وہ اسے دے دیتا لیکن وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ اپنی زندگی بھر کی محنت اسے سونپ دیتا۔ اسے چھیننا ضروری تھا لیکن نیل منی بھی بے وقوف نہیں تھا کہ اتنی بڑی غلطی کر دیتا کیونکہ ہری ونش کالے علم کا ماہر تھا۔ وہ اسے جلا کر خاک بھی کر سکتا تھا۔ اسی لئے وہ موقع کی تلاش میں تھا لیکن موقع ہاتھ آ نہیں رہا تھا۔ دوسری جانب مینکا اس کے سر پر سوار تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن وہ شوہر ہوتے ہوئے بھی اسے بیوی کا حق دینے پر تیار نہیں تھا کیونکہ مینکا وہ بھولی بھالی مینکا نہیں تھی اس کے اندر سادھو کی غلیظ روح داخل ہو چکی تھی تبھی تو اس کے اندر آگ کی بھٹی سلگ اٹھی تھی اور وہ اس بھٹی پر اپنے مفاد کی کھچڑی پکانا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ متواتر بہانے بنا رہا تھا کہ تب تک رک جاؤ جب تک میں جاپ مکمل نہ کر لوں۔ چلہ پورا ہوتے ہی تمہاری خواہش پوری کروں گا اور اس کی خواہش پوری کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ بس ایک رات کا فاصلہ تھا۔ وہ رات اس کی زندگی کی سب سے اہم رات تھی۔ اسے پنڈت ہری ونش "دکھشا" دینے کو تیار تھا۔ دکھشا ملتے ہی وہ کالے علم کا ماہر بن جاتا۔ اس رات وہ وقت سے پہلے ہی مندر میں پہنچ گیا تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور لکھیا دیوی کے سامنے بیٹھ کر منتر کا جاپ کرنے لگا تھا۔ پورن ماشی کی رات آتے ہی پنڈت ہری ونش اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں پیتل کا ایک کٹورا تھا۔ کٹورے کو نیل منی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے کہا۔ "اسے ہاتھ میں پکڑے رہو۔" اور پھر وہ منتر کا جاپ کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں نیل منی کو محسوس ہوا جیسے سینکڑوں چیونٹیاں اس کی ناک میں سرسرانے لگی ہیں۔ اس نے گھبرا کر زور سے چھینکا۔ چھینک کے ساتھ ہی اس کی ناک سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے پیالہ خون سے لبالب بھر گیا۔ کٹورا بھرتے ہی ناک سے خون آنا بند ہو گیا۔ بھرے ہوئے پیالے میں انگلی ڈبو کر پنڈت نے باہر نکالی اور اس انگلی سے اس نے لکھیا دیوی کے پیروں پر تیر خط کھینچے۔ کچھ پڑھ کر خون کے پیالے پر پھونکا اور پھر حکم دیا۔ "نیل منی اسے پی جاؤ۔" نیل منی نے پیالے کو اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا اور غٹاغٹ پی گیا۔ خون پیتے ہی اسے ایسا لگا جیسے اس کے جسم میں آگ بھر گئی ہو۔ اندر تندور جل اٹھا ہو۔ وہ عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا لیکن جلد ہی اسے اس کیفیت سے نجات مل گئی اور وہ سکون محسوس کرنے لگا۔ اس پر غنودگی چھانے لگی تھی۔

"اب تم اپنے وقت کے سب سے بڑے "تانترک" بن چکے ہو۔ اور مجھ سے بھی بڑے کیونکہ میرے پاس صرف ایک فن ہے۔ منتر کا علم اور تمہارے پاس منتر کے ساتھ یوگ کا علم بھی ہے۔"

"گرو جی میں آپ کو "گرو دکھشنا" دینا چاہتا ہوں۔"

"کتنا معاوضہ دے سکتے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اپنے علم سے بے شمار دولت حاصل کر سکتا ہوں؟"

"دولت نہیں میں اپنی سب سے قیمتی چیز آپ کو دے رہا ہوں۔ اپنی بیوی آپ کو پیش کر رہا ہوں۔"

"کیا؟" ہری ونش کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑی تھیں۔

"ہاں ایک رات کے لیے یا پھر زندگی کے لیے۔ میں آپ کے کمرے میں سو جاتا ہوں اور آپ میرے کمرے میں چلے جائیے۔ وہ نہ جانے کب سے ترس رہی ہے۔ اس کے سلگتے ہوئے دل پر مرہم رکھ دیجیے۔ جائیے ابھی چلے جائیے۔" کہتے ہوئے وہ ہری

ونش کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

نیند کا غلبہ تھا لیکن وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ رسائین کو تلاش کرنا تھا۔ جسے اسی کمرے میں کہیں چھپا کر رکھا گیا تھا لیکن آدھی رات سے پہلے اسے تلاش کرنا خطرناک تھا کیونکہ ہری ونش کا علم جاگ رہا تھا۔ مینکا کی قربت کے بعد ہی اس کا علم غارت ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ وقت گزرنے کا انتظار کر رہا تھا اور نیند اسے سو جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ جب نیند اسے بری طرح گھیرنے لگی تو اس نے اپنی انگشت شہادت کو دانتوں تلے رکھ کر پوری قوت سے دبا دیا۔ انگلی کے نرم گوشت میں دانت پیوست ہو گئے۔ درد کی شدت نے نیند کو دور بھگا دیا اور وہ خوش ہو گیا۔

چاند نے آدھے سے زیادہ سفر طے کر لیا تھا۔ نیل منی کو اسی وقت کا انتظار تھا۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ ہری ونش کا علم مٹی میں مل چکا ہے۔ اب علم کو کام میں لانا ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر کے ہری ونش کا دھیان کیا۔ وہ اسے ہانپتا ہوا نظر آیا۔ اس نے ادھر سے دھیان ہٹا کر رسائین کی جانب دھیان کا رخ موڑا۔ وہ اسے زمین کے نیچے دبا نظر آ گیا۔ ہری ونش نے اسے کمرے کا فرش کھود کر دبا دیا تھا۔ نیل منی نے کمرے کا فرش کھودنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر میں اندر سے ایک مرتبان نکل آیا۔ پیتل کے اس مرتبان میں بھرا رسائین اس نے حلق سے نیچے اتار لیا۔ رسائین کھاتے ہی اسے ایسا لگا جیسے جسم کے اندر اینٹھن سی شروع ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کیفیت کچھ ہی پل میں ختم ہو گئی۔ اسے اپنے جسم میں ایک نئی طاقت محسوس ہونے لگی۔ جس عمردوام کو حاصل کرنے کے لیے وہ دو سال سے جنگل جنگل بھٹک رہا تھا۔ وہ اسے کتنی آسانی سے مل گیا۔ کامیابی کے نشے میں سرشار وہ اٹھا اور مندر سے باہر نکلا۔ صرف مندر سے ہی نہیں وہ اس رات بیوی کو وہیں چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ مہینوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر کے وہ نرائن گنج پہنچ گیا۔

محل میں پہنچنے کے دوسرے ہی دن اسے خواب میں وہی سادھو نظر آیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "نیل منی تم نے عمردوام تو حاصل کر لی ہے لیکن اسے قائم رکھنے کے لیے تمہیں عورت سے دور رہنا ہوگا۔ یہ طاقت تم نے منتر کے زور پر حاصل کی ہے اور منتر کی طاقت برقرار رکھنے کے لیے تمہیں ہر سال ایک بچے کا خون پینا ہوگا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے اپنی قوت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی ہی رعایا کے بچوں کا خون پینا شروع کر دیا۔ یہ بات زیادہ دیر چھپی نہ رہ سکی اور عوام تک پہنچ گئی۔ انسان سب کچھ برداشت کر سکتا ہے لیکن اپنے بچوں کی موت نہیں بچوں کی موت نے بغاوت پھیلا دی۔ مشتعل عوام نے محل میں آگ لگا دی۔ نیل منی جانتا تھا کہ یہ آگ اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر بھی اس نے عوام کی نظروں سے بچنے کے لیے تہہ خانے میں پناہ لے لی۔" اس اجنبی نے اپنی کہانی ختم کی تو میں چونک گیا۔ میری نگاہوں کے سامنے سے اسکرین غائب ہو گئی۔ اور میں نے اپنے آپ کو اسی تہہ خانے میں پایا۔

"جانتے ہو شاہد علی۔" اجنبی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "نیل منی نے اپنی حفاظت کے لیے اس تہہ خانے میں مایا جال بنا رکھا ہے۔ انسان وہی کچھ دیکھتا ہے جو وہ دکھانا چاہتا ہے مثلاً گردن کٹی عورت یا پھر کچھ دوسری خوفناک چیزیں۔"

"آں۔" میں نے چونک کر کہا۔ "کہیں میں بھی تو مایا جال میں پھنسا ہوا نہیں ہوں۔"

اجنبی نے جواب نہیں دیا صرف مسکراتا رہا۔ کچھ دیر توقف کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "لو تمہارے نجات دہندہ آ گئے۔ اب تم اپنے بیوی اور بچے کو لے کر اوپر چلے جاؤ۔"

"اوپر کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پاکستانی فوج ایکشن میں آ گئی ہے۔ فوج کے جوان ادھر ہی آ رہے ہیں جو تمہیں ڈھاکا تک پہنچا دیں گے۔" فوج کا نام سنتے ہی میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا اور بیوی کے کمرے کی جانب لپکا۔ وہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے سمجھا کہ شاید اب تک اس کے ذہن پر رات کے بلوے کا خوف ہے۔ اس لئے تسلی دیتا ہوا اسے اٹھا کر باہر کی جانب چل پڑا۔ سیڑھیوں پر پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ اس نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ راجہ نیل منی کا کیا ہوا۔ تجسس کو فرو کرنے کے لیے میں نے بیوی کو اوپر جانے کو کہا اور واپس اس اجنبی کے پاس پہنچا اور میں نے پوچھا۔ "آپ نے تو بتایا نہیں کہ نیل منی کا کیا ہوا؟"

"وہ بھی لمبی عمر سے اکتا گیا تھا اور اپنی موت کو تلاش کر رہا تھا۔ اتفاقاً اس کی موت

خود چل کر آ گئی اور اس نے موت کو گلے سے لگا لیا یعنی اپنا سارا گناہ اس کے ذمے لگا دیا۔" کہتے ہوئے وہ اس کمرے کی جانب بڑھ گیا جہاں میں نے اس سرکٹی عورت کو دیکھا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے میں اس بے چاری کی قسمت پر افسوس کر رہا تھا۔ باہر نکلتے ہی مجھے فوج کے جوان نظر آ گئے۔ اپنے جیالے جوانوں کو دیکھتے ہی میں نے آواز دی۔

"کون ہو تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ایک افسر نے پوچھا۔

"جان بچانے کے لیے چھپا ہوا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"آؤ تمہیں دوسرے کنارے پر پہنچا دوں۔" کہتے ہوئے افسر نے کشتی کی جانب قدم بڑھایا۔ ہم دونوں کشتی سے دوسرے کنارے پر پہنچے اور ملٹری والوں نے ٹرک پر سوار کرا کے بہاریوں کی سب سے بڑی آبادی میرپور پہنچا دیا۔ میرپور کے دس نمبر سیکشن میں ہم جیسے لٹے پٹے لوگوں کے لیے کیمپ لگایا گیا تھا۔ سیٹلائٹ ٹاؤن ہائی اسکول کے میدان میں لگے کیمپ میں ہمیں ایک خیمہ دے دیا گیا۔ لیکن مجھے خیمے میں ٹھہرنا برا لگ رہا تھا۔ اس لیے میں نے پروین سے کہا۔ "تم پپو کو سنبھالو میں کرائے کا مکان تلاش کرنے جا رہا ہوں۔"

میری بیوی نے پپو کو گود میں لینے کے لیے بانہیں پھیلائیں لیکن جوں ہی میں نے بیٹے کو آگے بڑھایا وہ ایسے اچھل کر پیچھے ہٹ گئی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ بچہ گرتے گرتے بچا تھا۔ میں نے غصے سے اسے جھڑکا۔ "اپنے آپ کو سنبھالو۔ اب ہم محفوظ علاقے میں ہیں۔ یہاں کوئی کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔"

"آپ پپو کو ساتھ لیتے جائیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے کہا۔ اس کے چہرے پر چھائی زردی نے مجھے اس کی بات ماننے پر مجبور کر دیا تھا اور میں حجت کئے بغیر بچے کو گود میں اٹھائے باہر آ گیا۔ کافی تلاش بسیار کے بعد مسجد بیت المشرف کے پاس ایک دو کمروں کا مکان تیس روپے ماہوار پر مل گیا۔

انسان کی خصلت ہے کہ وہ جان کے ساتھ دولت بھی بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ حملے والی رات کو گھر سے نکلنے سے پہلے زیورات اور نقد روپے کو پوٹلی میں باندھ کر میں نے کمر میں اڑس لیا تھا۔ وہی روپے کام آ رہے تھے۔ میں نے تیس روپے مکان مالک کو دیئے اور ایک سو روپے ان کے بیٹے کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ "بھیا ایک پلنگ اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بستر خرید کرلا دو۔ میں اکیلا ہوں اور بچہ ساتھ ہے۔ بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس لئے تمہیں تکلیف دے رہا ہوں۔"

وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ ہر کوئی ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔ وہ فوراً ہی مدد کے لیے تیار ہو گیا اور میں واپس کیمپ کی جانب چل پڑا۔ بیوی کے پاس پہنچتے ہی میں نے کہا۔ "چلو ہمیں مکان مل گیا ہے۔"

وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ہمیں دیکھ کر کتے بھونکنے لگے۔ ایک کے بعد ایک جمع ہوتے ہوئے کتوں کا ہجوم ہمارے پیچھے لگ گیا تھا۔ وہ سب دور دور سے ڈری ہوئی آواز میں بھونکتے ہوئے بڑھ رہے تھے اور ہم دونوں خوف سے سہمے ہوئے مسجد کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ خدا خدا کر کے اس مکان تک پہنچے۔ مکان میں داخل ہونے کے بعد بھی کتوں کا بھونکنا بند نہ ہوا۔ اس افتاد سے گھبرا کر آس پڑوس والوں نے کتوں کو مار مار کر بھگانا شروع کر دیا لیکن کتے بھی اتنے ڈھیٹ تھے کہ وہ بھاگ کر دور جاتے اور پھر دوڑ کر لوٹ آتے۔ وہ رات بہت بھاری گزری۔ ساری رات کتوں نے گھر کا محاصرہ کئے رکھا۔ دوسری جانب پروین نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ رہ رہ کر مجھے بیدار کر دیتی کہ اسے کتوں سے ڈر لگ رہا ہے۔ بڑی مشکلوں سے اسے سلایا تھا کہ وہ پھر اٹھ بیٹھی اور اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال کر چیخنے لگی۔ اس کی چیخ نے ہی مجھے بیدار کر دیا تھا۔

"کیا ہوا کیوں چیخ رہی ہو؟ کم سے کم اذان کی تعظیم تو کرو۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"پتہ نہیں مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے دماغ کی رگیں پھٹ رہی ہیں۔" پروین نے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پچھلی باتوں کو بھولنے کی کوشش کرو۔" میں نے اپنی چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ میرے اٹھتے ہی پپو بھی بیدار ہو گیا۔ اسے چپ کرانے کے لیے میں نے پروین کو دینا چاہا تو اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں لرزنے لگیں اور وہ ڈری ڈری آواز میں بولی۔ "نہیں اسے دور رکھو۔"

"اچھا بھائی۔" کہتے ہوئے میں نے بچے کو کندھے سے لگا کر ٹہلانا شروع کر دیا۔ وہ چپ ہو گیا۔

اذان ختم ہوتے ہی پروین بھی خاموش ہو گئی تھی۔ اور میں نیند پوری کرنے کے

لیے پھر لیٹ گیا۔

ملٹری ایکشن کے بعد پچیس دن سے بند آفس عدالت کھل گئے تھے۔ تمام ملازمین کو فوراً کام پر پہنچنے کی ہدایت ریڈیو پر سنا دی گئی تھی۔ عوامی لیگ کی جانب سے کی گئی وہ ہڑتال ناکام بنا دی گئی تھی۔ دوسرے ملازمین کی طرح میں بھی اپنے آفس جانے کے لیے صبح ہی صبح گھر سے نکل پڑا۔ میرا آفس قلب ڈھاکہ میں موتی جھیل کے علاقے میں تھا۔ پانچ نمبر کی بس کے ذریعے میں گلستان پہنچا اور پھر وہاں سے سائیکل رکشا کے ذریعہ موتی جھیل۔ آفس پہنچتے ہی ایک نیا حکم میرا منتظر تھا۔ میرا تبادلہ میمن سنگھ کر دیا گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی پروین نے فرمائش کی کہ وہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔ کسی دوسری جگہ مکان لیا جائے۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ پھر سے مکان کی تلاش میں جت گیا اور اسی شام بارہ نمبر سیکشن میں ایک مکان تلاش کر لیا۔ اسے نئے گھر میں پہنچا کر دوسرے روز میں نے میمن سنگھ کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

میمن سنگھ پہنچ کر بھی میرا دل پروین میں لگا ہوا تھا۔ کتے اسے دیکھ کر کیوں بھونکنے لگتے ہیں یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن کام کی زیادتی نے آہستہ آہستہ ذہن کا بوجھ کم کر دیا۔ ایک ماہ بعد جب میں دو دن کی چھٹی لے کر گھر پہنچا تو ایک بری خبر منتظر تھی۔

پروین کی طبیعت سنبھل نہیں رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بیماری کی وجہ سے پپو مالک مکان کی بیوی شاہدہ کے پاس ہی رہتا تھا۔ وہی اسے نہلاتی دھلاتی کھلاتی پلاتی تھی۔ رات میں بھی وہ اسی کے پاس رہتا تھا۔ وہ اچھا بھلا کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے پتہ نہیں وہ کیسے نیچے گر پڑا۔ اس کی چیخ سن کر پروین بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ اس نے بیٹے کو زمین پر گرا دیکھا۔ اسے گود میں اٹھا لیا اور اپنے کمرے میں لے آئی۔ بچے کے گر جانے کی پشیمانی سے رنجیدہ شاہدہ نے پپو کے گلے میں پڑا رہنے والا حمائل شریف اور دوسرے تعویذ لا کر دیتے ہوئے کہا۔ "پروین میں نے نہلاتے وقت اسے اتار دیا تھا لگتا ہے اسی وجہ سے کسی کی نظر لگ گئی۔ لو اسے پہنا دو۔"

"نہیں نہیں اسے رہنے دو۔" پروین نے خوف سے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجبوراً وہ لوٹ گئی۔ اس رات پہلی بار پروین نے بچے کو اپنے ساتھ سلایا لیکن وہ رات
کی آخری رات تھی۔ صبح وہ مرا ہوا پایا گیا۔ اس کا جسم کورے کاغذ کی طرح سفید ہو رہا
گویا کسی نے اس کے جسم سے ایک ایک قطرہ خون نچوڑ لیا ہو۔ پروین نے روتے ہو
بتایا کہ پلنگ سے گرنے کی وجہ سے دماغ کی کوئی رگ پھٹ گئی تھی اسی لیے وہ جانبر نہ
سکا۔

اس غم جانکاہ نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔ میں بلک بلک کر رونے لگا۔ مجھے رو
دیکھ کر شاہدہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "بھیا خدا کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ غم نہ کر
خدا ایک لیتا ہے تو دس دیتا ہے۔ تمہارے گھر میں پھر ایک مہمان آ رہا ہے۔ اسی ل
پروین کی طبیعت خراب رہتی ہے۔" غمناک ماحول میں خوشی کی اس خبر نے مجھے مسرت
نہیں بخشی لیکن غم کو ضرور کم کر دیا۔

پروین اُمید سے ہے' اس لئے میں نے دور رہنا ہی مناسب سمجھا اور دوسرے د
لوٹ گیا۔ میمن سنگھ سے ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو ایک دن کے لیے مہرپور آتا اور تنخواہ پر
کے ہاتھ میں دے کر لوٹ جاتا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ تین سو روپے بھی اس کے لیے
پڑ رہے تھے۔ جبکہ نرائن گنج میں ہم دو تھے پھر بھی دو سو روپے میں خانہ داری کا خرچ
حسن و خوبی پورا ہو جاتا تھا اس کی وجہ جاننی چاہی تو پروین نے بتایا کہ آج کل اس کا
گوشت کھانے کو زیادہ چاہتا ہے۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی تھی کیونکہ پہلے پر
گوشت کے نام سے چڑتی تھی' اسی لئے کمزور تھی۔ اپنی صحت بنانے کے لیے اس
گوشت کا استعمال شروع کر دیا ہے' یہ بات میرے لیے خوش کن تھی۔ اس بات پر
ہوئے شاہدہ نے کہا تھا۔ "بھابی تو کسی جنگلی قبیلے کی لگتی ہیں۔ دونوں وقت انہیں گو
چاہیے اور وہ بھی صرف اُبالا ہوا ادھ کچا۔"

شاہدہ کی بات پر میں نے غور نہیں کیا تھا۔ کاش میں اسی وقت غور کر لیتا تو بعد
مصیبتوں سے چھٹکارا مل گیا ہوتا۔ اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر میں سونے کے لیے
گیا اور صبح ہوتے ہی میمن سنگھ روانہ ہو گیا۔

وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا اور میرے گھر ایک نیا مہمان آ گیا۔ بچے کی پیدا
کی خبر سنتے ہی میں گھر لوٹ آیا۔ جنگ چھڑ چکی تھی اس لیے چھٹی ملنی مشکل تھی۔

لیے میں آفس میں بغیر اطلاع دیئے مہرپور آ گیا۔ مہرپور پہنچتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ اس بچے کی شکل ہوبہو کھنڈر والے اجنبی سے ملتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس اجنبی نے بچے کی شکل اختیار کر لی ہو۔ میں اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا اور غصے کی لہر میرے دل و دماغ کو بڑھا رہی تھی میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ بچہ میرا نہیں ہے اور اس دن کھنڈر میں اسی اجنبی نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔ کہیں میں غصے میں کچھ کر نہ بیٹھوں اس ڈر سے میں گھر سے باہر نکل آیا۔ رات میں میمن سنگھ جا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے دل پر جبر کر کے گھر لوٹ آیا اور اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ میں نے ٹھان لی تھی کہ صبح ہوتے ہی میمن سنگھ لوٹ جاؤں گا لیکن میمن سنگھ لوٹنے کی امید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ افواہ گردش کرنے لگی کہ پاکستانی فوج نے ہتھیار ڈال کر شکست تسلیم کر لی اور مہرپور کو بنگالیوں نے نرغے میں لے لیا ہے۔ کسی بھی وقت حملہ ہو سکتا ہے۔

جب جان کے لالے پڑ جائیں تو سارے گلے شکوے مٹ جاتے ہیں۔ غصہ کافور بن جاتا ہے۔ ستمبر سے تین جنوری تک گھسان کا رن پڑا تھا۔ نہتے عوام معمولی بندوقوں' ہاتھ سے بنائے گئے دیسی بموں اور اور لیتھ مشین پر پانی کے پائپ سے بنائی گئی رائفلوں سے انڈین اور بنگالی فوج سے مقابلہ کرتے رہے۔ اس اٹھارہ دن کی جھڑپ نے ساٹھ کلومیٹر کے رقبے میں پھیلے مہرپور کے عوام کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا تھا۔ ہر ایک کے دل میں بس ایک ہی لگن تھی کسی طرح دشمنوں کو روکا جائے۔ آہستہ آہستہ پسپا ہو کر دس گیارہ اور بارہ نمبر سیکشن میں گول بند ہوتے بہاریوں نے خون کے آخری قطرے تک لڑنے کی قسم کھائی تھی۔ لال کوٹھی' گوروہاٹ' فرسٹ سیکنڈ تھرڈ کالونی' ایک نمبر دو نمبر اور چھ نمبر سیکشن خالی ہو چکا تھا۔ کچھ تو مارے گئے تھے اور باقی لوگوں کو گرفتار کر کے مورا پاڑا کیمپ لے جا کر نظربند کر دیا گیا تھا۔ صرف دس گیارہ اور بارہ نمبر والے لڑ رہے تھے کہ انٹرنیشنل ریڈ کراس والے سیزفائر کرانے پہنچ گئے۔ ان لوگوں کی مداخلت سے بہاریوں نے تو ہتھیار رکھ دیئے لیکن ظلم کے سلسلے کو نہیں روک سکے۔ انفرادی گرفتاریوں کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ بدقسمتی سے میں بھی ظلم کے دو پاٹوں کے درمیان آ گیا۔ مجھے لوٹ مار بلوہ اور آتش زنی جیسے جھوٹے مقدمے میں پھانس لیا گیا۔ چھ ماہ کی سزا کاٹ کر واپس لوٹا تو بچہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کافی بڑا ہو چکا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ سات ماہ کا ہے۔ اس کی تو دو سال کے بچے جیسی صحت تھی۔ اس کی عادات و اطوار میں بھی پختگی آ چکی تھی۔ اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اس چھوٹے سے بچے کو گوشت کھاتے دیکھا۔ دو چار دانت ہی نظر آ رہے تھے لیکن وہ کسی پختہ عمر والے کی طرح بوٹیاں نگل لیتا تھا۔ اس کی ایک ایک حرکت نے مجھے چکرا دیا تھا۔ میں سمجھ کر بھی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ ایک گنجلک معمہ بن چکا تھا۔ نوکری سے تو پہلے ہی جواب مل گیا تھا۔ تمام بہاریوں کی طرح میں بھی بے کاری کی زندگی بسر کر رہا تھا اور انتظار میں تھا کہ مجھے میرے ملک بلایا جائے گا۔ پاکستان سے بلاوا آئے گا۔ اسی امید پر میں نے ری پارٹیشن فارم بھرا تھا۔ فارم جمع کرایا تھا ریڈ کراس والے کے پاس۔ کیونکہ وہی بہاریوں کی خانہ داری چلا رہے تھے۔ آٹا' تیل' نمک سب کچھ وہی دیتے تھے۔ ان کی بھیک پر وقت گزر رہا تھا کہ ایک دن ایک عجیب منظر دیکھا جسے دیکھ کر میرے ہوش و حواس اڑ گئے۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور میرے جسم میں رعشہ پیدا ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں حلقوں سے اُبلنے لگی تھیں۔

میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس کی حالت میرے ہی جیسی ہو جاتی۔ وہ دن تو میں بھلا ہی نہیں سکتا۔ اس دن میں ریڈ کراس والوں سے راشن لے کر واپس لوٹا تھا۔ پروین آواز دیتا ہوا جوں ہی میں اندر داخل ہوا وہ منظر منتظر تھا۔ ثاقب جو صرف ڈیڑھ سال کا تھا' وہ آنگن میں بیٹھا تھا اس کے دونوں ہاتھ اور منہ خون سے لتھڑے ہوئے تھے سامنے ایک بلی کی کٹی پھٹی لاش پڑی تھی۔ وہ اسے نوچ نوچ کر کھا رہا تھا۔ ایسا خوفناک منظر سامنے ہو اور دیکھنے والے کی چیخ نہ نکلے یہ ناممکن ہے۔ میری بھی چیخ نکل گئی تھی چیخ ... ہی وہ ایسے اُچھلا تھا جیسے سپرنگ والا گڈا ہو۔ وہ ہوا میں اڑتا ہوا میرے کندھے سے ... تھا اور کسی چمگادڑ کی طرح مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ میں نے اسے جھٹکنے کی کوشش کی تو وہ بیل کی طرح لپٹ گیا۔ ہم دونوں میں زور آزمائی شروع ہو گئی۔ میں اسے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھ جیسا توانا مرد اسے جھٹک نہیں پا رہا تھا۔ وہ آکٹوپس کی طرح لپٹ ... تھا۔ دم بدم اس کے تیز دانت میرے حلقوم کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے اور میری قوت مدافعت دم توڑتی جا رہی تھی کہ پروین فرشتہ رحمت بن کر آ گئی۔ اس نے پہلی نظر میں حالات کی نزاکت کو بھانپ لیا اور دروازے میں لگانے والی موٹی لکڑی اٹھا کر پوری قوت

سے اس کے سر پر دے ماری۔ "آق" کی آواز کے ساتھ وہ نیچے گر پڑا۔ پروین نے ایک وار پر بس نہیں کیا۔ تڑا تڑ وار کرتی گئی۔ ثاقب کا سر ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بعد وہ گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا اور بولی۔ "مجھے پہلے ہی احساس تھا کہ میں نے شیطان کی اولاد کو جنم دے کر بھول کی ہے لیکن اپنی کوکھ سے پیدا کیا تھا اس لیے ممتا پیار کرنے پر مجبور کر دیتی تھی لیکن سہاگ کو خطرے میں دیکھ کر ممتا مر گئی۔ سچ کہتی ہوں سرتاج ممتا مر گئی۔" کہتے کہتے وہ پھر رونے لگی۔

وہ دور ایسا تھا جب کوئی کسی سے باز پُرس نہیں کرتا تھا۔ ہر بہاری دوسرے بہاری کا جرم چھپا لیتا تھا۔ اس قتل کو بھی لوگوں نے چھپا لیا اور اسے خاموشی سے دفنا دیا۔ اتفاق سے اسی مہینے ہم لوگوں کا پاکستان سے کلیئرنس آ گیا اور ہم دونوں کراچی چلے آئے۔ رئیس امروہوی کی مہربانی سے اورنگی میں زمین بھی مل گئی لیکن ہم دونوں اس واقعے کو بھول نہیں پائے ہیں۔ آج بھی کراچی میں آ کر پیدا ہونے والے اپنے دونوں بچوں کی ایک ایک حرکت پر ہم دونوں نظر رکھتے ہیں۔ کسی بچے کو گوشت کھانے نہیں دیتے کیونکہ مجھے شک ہے کہ پروین کے اندر جراثیم نہ رہ گئے ہوں۔ خدا سے دعا کریں کہ میرا شک بے بنیاد ثابت ہو۔ (آمین)

O☆O

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حادثہ یا قتل

پتھر کی وہ سڑک جو دو رویہ درختوں کے سائے میں رہتی تھی' سامنے والے مکان میں جاتی تھی۔ یہ مکان دو بھائیوں' لوتھر ٹرانٹ اور کارل ٹرانٹ کی ملکیت تھا۔ آج اس مکان میں خلاف معمول بھیڑ تھی۔ کیونکہ قرب و جوار کے لوگ لوتھر ٹرانٹ کی تجہیزد تکفین میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے تھے۔ جو ایک حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔

اسی سڑک کے درمیان جولیانہ پریشان سی کھڑی تھی۔ پریشان اس وجہ سے تھی کہ وہ اپنا گھوڑا بجائے باہر چھوڑنے کے غیر شعوری طور پر اندر لے آئی تھی۔ آدھے راستے پر پہنچ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ گھوڑے سے اتر کر لگام پکڑے کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ فیشن کے مطابق وہ شہسوار کا سیاہ لباس پہنے تھی۔ سیاہ گھنے بال ہوا سے اڑ کر برابر اس کے رخساروں پر آ رہے تھی۔ جن کو بار بار وہ ہاتھ سے ہٹا دیتی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کچھ پریشانی جھلک رہی تھی۔ شیفر اور ہملٹن جیسے ہی سڑک پر آئے۔ ان کی نظریں لڑکی پر پڑیں۔ "یہ تو جولیانہ ہے۔" شیفر نے لڑکی کو پہچان کر کہا۔ "خدا نے اس کو جائیداد سے بہتر ورثہ عطا کیا ہے' شباب!"

"یہ دونوں کی حقدار تھی۔" ہملٹن نے جواب دیا۔ "اس کی جائیداد غصب کرلنے بدترین فعل تھا۔ میں نے اس کے مقدمے میں انتہائی کوشش کی۔ لیکن وصیت نامے مر

انونی سقم کی وجہ سے میں اور عدالت دونوں بے بس ہوگئے۔"

"اس عدالتی فیصلے کے بعد بھی میں اس کو ڈاکو سمجھتا ہوں۔" شیفر نے مکان کی رف اشارہ کرکے کہا۔ "کیونکہ اس نے قانون کو غلط طور پر استعمال کرکے ناجائز فائدہ ٹھایا ہے۔ اگر مجھ میں طاقت ہوتی تو میں زبردستی اراضی چھین لیتا۔ لیکن تمہارا قانون مانع ہے۔"

"آخر اس نے بے ایمانی سے کیا فائدہ اٹھایا۔ اب قبر کے انتظار میں پڑا ہوا ہے نہیں اس کو معاف کر دینا چاہیے۔"

"میں مردے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ وہ تو اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے خدا کے سامنے پہنچ چکا۔ میں تو اس کے بھائی کا ذکر کر رہا ہوں جو زندہ ہے۔"

دونوں آدمی باتیں کرتے ہوئے وہاں تک پہنچ گئے جہاں جولیانہ کھڑی تھی۔ "ہیلو ؤلیانہ!" شیفر نے لڑکی سے کہا۔ "کیسی ہو؟ میں نے تم کو اس وقت سے نہیں دیکھا جب م میری چھڑی کے برابر تھیں۔"

"مجھے یاد ہے۔" لڑکی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ ڈیڈی کے ساتھ وہاں رآمدے میں بیٹھا کرتے تھے۔"

"بے شک۔" شیفر کی آواز میں افسوس اور ہمدردی تھی۔ "مگر تم کیسے آگئیں۔"

"درحقیقت مجھے مرنے والے سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ میرا جی چاہا کہ اپنا پرانا مکان جہاں میں پیدا ہوئی اور جو کبھی میری ملکیت بھی رہ چکا ہے' دیکھ آؤں۔ کیونکہ تمام لوگ تدفین میں شرکت کرنے آ رہے تھے لہٰذا موقع کو غنیمت سمجھ کر چلی آئی۔"

لڑکی نے اپنا ہاتھ شیفر کے بازو پر رکھ دیا جس کو وہ اپنا سچا ہمدرد سمجھتی تھی۔ شیفر بھی جولیانہ کی باتوں سے متاثر تھا اور ماضی کا ایک ایک واقعہ اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔ آخر اس نے کہا۔ "میری بچی گھوڑے کو یہیں چھوڑو اور میرے ساتھ اندر چلو۔ تم کو اس مکان میں جانے کا مجھ سے زیادہ حق ہے۔ مجھے بھی مرنے والے سے ذرہ برابر ہمدردی نہیں ہے کیونکہ اگر زندگی میں کوئی عزت کا مستحق نہیں ہے تو مرنے کے بعد کیسے ہو سکتا ہے؟"

جس روز سے دونوں بھائیوں نے اس جائیداد پر بے ایمانی سے قبضہ کیا تھا کسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے، مرحوم لوتھر کا بس ایک ہی مشغلہ تھا۔ وہ اپنی پرانی ناکارہ بندوق سے چرندوں، پرندوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ جیسے ان تمام جانوروں نے اس کا کوئی قصور کیا تھا۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ وہ اپنی بندوق صاف کررہا تھا۔ اس میں ایک کارتوس تھا جس کا اسے خیال نہیں رہا۔ چنانچہ بندوق چل گئی۔ چھروں نے اس کے چہرے کو بری طرح زخمی کر دیا اور اسی وقت اس کا کام تمام ہوگیا۔ دونوں بھائیوں کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ لوتھر بد سرشت مغلوب الغضب اور بڑا ظالم انسان تھا۔ برخلاف اس کے کارل ٹرانٹ بہت خاموش قسم کا انسان تھا اور چپکے چپکے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنایا کرتا تھا۔ اگرچہ موت اس کے تصور میں بھی نہیں تھی پھر بھی اپنی تدفین کے لیے صندوق اور کپڑے تیار کرا کے رکھ لیے تھے کہ ضرورت پڑنے پر کام آئیں۔

تینوں پتھریلی سڑک پر مکان کی طرف بڑھے۔ قرب و جوار کے تمام لوگ لوتھر کی تدفین میں شرکت کرنے آئے ہوئے تھے۔ جولیانہ چاہتی تھی کہ باہر ہی رہے جہاں سے وہ اپنے پرانے باغ کا منظر دیکھ سکے جس کے لیے وہ خاص طور پر آئی تھی لیکن شیفر اسے اپنے ساتھ مکان میں لے گیا مجمع کافی تھا اور لوگ خاموشی سے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔

تینوں آدمی تھوڑی دیر تک تابوت کے پاس کھڑے رہے جس میں لوتھر کی لاش تھی۔ ماتھے کے چاروں طرف کا حصہ بڑے چھروں سے بری طرح چھلنی تھا۔ جس سے چہرہ بھیانک ہوگیا تھا۔ لیکن آنکھیں اور ان کے نیچے ناک تک کا حصہ زخموں سے محفوظ تھا جو اپنی اصل حالت میں تھا اور آسانی سے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ مرحوم کس قدر تند خو تھا

اب اسے انتہائی محبت و خلوص کہیے یا بھائی کو آخری خدمت انجام دینے کی خواہش کہ کارل نے لاش کو کسی کا ہاتھ نہیں لگنے دیا تھا اور اپنے ہاتھ سے وہ کپڑے پہنائے جو خود اپنی تدفین کے لیے تیار کرائے تھے۔ کپڑے پہنانے کے بعد اسے خیال آیا کہ ہاتھ برہنہ ہیں۔ چنانچہ تلاش کرنے پر گھر میں پرانے دستانے ملے جن کو اپنے ہاتھ سے دھو کر جہاں جہاں ان میں سوراخ وغیرہ تھے ان کو خود ایسی عمدگی سے رفو کیا کہ عیب دور ہو کر ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا۔ اور جب لاش اچھی طرح سے سجا بنا چکا تو سب کے دیکھنے کے لیے رکھ دی۔ لاش کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوجاتا تھا کہ کارل پر اپنے بھائی کی جدائی کا کس قدر صدمہ ہے۔ کچھ تو فطرت نسوانی اور کچھ لاش کے دلدوز منظر نے جولیانہ کے دل پر

ایسا اثر کیا کہ انتہائی نفرت کے باوجود اس کے آنسو نکل آئے۔ وہ بھول گئی کہ مرحوم اور اس کے بھائی نے اس کے ساتھ کس قدر ظلم کیا ہے اس وقت اس کو مرحوم پر اس لیے رحم آرہا تھا کہ وہ مرچکا تھا اور کارل پر اس لیے ترس آرہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے غم میں مبتلا ہے۔ شیفر کے بازو پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی جو خود بھی لاش دیکھنے میں محو تھا۔ جولیانہ نے دستانوں کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ کس قدر خلوص و محبت کا اظہار ہورہا ہے۔

"میری بچی۔" شیفر نے کہا۔ "ان دستانوں میں کوئی ایسی خاص بات ضرور ہے جس نے تم کو متاثر کیا اور شاید یہی کارل پر بھی اثر انداز ہو اسی لیے اس نے اس محنت سے رفو کیا ہے، چلو اس کی حالت بھی چل کر دیکھیں، ہملٹن تم بھی ساتھ آؤ۔"

"میرے ساتھ چلنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"رنج و غم انسان کے دل میں نرمی پیدا کرتے ہیں۔ شاید کارل کو اس وقت ترس آجائے اور شاید اس بچی کی جائیداد واپس کر دے ایسی حالت میں تم کو دستاویز تحریر کرنا پڑے گی۔"

"خدا کے لیے شیفر ہوش کی باتیں کرو یہ سائنس کا دور ہے معجزوں کا نہیں۔"

"بہرحال تم میرے ساتھ چلو تاکہ معجزہ دکھانے میں میری مدد کرو۔" شیفر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

تینوں آدمی کمرے سے نکل کر زینہ چڑھ گئے۔ جولیانہ کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو تھے۔ سب لوگ اوپر ایک بڑے ہال میں پہنچ گئے جہاں ایک بھاری بھرکم شخصیت کرسی میں خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی اور نظریں نیچے باغ کے درختوں پر لگی ہوئی تھیں۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں.... "ہملٹن، شیفر اور مس جولیانہ" کارل نے مغموم لہجہ میں کہا "تدفین میں آپ لوگوں کی شرکت سے یقیناً مرحوم کی روح خوش ہوگی۔"

"نہیں کارل اس میں مرحوم کا کوئی سوال نہیں ہے۔" شیفر نے جواب دیا۔ "بلکہ ہم تو تمہارے ساتھ انصاف کرنے آئے ہیں۔"

کمرہ کافی بڑا تھا۔ ایک گوشہ میں ایک میز اور کرسی رکھی ہوئی تھی جس پر کافی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مقدار میں سادہ کاغذ' روشنائی اور قلم رکھا ہوا تھا۔ عین میز کے اوپر دیوار میں دو فریم آویزاں تھے۔ ایک میں غصب شدہ علاقے کا نقشہ بمعہ حدود اربعہ تھا اور دوسرے میں عدالتی فیصلہ جس کی رو سے یہ علاقہ دونوں بھائیوں کے قبضہ میں آیا تھا۔

"یہ بھی بہت مناسب خیال ہے۔" کارل نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ ایک عرصہ سے آپ لوگوں نے ہم کو نظرانداز کررکھا تھا اگر تلافی کے طور پر اس وقت بھی آپ میرے ساتھ انصاف سے کام لیں تو اس صدمہ عظیم میں میری کافی تسلی ہوجائے گی۔"

ہملٹن کو اپنی ہنسی روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ جولیانہ غور سے کارل کی گفتگو سن رہی تھی۔ شیفر خاموش سنجیدگی کے عالم میں کھڑا تھا۔

"آپ کی بے اعتنائی اور بیگانگی سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں۔" کارل نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ "آپ دونوں حضرات یہاں سے بہت قریب رہتے ہیں۔ لیکن کبھی میری خبر لینے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ہم دونوں بھائی دور دراز کے علاقہ سے آکر آپ کے پڑوس میں آباد ہوئے تھے امید تھی کہ آپ سے خوشگوار تعلقات رہیں گے۔ دکھ درد میں ایک دوسرے کا ساتھ رہے گا۔ لیکن آپ نے کبھی ادھر کا رخ بھی نہ کیا۔ یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔"

اس نے بیٹھے بیٹھے ہی تینوں کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میں آپ کی تعظیم کے لیے کھڑا نہیں ہوا۔" اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "امید ہے کہ آپ لوگ میری پریشان خاطری کے پیش نظر اس بے ادبی کو نظرانداز کر دیں گے۔"

شیفر جہاں کھڑا تھا اسی سنجیدگی سے کھڑا رہا۔ ہملٹن نے جولیانہ کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود اس کے پیچھے کرسی پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہوگیا۔

"کارل!" شیفر نے کہا۔ "مجھے بے حد خوشی ہے کہ تمہارا دل اب نرم ہوگیا ہے۔"

"میرا دل؟ نرم ہوگیا؟" اس نے تعجب سے کہا۔ "مجھ سے زیادہ نرم دل تو خدا نے کسی کو پیدا ہی نہیں کیا۔ میں ایک چڑیا کو بھی مارنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ ہاں میرا بھائی

بے شک بہت سخت دل تھا۔ ہر وقت بندوق لیے شکار کی تلاش میں پھرا کرتا تھا۔ لیکن میرا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔"

"اور جانوروں پر ظلم کرنے کا بدلہ اس کو مل ہی گیا۔" ہملٹن نے کہا۔ "بھلا اس حادثہ کو حماقت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"اس نے بے احتیاطی کی انتہا کر دی۔ میں نے ہمیشہ اسے سمجھایا کہ بہت احتیاط سے بندوق صاف کیا کرے لیکن اس کو تو جیسے بندوق سے خوف ہی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ جس طرح سدھانے والے درندوں سے اور سپیرے سانپ سے نڈر ہوجاتے ہیں۔"

کارل جواب ہملٹن کی بات کا دے رہا تھا۔ لیکن اس کی نظریں شیفر اور جولیانہ پر تھیں۔ "شیفر اور ہملٹن" اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی "مجھے اس پریشان خاطری میں تسلی دینے کی خاطر آپ نے جو زحمت کی اس کا میں بے حد شکر گزار ہوں۔ لیکن مس جولیانہ نے شرافت و ہمدردی کی انتہا کر دی۔ سن رسیدہ لوگ قانون اور انصاف کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک بچہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ مس جولیانہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کے باپ کی جائیداد جو ان کے خیال میں ان کی ملکیت ہونا چاہیے تھی۔ ہم لوگوں نے بے ایمانی سے اس پر قبضہ جمالیا اور ان کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ وہ یہ چیزیں نہیں سمجھ سکتیں کہ عدالت نے ان کے باپ کی تحریر کردہ وصیت نامہ کے مطابق فیصلہ کیا ہے۔ ان سب چیزوں کے پیش نظر مس جولیانہ کا میری پرسش کے لیے آنا ایک بہت بڑا احسان ہے۔"

"کارل۔" شیفر نے کہا۔ "میں تمہیں اس معقولیت کی حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کیونکہ ہملٹن اب تلخی کے بجائے ایک خوشگوار ماحول میں دستاویز تیار کرے گا۔"

"کیسی دستاویز؟" کارل نے گھبرا کے پوچھا۔

"ابھی ہملٹن اس کام کو انجام دیے دیتا ہے۔ اور تم دیکھ کر دستخط کر دینا۔"

"لیکن میں درخواست لکھنے تو نہیں آیا ہوں۔" ہملٹن نے شیفر سے کہا..... "تم صرف اسی لیے یہاں آئے ہو۔" شیفر نے میز کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "کارل نے تمام ضروری چیزیں تمہارے لیے مہیا کر دی ہیں۔ میز پر کاغذ قلم اور دوات موجود ہے۔ تمہاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آسانی کے لیے علاقہ کا نقشہ معہ حدود اربعہ دیوار پر آویزاں ہے۔ عدالت کا فیصلہ بھی فریم میں لگا ہوا ہے۔ اب تم اپنا کام شروع کر دو۔"

شیفر کی آواز میں ایسی سنجیدگی تھی کہ ہملٹن لکھنے کی خاطر میز کی طرف بڑھا۔ پھر اس حکم کی حماقت کو محسوس کر کے اسے غصہ آگیا۔

"لیکن آخر کس قسم کی دستاویز تم لکھوانا چاہتے ہو۔" اس نے تعجب سے کہا۔

"دستاویز کسی کی طرف سے ہوگی؟ کس کے حق میں لکھی جائے گی؟ کس چیز کے بارے میں ہوگی۔"

"انتقال جائیداد کا اقرار نامہ عدالتی فیصلہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ دستاویز کارل ٹرانٹ کی طرف سے تحریر کی جائے گی اور مس جولیانہ کے حق میں ہوگی۔ سبب انتقال جائیداد خلوص و ہمدردی۔"

کارل شیفر کی تجویز سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اپنی گردن کو اِدھر اُدھر جنبش دی۔ آنکھوں میں خاص قسم کی چمک پیدا ہوگئی ایک گہرا سانس لینے کے بعد اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میرے کرم فرماؤ! آپ اس قدر عجلت سے کام نہ لیں اس قسم کی کوئی دستاویز تیار نہیں کی جائے گی۔"

"ہملٹن!" شیفر نے اسی لہجہ میں کہا "تم لکھنا شروع کرو مجھے آج یہ کام ختم کرنا ہے۔"

"لیکن اس حماقت ــ کام سے کیا فائدہ جب کہ کارل دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

جب تم لکھ چکو گے تو وہ دستخط کر دے گا تم اپنا کام شروع کرو۔"

"لیکن شیفر....."

"تمہارا کام صرف ، تاویز تحریر کرنا ہے۔" شیفر نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "بقیہ چیزیں میری ذمہ داری ہیں۔"

شیفر کے حکم میں ایسا زور تھا کہ ہملٹن نے اس کی ہدایت کے مطابق دستاویز لکھنا شروع کر دی۔ کارل مسکرا مسکرا کر تمام کارروائی دیکھ رہا تھا اور جب دستاویز مکمل ہوگئی تو

شیفر نے نہایت نرمی سے کہا۔

"کارل مجھے امید ہے کہ میری درخواست قبول کرتے ہوئے تم دستخط کر دو گے۔"

"کیا تم نے مجھے بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔" کارل نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ لیکن لہجہ میں تیزی تھی۔

"میں تم کو قطعی بے وقوف نہیں سمجھتا اور اسی وجہ سے دستخط کرنے کو کہہ رہا ہوں۔"

اب غصہ کے مارے کارل کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ چہرے سے خونخواری ٹپکنے لگی۔

"دستخط؟" اس نے نہایت نفرت و حقارت سے کہا "بیوقوف! گدھے! پاگل! میں اپنی جائیداد کیوں منتقل کر دوں۔"

"بہت سی وجوہ ہیں۔" شیفر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "چنانچہ ایک وجہ تو یہی ہے کہ جائیداد تمہاری نہیں ہے۔ تم نے وصیت نامہ میں ایک قانونی سقم کی وجہ سے اسے حاصل کیا۔ اور اب جس قدر فائدہ تم حاصل کر چکے ہو اسی پر اکتفا کرو۔"

"تم اپنے وعظ و پند سمیت یہاں سے دور ہو جاؤ۔" اس نے انتہائی غصہ میں کہا۔ میں تمہاری بکواس سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"اگر تمہارے نزدیک یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہے تو پھر ہم لوگوں کی خاطر سے انسانیت و شرافت کے نام پر اس یتیم بچی کے مصائب کا خیال کر کے دستخط کر دو۔"

"یہ سب چیزیں لغو اور مہمل ہیں۔" کارل نے اپنے غصہ کو دباتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ مجھے تم نہایت نامعقول اور ضدی انسان معلوم ہوتے ہو۔"

"ضدی تو میں بے شک ہوں۔" شیفر کے لہجہ میں اچانک خوفناک قسم کی تبدیلی آچکی تھی۔ "اور اگر تم میری یہ ضد پوری نہیں کرو گے تو جس طرح تمہارا بھائی اس دنیا میں خالی ہاتھ آیا تھا اسی طرح تم خالی ہاتھ جاؤ گے۔"

"کیا کہا؟" کارل کی آواز میں لرزش تھی۔ "اس کا کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ تمہارا بھائی دستانے پہنے ہوئے دفن نہیں کیا جاسکتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیفر نے اپنی نظریں کارل پر جمادیں اس کے ارادے میں پختگی اور آواز میں تہدید تھی جس نے کارل پر جادو کا اثر کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا تمام جسم لرزنے لگا۔ گاڑھا پسینہ تیل کی طرح بہہ بہہ کر اس کے چہرے پر جمنے لگا۔ جیسے سورج کی گرمی سے برف کا پہاڑ پگھلنے لگتا ہے بڑی کوشش کے بعد اس کے حلق سے کپکپاتی ہوئی آواز نکلی

"شیفر کیا کوئی اور بھی یہی ارادہ رکھتا ہے؟"

"کسی دوسرے کے علم میں کوئی چیز نہیں ہے۔"

"میں درخواست کرتا ہوں کہ میرے بھائی کو اسی حالت میں دفن ہونے دو۔"

"بشرطیکہ تم میری درخواست کو رد نہ کرو اور خاموشی سے دستخط کر دو۔"

"بہتر ہے۔ دستاویز لاؤ میں دستخط کر دوں۔"

کارل نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دستاویز پر دستخط کیے جولیانہ فرط حیرت و مسرت سے شیفر سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔ ہملٹن بت بنا ہوا شیفر کو دیکھ رہا تھا۔ لیکن کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ تینوں خاموشی سے کمرہ سے نکل آئے۔ شیفر نے دستاویز جولیانہ کو دے دی اور اس کے جانے کے بعد ہملٹن نے شیفر سے دریافت کیا۔

"خدا کے لیے بتاؤ کہ کارل دستانوں کے ذکر سے کیوں لرز گیا؟"

"کیونکہ اس نے اپنے سامنے ملک الموت کو دیکھا۔" شیفر نے جواب دیا۔ "تم نے دیکھا ہوگا کہ مرحوم کا چہرہ چاروں طرف سے بندوق کے چھروں سے زخمی تھا اور درمیانی حصہ پر کوئی خراش نہیں تھی۔"

"اس میں کیا خاص بات ہوئی یہ تو حادثہ تھا۔"

"یہ قطعی طور پر حادثہ نہ تھا چہرہ کا درمیانی حصہ اس وجہ سے زخمی نہ تھا کہ لوتھ نے جس وقت دیکھا کہ اس کا بھائی اس پر بندوق چلانے والا ہے اس نے اپنے چہرے دونوں ہاتھ رکھ لیے چنانچہ اس کے ہاتھوں کی پشت زخمی ہوئی۔ جس کو کارل نے دستانوں سے پوشیدہ کر دیا تھا کہ کوئی سمجھنے نہ پائے۔ لیکن میرے ذہن میں یہ بات اس کا چہرہ دیکھ ہی آگئی تھی۔ یہ سب خدائی کام ہیں حق بحقدار رسید!"

○☆○

خواب یا حقیقت

جو واقعات میں بیان کرنے چلا ہوں' وہ سو فیصد حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہ خود میرے ساتھ پیش آئے اور ان کے بارے میں میری یادداشت اتنی غیر مبہم ہے کہ جیسے یہ گزشتہ کل ہی پیش آئے ہوں' تاہم اس رات کو گزرے پورے بیس برس ہو چکے ہیں۔ ان بیس برسوں کے دوران میں نے یہ کہانی کسی دوسرے شخص کو نہیں سنائی۔ اب بھی اسے سناتے ہوئے میں جس تامل کا شکار ہوں' مجھے اس پر قابو پانا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ اس دوران میں آپ سے ایک ہی بات کا خواستگار ہوں گا کہ آپ اپنے اخذ کردہ نتائج مجھ پر ٹھونسنے سے پرہیز کریں گے۔ میں نہ تو کسی نوع کی وضاحت میں پڑوں گا اور نہ ہی کسی قسم کی بحث میں الجھنا پسند کروں گا۔ کہانی میں پیش آنے والے عجیب و غریب واقعات کے حوالے سے میرا ذہن ایک نتیجہ اخذ کر چکا ہے اور میں اپنے حواس کی شہادت پر انحصار کرتا ہوں۔

یہ بیس برس پہلے کا ذکر ہے۔ پرندوں کے شکار کا موسم ختم ہوئے ایک دو روز ہی ہوئے تھے میں اپنی شکاری بندوق کے ساتھ صبح سے باہر تھا لیکن کچھ حاصل نہ ہوا تھا۔ یخ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوربی ہوا متوقع تھی۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ جگہ تھی شمالی انگلینڈ کا ٹھٹھرا دینے والا وسیع و عریض سنسان میدان! میں اپنا راستہ گم کر چکا تھا۔ راستہ گم کرنے کے لیے یہ کوئی خوشگوار جگہ نہ تھی کیونکہ برف کا طوفان کسی بھی لمحے آ سکتا تھا اور چاروں جانب سے شام کی تاریکی بھی اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ میں نے آنکھوں پر اپنے ہاتھ کا چھجا بنایا اور بڑھتے ہوئے اندھیرے میں بڑی بے چینی سے اس طرف نگاہیں جما دیں جہاں ارغوانی میدان ایک زیریں پہاڑی سلسلے میں مدغم ہو جاتا تھا اور جو دس یا بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ دور دور تک نہ تو دھوئیں کی کوئی ہلکی سی لکیر تھی' نہ کوئی رتی برابر کاشت شدہ زمین اور نہ کوئی مویشی راستہ۔ میں نے یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے چاروں طرف اپنی نگاہیں دوڑائیں مگر بے سود! میرے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ چلتا چلا جاؤں اور خوش قسمت اگر راستے میں کوئی پناہ گاہ مل جائے تو وہاں قیام کروں۔ چنانچہ میں نے بندوق پھر سے کندھے پر لٹکائی اور بدقت آگے بڑھنے لگا کیونکہ میں صبح سے پیدل چل رہا تھا اور ناشتے کے بعد سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

اس دوران برف باری ایک ناگوار تواتر سے ہونے لگی۔ سردی میں شدت پیدا ہو گئی اور رات نہایت تیزی سے قریب آنے لگی۔ آسمان پر تاریکی جیسے جیسے بڑھ رہی تھی میرے امکانات بھی سیاہ ہو رہے تھے اور یہ سوچ کر دل میں ہول اٹھتے تھے کہ میری جوان بیوی ہمارے چھوٹے سے گھر کی کھڑکی میں بیٹھی میری راہ تک رہی ہوگی اور وہ ساری رات میرے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہے گی۔ ہماری شادی کو ابھی چار مہینے ہوئے تھے۔ ہم نے موسم خزاں بالائی علاقے میں گزارا تھا اور اب ایک چھوٹے سے قدیم گاؤں میں رہ رہے تھے جو اس وسیع و عریض میدان کے کنارے پر واقع تھا۔ ہم میاں بیوی ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور یقینی بات ہے کہ خوشیوں بھری زندگی گزار رہے تھے۔ آج صبح جب ہم جدا ہوئے تو اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ جھٹ پٹے سے پہلے لوٹ آؤں اور میں نے لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اب اگر میں اپنا وعدہ نہیں نبھا سکا تو کیا!

اور اب اس پریشانی کے عالم میں بھی میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ رات نے کہاں ایک گھنٹے کے آرام اور کسی گائیڈ کے مل جانے پر میں آدھی رات ہونے سے پہلے پہ

اپنی بیوی کے پاس پہنچ سکتا ہوں۔ اگر صرف ایک رہنما اور ایک پناہ گاہ مل جاتی تو بھی ایسا ممکن تھا۔

میری ان سوچوں کے دوران اس تمام عرصے میں برف گرتی اور رات گہری ہوتی گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میں چلتے چلتے رک جاتا اور مدد کے لیے چیختا' لیکن لگتا تھا کہ میری چیخوں سے سکوت مزید گہرا ہو رہا ہے۔ پھر بے چینی کا ایک مبہم سا احساس مجھ پر چھا گیا اور مجھے ان مسافروں کی کہانیاں یاد آنا شروع ہو گئیں جو اس طرح کے برفانی موسم میں چلتے گئے' نڈھال ہوتے گئے' پھر تھک کر گر پڑے اور اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا اتنی طویل رات میں برف باری کے دوران ایسے چلتے چلے جانا ممکن ہے؟ کیا ایسا لمحہ نہیں آئے گا جب میری ٹانگیں جواب دے جائیں گی اور میرا عزم متزلزل ہو جائے گا؟ پھر میں بھی کہانیوں والے مسافروں کی طرح موت کی نیند سو جاؤں گا۔ موت! اس خیال ہی سے مجھے جھرجھری آ گئی۔ ایسے میں جبکہ زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے سامنے تھی' مرنا کس قدر مشکل ہے! میری محبوب بیوی کے لیے کس قدر مشکل ہوگا۔ جس کا محبت بھرا دل.......... اس سے آگے مجھ سے سوچا نہ گیا۔ ان خوفناک خیالوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے میں ایک بار پھر اپنی پوری قوت سے اور تا دیر چیخا۔ جب میں چپ ہوا تو بڑی بے تابی کے ساتھ کسی جانب سے جواب کی توقع میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ کیا میری چیخ کا جواب دیا گیا تھا؟ یا یہ محض میرا واہمہ تھا کہ جواب میں کہیں دور سے کوئی آدمی چیخا ہے؟ میں نے پھر ہانک لگائی' پھر لگائی اور بازگشت گونجی پھر اندھیرے میں اچانک دور ایک لرزتا ہوا شعلہ دکھائی دیا۔ یہ شعلہ کبھی اپنی جگہ بدلتا' کبھی غائب ہو جاتا اور کبھی نزدیک اور روشن تر محسوس ہوتا۔ میں نے پوری قوت سے اس شعلے کی طرف دوڑ لگا دی اور خوش قسمتی سے تھوڑی ہی دیر بعد ایک ایسے بوڑھے آدمی کے روبرو تھا جس کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی۔

"خدایا تیرا شکر ہے۔" میرے ہونٹوں سے بے اختیار کلمہ شکر ادا ہوا۔

بوڑھے نے آنکھیں جھپکتے اور ماتھے پر تیوریاں ڈالتے ہوئے اپنی لالٹین اٹھائی اور میرے چہرے کو گھورنے لگا۔

"کس بات کے لیے؟" وہ بڑے تکدر سے بولا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تمہارے لئے.......... میں تو اس خوف کا شکار ہو رہا تھا کہ اس برف میں ہمیشہ کے لیے کھو جاؤں گا۔"

"لوگ یہاں وقتاً فوقتاً گم ہوتے رہتے ہیں۔ تمہیں اس طرح گم ہونے سے کس نے روکا ہے؟ اگر خدا کو یہ منظور ہے تو کیا ہے؟"

"اگر خدا کو یہ منظور ہے تو تم اور میں اکٹھے گم ہو جائیں تو دوست ہمیں یہ بات تسلیم کر لینی چاہئے۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میں اب تمہارے بغیر گم نہیں ہونا چاہتا۔ یہ بتاؤ، وولڈنگ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"کم از کم بیس میل۔"

"اور قریبی گاؤں کتنی دور ہے؟"

"قریبی گاؤں وائیک ہے اور وہ دوسری طرف بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟"

"تھوڑی ہی دور۔ وہاں۔" اس نے کہا اور لالٹین کو ایک ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"میرے خیال میں تم بھی گھر ہی جا رہے ہو؟"

"شاید ایسا ہی ہے۔"

"تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ جا رہا ہوں۔"

بوڑھے آدمی نے نفی میں اپنا سر ہلایا اور لالٹین کے ہینڈل کے ساتھ اپنی ٹانگ رگڑی۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" وہ بڑبڑایا۔ "وہ تمہیں اندر نہیں گھسنے دے گا۔"

"دیکھا جائے گا۔" میں نے ترشی سے کہا اور پوچھا۔ "کون ہے وہ؟"

"میرا مالک!"

"کون مالک؟"

"تم اسے نہیں جانتے۔" اس نے تکلف برطرف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم مجھے راستہ بتاؤ۔ پھر میرا کام ہے کہ تمہارے مالک سے رات کے قیام و طعام کی اجازت لے لوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم کوشش کر دیکھنا۔" میرا رہنما پھر متامل لہجے میں بڑبڑایا اور اپنا

سر نفی میں ہلاتے ہوئے خواجہ خضر کی طرح، بھدی چال سے چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اندھیرے میں کسی مکان کا ہیولا دکھائی دینے لگا اور پھر ایک بڑا سا کتا دوڑتا ہوا باہر آیا اور زور زور سے بھونکنے لگا۔

"کیا یہی گھر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہی ہے۔" وہ چابی ڈھونڈنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ مارنے لگا۔

میں اس کے بالکل پیچھے جا کھڑا ہوا تاکہ اندر گھسنے کا موقع ضائع نہ کر بیٹھوں۔ میں نے لالٹین کی روشنی کے چھوٹے سے دائرے میں دیکھا کہ دروازے میں بے شمار آہنی کیلیں جڑی ہیں جیسے یہ کسی قید خانے کا دروازہ ہو۔ جیسے ہی بوڑھے نے چابی گھما کر دروازہ کھولا، میں اسے ایک جانب دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔

جب میں اندر داخل ہوا تو تجسس سے چاروں طرف دیکھا اور خود کو ایک بڑے ہال میں پایا جو بظاہر کئی مقاصد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ ایک کونے میں کسی کھلیان کی طرح ہال کی چھت تک مکئی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ دوسری جانب آٹے کی بوریاں، زرعی ساز و سامان، تھیلے اور ہر قسم کا متفرق کاٹھ کباڑ، عمارتی لکڑی وغیرہ۔ چھت کے شہتیروں پر دم پخت کیا ہوا خشک گوشت اور جڑی بوٹیوں کے گچھے لٹک رہے تھے تاکہ موسم سرما میں استعمال کئے جا سکیں۔ فرش کے وسط میں ایک بڑی سی چیز رکھی تھی جسے گندے کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے کپڑے کا ایک کونا اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ ایک خاصے بڑے سائز کی دوربین تھی جو چھوٹے چھوٹے چار پہیوں والے متحرک اسٹینڈ پر نصب تھی۔ ٹیوب رنگ شدہ لکڑی سے بنائی گئی تھی اور اسے دھاتی تاروں سے چاروں طرف سے بے ڈھنگے طریقے سے باندھا گیا تھا۔ نیم تاریکی میں جہاں تک میں اندازہ لگا پایا، اس کا قطر کم از کم پندرہ انچ تھا۔ اسی دوران کہ جب میں دوربین کے ملاحظے میں منہمک تھا اور اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا کہ آیا یہ کسی خودساختہ ماہر بصریات کا کارنامہ ہے، گھنٹی بجنے کی تیز آواز گونجی۔

"یہ گھنٹی تمہارے لیے ہے۔" میرے بوڑھے رہنما نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ "وہ رہا اس کا کمرہ۔"

اس نے ہال کی مخالف سمت میں دکھائی دینے والے سیاہ رنگ کے چھوٹے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے ہال عبور کیا' دروازہ ذرا زور سے کھٹکھٹایا او
اجازت ملنے کا انتظار کیے بغیر اندر چلا گیا۔ ایک لحیم شحیم سفید بالوں والا بوڑھا شخص میز
عقب سے نمودار ہوا۔ میز مختلف قسم کی کتابوں اور کاغذات سے اٹی پڑی تھی۔ اس
نہایت درشتی سے میرا خیرمقدم کیا۔

"کون ہو تم؟" اس نے پوچھا۔ "یہاں کیسے آئے؟ کیا چاہتے ہو؟"

"جیمز مرے' بیرسٹرایٹ لاء۔ راستہ بھول گیا ہوں۔ کھانا پینا اور سونا ہے۔"

اس نے ابرو سکیڑے اور ماتھے پر تیوریاں ڈال لیں۔

"میرا گھر کوئی تفریح گاہ یا ہوٹل نہیں۔" اس نے درشتی سے کہا۔ "جیکب! تم
اس اجنبی کو اندر لانے کی جرات کیسے کی؟"

"میں اسے اندر نہیں لایا۔" بوڑھا بدبدایا۔ "یہ میرے پیچھے پیچھے آیا اور مجھے
مارتا ہوا مجھ سے پہلے گھر کے اندر آ گیا۔ چھ فٹ دو انچ کے آدمی سے اب میرا کیا مقابلہ۔"

"تو جناب! آپ کس حق کے تحت' کون سی بنیاد پر میرے گھر میں بلا اجازت دا
ہوئے ہیں؟"

"وہی حق جو ڈوبتے وقت مجھے آپ کی کشتی کو تھامنے کے لیے حاصل ہو جاتا
خود حفاظتی کا حق!"

"خود حفاظتی؟"

"زمین پر ایک انچ کی برف کی چادر بچھ چکی ہے۔" میں نے مختصراً جواب د

"اور صبح تک اتنی برف پڑ چکی ہوگی کہ میری لاش ڈھانپ سکتی ہے۔"

وہ کھڑکی کی طرف گیا' بھاری سیاہ پردہ ایک طرف ہٹایا اور باہر دیکھنے لگا۔

"درست کہتے ہو۔" وہ بولا۔ "تم چاہو تو یہاں صبح تک ٹھہر سکتے ہو۔ جیکب
لاؤ۔"

وہ پھر سے اپنی نشست پر جا بیٹھا اور اپنے آپ میں مگن ہو گیا۔ وہ دوبارہ ا
کاغذات کے مطالعے میں غرق ہو گیا تھا جہاں سے میں نے اسے ڈسٹرب کیا تھا۔

میں نے اپنی بندوق ایک کونے میں رکھ دی اور کرسی آتش دان کے قریب کھ
اور خود کو ڈھیلا چھوڑ کر اردگرد کے جائزے میں منہمک ہو گیا۔ ہال کی نسبت اس کمر

گی ہوئی چیزیں کم ناموافق اور چھوٹی تھیں' تاہم اس میں جو کچھ بھی تھا' میرے تجسس
ہوا دینے کے لیے کافی تھا۔ فرش پر قالین نہیں تھا۔ دیواروں پر سفیدی کی گئی تھی اور
ے کچھ حصے عجیب و غریب ڈایا گراموں جبکہ کچھ حصے شیلفوں سے ڈھکے ہوئے تھے جن
فلسفیانہ قسم کے اوزار تھے۔ ان میں بیشتر کے استعمال سے میں ناواقف تھا۔ آتش دان
ایک جانب ایک بک کیس تھا جو میلی کچیلی بدرنگ کتابوں سے بھرا ہوا تھا۔ دوسری
ب ایک چھوٹا سا باجا رکھا تھا جس پر قرون وسطیٰ کے دیوتاؤں اور شیطانوں کی نہایت
دار رنگین منبت کاری کی گئی تھی۔ کمرے کے پرلے کونے میں رکھی الماری کے نیم وا
وازے میں سے میں نے ارضیاتی نمونوں' سرجیکل آلات' کٹھالیوں' گلانے کے برتنوں'
نچ شیشوں' قرنبیقوں اور کیمیائی محلول کے جاروں کی ایک لمبی قطار دیکھی جبکہ میرے
ں مینٹل شیلف پر دیگر چھوٹی چھوٹی چیزوں کے درمیان نظام شمسی کا ماڈل پڑا تھا۔ اس
ے ساتھ ایک چھوٹی سی برقی بیٹری اور خوردبین رکھی تھی۔ ہر کرسی پر اس کے حصے کا
ان رکھا ہوا تھا۔ ہر کونے میں کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا' حتیٰ کہ فرش بھی نقشوں' خاکوں
ر کاغذات وغیرہ سے اٹا پڑا تھا۔

میں حیرانی سے ان سب چیزوں کو دیکھ رہا تھا۔ ہر نئی چیز پر نگاہ پڑتے ہی میری حیرت
ں اضافہ ہو جاتا۔ اس قدر عجیب و غریب کمرہ میں نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا
ا۔ اس سنسان اور ویران علاقے میں واقع فارم ہاؤس کے اندر ایسا کمرہ تو اور بھی حیرانی
کی بات تھی۔

میں اپنے میزبان سے نظریں ہٹا کر کبھی گرد و نواح میں دیکھتا اور کبھی گرد و نواح
ے نظریں ہٹا کر تعجب سے اپنے میزبان کو دیکھنے لگتا۔ میرے اندر سے سوال اٹھتا کہ یہ
ص کون ہے اور اس ویرانے میں کیا کر رہا ہے؟ اس کے سر کی تراش بہت عمدہ تھی'
کن یہ سر کسی فلسفی کی بجائے ایک شاعر کا لگتا تھا: کنپٹیاں کشادہ' آنکھیں نمایاں اور سر پر
اڑی کی طرح کے سفید بالوں کی افراط! اس کا سر بالکل بیتھوون کی طرح کا تھا۔ منہ پر
و گہری لائنیں اور ابروؤں کی کمان پر وہی کشیدہ چتونیں! ارتکاز کا تاثر بھی وہی تھا۔ میں
س کے جائزے میں منہمک تھا کہ دروازہ کھلا اور جیکب کھانا لے کر اندر آیا۔ یہ دیکھ کر
ر کے مالک نے کتاب بند کر لی' کرسی سے اٹھا اور پہلے سے زیادہ مہذب انداز سے مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھانے کی دعوت دی۔ انڈے، ڈبل روٹی اور شیری کی بوتل پر مشتمل کھانا میرے سامنے جما دیا گیا۔

"جناب! کوئی خاص اہتمام تو نہیں لیکن یوں سمجھئے کہ آپ کے لیے گھر جیسا کھانا ہے۔" میرے میزبان نے کہا۔ "امید ہے ہمارے نعمت خانے کی کمزوریوں کو آپ کی رغبت چھپا لے گی۔"

میں کھانا شروع کر چکا تھا۔ میں نے احتجاج کیا اور ایک اسپورٹس مین کے جذبے کے ساتھ کہا کہ میں نے اس سے لذیذ کھانا پہلے کبھی نہیں کھایا۔

وہ قدرے سختی سے آگے کو جھکا اور اپنے کھانے کے سامنے بیٹھ گیا جو کہ ایک پیالہ دودھ اور دلیئے کے ایک ڈونگے پر مشتمل تھا۔ کھانا ہم دونوں نے خاموشی سے کھایا۔ جب فارغ ہو چکے تو بوڑھے جیکب نے سامنے سے ٹرے اٹھا لی۔ میں نے اپنی کرسی آتش دان کے قریب گھسیٹ لی اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میرے میزبان نے بھی میری تقلید کی تھی اور پھر اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔

"میں گزشتہ تیئیس برسوں سے گوشہ نشینی کی یہ سخت زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اس دوران نہ تو میں نے اتنے اجنبی چہرے دیکھے ہیں اور نہ ہی کسی اخبار کا مطالعہ کیا۔ آپ وہ پہلے اجنبی شخص ہیں جس نے چار برس سے زائد عرصے کے بعد میری دہلیز پار کی ہے۔ کیا آپ ازراہ کرم اس بیرونی دنیا کے بارے میں مجھے کچھ معلومات فراہم کریں گے جس سے جدا ہوئے مجھے ایک زمانہ ہو چکا ہے؟"

"پلیز پوچھئے!" میں نے جواب دیا۔ "میں آپ کا خادم ہوں۔"

اس نے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی، آگے کو اس طرح جھکا کہ کہنیاں گھٹنوں پر اور ہتھیلیاں ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیں اور آگ کو گھورتے ہوئے مجھ سے استفسار کرنے لگا۔

اس کے زیادہ تر سوالات سائنسی معاملات کے بارے میں تھے۔ زندگی کے مقاصد پر اطلاق کے حوالے سے سائنس کی زمانہ حال کی ترقی کے بارے میں وہ بالکل لاعلم تھا۔ میں سائنس کا طالب علم نہیں تھا، اس لیے جہاں تک میری معلومات نے ساتھ دیا میں نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کوئی آسان بات نہ تھی، چنانچہ جب

استفسارات سے بحث مباحثے پر آ گئی اور وہ ان حقائق کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے لگا جو میں نے اس کے سامنے پیش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ بول رہا تھا اور میں متحیرانداز میں سن رہا تھا۔ وہ یوں خودکار انداز میں بول رہا تھا کہ مجھے یقین ہونے لگا کہ وہ میری موجودگی کو فراموش کر چکا ہے اور صرف بلند آواز میں سوچ رہا ہے۔ میں نے اس سے پہلے اس قسم کی باتیں نہیں سنی تھیں اور آج تک بھی اس قسم کی باتیں نہیں سنی ہیں۔ وہ تمام نظام ہائے فلسفہ سے آشنا تھا، اپنے تجزیوں میں بڑا نرم، اپنے نظریات میں بڑا بے باک! بغیر کسی رکاوٹ کے اس کے خیالات کا بہاؤ جاری رہا۔ ایک موضوع سے دوسرے موضوع، ایک امکان سے دوسرے امکان پر وہ کسی محو خواب شخص کی طرح خیال آرائی کرتا چلا گیا۔ عملی سائنس سے دماغی فلسفے تک اور تار میں دوڑتی بجلی سے لے کر رگوں میں رواں برق تک، واٹس سے مسمر، مسمر سے رین باخ، پھر سویڈن بورگ، اسپائی نوزا، کنڈیلاک، ڈیکارٹ، برکلے، ارسطو، افلاطون، میگی اور مشرق کے صوفی۔ یہ سب اپنی صنف اور دائرہ کار میں مختلف ہونے کے باوجود، اس کے ہونٹوں پر بہت آسان اور مانوس دکھائی دیتے تھے، جیسے موسیقی کے سر! مجھے نہیں معلوم کہ وہ قیاس یا اظہار کے کس رابطے سے وہ میدان بھی عبور کر گیا جو قیاسی فلسفے کی سرحد سے بھی پرے واقع ہے اور وہاں تک پھیلا ہوا ہے جہاں تک کسی آدم زاد کی رسائی نہیں۔ وہ روح اور اس کی تمناؤں، جذبے اور اس کی توانائیوں کے بارے میں، بصارت ثانی سے متعلق پیش گوئی اور ان کے مظاہر کے بارے میں باتیں کرنے لگا جنہیں ہر عہد کے شک پرستوں نے بھوتوں اور خیالی پیکروں کے نام پر رد کیا ہے اور ضعیف الاعتقادوں نے مان لیا ہے۔

"دنیا!" وہ کہنے لگا۔ "اس سب کے بارے میں ہر ساعت انسانی شکوک میں اضافہ کر رہی ہے جو اس کے اپنے محدود دائرے سے پرے واقع ہے اور ہمارے سائنسی ماہرین اس بڑے مہلک رجحان کی پرورش کر رہے ہیں۔ وہ ہر اس چیز کو فسانہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں جو تجربے کی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا اور ہر وہ چیز ان کے نزدیک جھوٹی قرار پاتی ہے جسے لیبارٹری میں لا کر چیک نہیں کیا جا سکتا یا اس کی چیرپھاڑ نہیں ہو پاتی۔ جہاں تک کہ خیالی پیکروں پر یقین کا تعلق ہے، کس توہم کے خلاف انہوں نے اتنی طویل اور ہٹیلی جنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھیڑ رکھی ہے اور یہی نہیں' آخر کس توہم نے انسانی ذہنوں پر اتنے عرصے سے اتنی سخت حرفت قائم کر رکھی ہے۔ مجھے تاریخ' طبیعات اور آثار قدیمہ میں کوئی ایک حقیقت ایسی دکھا دیجئے جسے اتنی وسیع اور متنوع شہادت کی حمایت حاصل ہو۔ اگرچہ اسے ہر نسل کے' ہر عہد کے اور ہر خطے کے انسان نے' قدیم زمانے کے اعتدال پسند فرزانوں سے لے کر زمانہ حال کے جارح ہوشمندوں تک جن میں عیسائی' بے دین اصنام پرست اور مادہ پرست شامل ہیں' اس مظہر کو محسوس کیا ہے لیکن ہمارے عہد کے فلسفی اسے آج بھی بچوں کی کہانی قرار دے دیتے ہیں۔ واقعاتی شہادت ان کے نزدیک اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جیسے توازن برقرار رکھنے کے لیے پرندے کا پر! علت و معلوم کا موازنہ جو کہ طبعی سائنس میں بڑی اہمیت کا حامل ہے' وہ اسے ناقابل اعتبار اور فضول کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ صائب الرائے گواہوں کی شہادت جو کہ عدالت میں فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے' ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ وہ جو بولنے سے پہلے ایک لمحے سوچنے کا تامل کرتا ہے' اسے وہ یاوہ گو سمجھتے ہیں۔ وہ جسے ان مظاہر پر یقین ہے' ان کے نزدیک احمق اور شیخ چلی ہے۔"

اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی' چنانچہ وہ چند منٹ تک خاموش رہا' پھر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور قدرے بدلے ہوئے انداز و آواز میں کہنے لگا:

"جناب! میں نے سوچ بچار کی' تحقیقات کی اور ان مظاہر پر یقین لے آیا اور جب دنیا کو اپنے اخذ کردہ نتائج کے بارے میں بتایا تو مجھے کوئی شرمندگی نہ تھی۔ مجھے بھی وہمی اور خبطی قرار دیا گیا اور میرے ہم عصروں میں میرا مذاق اڑایا گیا اور سائنس کے جس شعبے میں تحقیق پر میں نے اپنی زندگی کے سنہرے برس صرف کر دیئے تھے' اس کا مضحکہ اڑایا گیا۔ یہ سب کچھ صرف تئیس برس پہلے پیش آیا۔ اس کے بعد سے آج تک میں اس طرح رہ رہا ہوں جس طرح کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو اور دنیا مجھے بھول چکی ہے۔ میں بھی دنیا کو بھول چکا ہوں۔ یہ ہے میری کہانی!"

"بہت دکھ بھری کہانی ہے!" میں منمنایا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا جواب دوں۔

"یہ بہت عام سی کہانی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے سچ بولنے کی سزا کاٹی

ہے جیسا کہ اس سے پہلے مجھ سے بہتر اور عقلمند آدمی یہ سزا کاٹ چکے ہیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کھڑکی کی طرف چل دیا جیسے یہ ساری بحث ختم کرنا چاہتا ہو۔

"برف گرنا بند ہو گئی ہے۔" اس نے باہر دیکھ کر تبصرہ کیا اور پردہ گرا کر دوبارہ آتش دان کے پاس آ گیا۔

"بند ہو گئی!" میں نے خوشی اور بے تابی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ "اوہ! کیا یہ ممکن ہے.......... لیکن نہیں' بے سود ہے۔ اگر مجھے صحیح راستہ مل بھی جائے تو بھی راتوں رات بیس میل پیدل چل کر گھر نہیں پہنچ سکتا۔"

"بیس میل پیدل!" میرے میزبان نے تعجب سے میری بات دہرائی۔ "تم کس نہج سوچ رہے ہو؟"

"میں اپنی بیوی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے بے صبری سے جواب دیا۔ "اپنی جوان بیوی کے بارے میں جسے بالکل پتہ نہیں کہ میں راستہ بھول کر طوفان میں گھر گیا ہوں۔ اس وقت اس کے دل میں عجیب وسوسے گھر کر رہے ہوں گے۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"وولڈنگ میں جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔"

"وولڈنگ میں!" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "فاصلہ تو واقعی بیس میل ہی ہے لیکن کیا تم اگلے چھ سات گھنٹے بچانے کے بارے میں اتنے ہی بے چین ہو؟"

"بہت بے چین! اس قدر کہ ابھی ایک گھوڑا اور رہنما مل جائے تو دس گنی قیمت دے سکتا ہوں۔"

"تمہاری خواہش اس سے بھی کم قیمت پر پوری کی جا سکتی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شمال سے آنے والی رات کی ڈاک بگھی جو کہ وولڈنگ میں اپنے گھوڑے بدلتی ہے' یہاں سے پانچ میل کے فاصلے سے گزرتی ہے اور گھنٹے سوا گھنٹے میں ایک خاص چوراہے پر پہنچنے والی ہے۔ اگر جیکب تمہیں یہ برفانی میدان پار کرا دے اور تمہیں پرانی سڑک پر ڈال دے تو میرے خیال میں تم آسانی سے نئی سڑک تک جا پہنچو گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بڑی آسانی سے........... اور بخوشی!" میں نے جواب دیا۔

اس کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس نے گھنٹی بجائی اور جیکب کو ہدایا
دے کر کیمیائی محلولوں والی الماری سے گلاس اور قریب سے وہسکی کی بوتل اٹھا کر کہنے ل

"برف خاصی گہری ہے اور رات میں چلنا بہت دشوار ہوگا۔ آغاز سفر سے پہلے کیوں
ایک گلاس ہو جائے؟"

میں انکار کر دیتا' لیکن اس کے اصرار پر پی گیا۔ شراب کسی سیال آگ کی ط
میرے گلے کو کاٹتی چلی گئی اور جیسے میرا سانس بند ہو گیا۔

"یہ بہت تیز ہے۔" وہ بولا۔ "لیکن یہ سردی سے محفوظ رکھنے میں مددگار ثا
ہوگی اور اب تم وقت ضائع مت کرو۔ شب بخیر!"

میں نے اس کی مہمان نوازی پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ مصافحہ کرنا چاہتا تھا لیکن
دوسری جانب مڑ گیا اور میری بات میرے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے
نے ہال عبور کیا' جیکب نے میرے عقب میں بیرونی دروازہ مقفل کیا اور ہم کھلے
برفانی میدان میں نکل آئے۔

اگرچہ ہوا تھم گئی تھی لیکن ابھی تک سخت سردی تھی۔ ہمارے سر پر چھائی
محراب پر کوئی ایک ستارہ بھی ٹمٹما نہیں رہا تھا۔ کہیں سے کوئی آواز نہیں ابھر رہی
سوائے ہمارے اپنے قدموں کی دھپ دھپ کے جن کے نیچے چرمراتی ہوئی برف ز
کے گہرے سکوت کو درہم برہم کر رہی تھی۔ جیکب جو کہ اپنی اس ذمہ داری پر خو
دکھائی نہیں دے رہا تھا' آگے آگے ہاتھ میں لالٹین تھامے خاموشی سے چل رہا تھا۔
بھی کندھے پر بندوق ٹکائے اس کے پیچھے پیچھے تھا اور اس کی طرح میرا بھی کسی قسم
بات چیت پر دل مائل نہیں تھا۔ میری سوچیں میرے میزبان کے اردگرد گھوم رہی تھیں
اس کی آواز اب بھی میری سماعت میں گونج رہی تھی۔ اس کی فصاحت و خطابت اب
میرے تخیل کو اسیر کئے ہوئے تھی۔ مجھے آج کے دن تک بھی اس کی متاثر کن اور
میں اتر جانے والی باتوں کا ایک ایک لفظ یاد ہے۔ اس کے جملے' اس کے دلائل' اس
تصورات' اس کے نظریات! مجھے کوئی بات نہیں بھولی۔ میں اس کی باتوں کے خوش
تصور میں ڈوبا ہوا جیکب کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ کبھی کبھی چونک کر اردگرد نگاہ دوڑا لیتا

پھر اپنے خیالوں میں غرق ہو جاتا۔ آخرکار' مجھے تو یوں لگا کہ فقط چند منٹ بعد ہی جیکب
ایک مقام پر آ کر ٹھہر گیا۔ اس نے کرخت لہجے میں مجھ سے کہا:

"یہ رہا تمہارا راستہ! تمہارے دائیں ہاتھ پتھر کی یہ جو باڑھ ہے' اسے نہ چھوڑنا' تم
راستہ نہیں بھولو گے۔"

"تو کیا یہی وہ پرانی سڑک ہے جو آگے جا کر نئی میں شامل ہوتی ہے؟"

"ہاں' یہی وہ پرانی سڑک ہے۔"

"چوراہے تک پہنچنے کے لیے مجھے کتنا پیدل چلنا ہوگا؟"

"تقریباً تین میل!"

میں نے اپنا بٹوہ نکال لیا اور جیکب مجھے مزید معلومات فراہم کرنے لگا۔ "پیدل چلنے
والوں کے لیے یہ سڑک خاصی بہتر ہے' لیکن شمالی ٹریفک کے لیے یہ بڑی تنگ اور ڈھلوان
تھی۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ جہاں پر یہ دیوار ٹوٹی ملے' تم سائن پوسٹ کے نزدیک ہو
جانا۔ حادثے کے بعد سے اس کی آج تک مرمت نہیں کی گئی۔"

"کیسا حادثہ؟"

"برسوں پہلے ڈاک بگھی نیچے وادی میں گر گئی تھی۔ تقریباً پچاس فٹ کی گہرائی
میں!"

"میرے خدا! کتنے آدمی مارے گئے تھے؟"

"سب کے سب! چار تو موقع پر ہی دم توڑ گئے جبکہ دو شدید زخمی اگلی صبح مر
گئے۔"

"یہ حادثہ کتنے برس پہلے پیش آیا تھا؟"

"نو برس پہلے!"

"تم نے کہا سائن پوسٹ کے قریب؟ میں اسے یاد رکھوں گا۔ شب بخیر!"

"شب بخیر جناب! اور بہت بہت شکریہ!" جیکب نے میرا دیا ہوا سکہ جیب میں ڈالا'
اپنے ہیٹ کو چھونے کا خفیف سا اشارہ کیا اور واپس اپنے راستے پر چل دیا۔

میں اس کی لالٹین کی روشنی کو دیکھتا رہا تا آنکہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور پھر
میں مڑا اور اکیلا اپنی منزل کی طرف چل دیا۔ اب کسی نوع کی دشواری کا مسئلہ نہیں تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیونکہ چاروں طرف چھائے اندھیرے کے باوجود برف کی زرد سی چمک میں پتھر کی طویل باڑھ راہبر کا کام دے رہی تھی۔ ہر چیز کس قدر خاموش خاموش تھی سوائے میرے قدموں کی چاپ کے! کتنی خاموش اور کتنی تنہا! تنہائی کا ایک عجیب نامانوس احساس مجھ پر چھا گیا۔ میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ میری چال سے ایک لے سی پیدا ہو رہی تھی۔ میرے دماغ میں وہ ڈھیروں سوال چکرا رہے تھے جو میرے میزبان نے کیے تھے۔ میں نے انہیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور تھوڑی دیر کے بعد اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گیا۔

اسی دوران رات کی ہوا یخ سے یخ تر ہوتی چلی گئی اور اگرچہ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی لیکن میں خود کو گرم رکھنے میں ناکام تھا۔ میرے پاؤں برف ہو گئے تھے۔ ہاتھوں میں جیسے جان ہی نہیں رہی تھی حتیٰ کہ سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہونے لگی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں شمالی سڑک طے کرنے کے بجائے کوہ الپس کی بلندیاں چڑھ رہا ہوں۔ اس آخری احساس نے مجھے اس قدر بے دم کر دیا کہ میں رکنے پر مجبور ہو گیا اور پتھر کی باڑھ کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنی سانسیں استوار کرنے لگا۔

پتھر کی باڑھ سے ٹیک لگاتے ہی غیرارادی طور پر میری نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں جدھر سے چلتا ہوا میں آیا تھا اور یہ دیکھ کر میں نے سکھ کا ایک طویل سانس لیا کہ دور فاصلے پر ایک متحرک روشنی ہے جو لحہ بہ لحہ میری جانب بڑھ رہی ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ جیکب ہی اپنے ہاتھ میں لالٹین اٹھائے واپس آ رہا ہے لیکن جیسے ہی وہ ہیولا کچھ واضح ہوا' روشنی کا ایک دوسرا منبع بھی دکھائی دیا جو پہلے کے متوازی تھا اور یکساں رفتار سے متحرک تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ کسی کی ذاتی بگھی کی روشنیاں ہیں' اگرچہ یہ بات بڑی عجیب سی تھی کہ رات کے اس پہر کوئی اپنی ذاتی گاڑی لے کر ایسی غیراستعمال اور خطرناک سڑک سے جا رہا ہو۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے اس میں کوئی شک نہ رہا کیونکہ لیمپ ہر لحے بڑے اور روشن تر ہوتے گئے حتیٰ کہ میں نے یہ تصور بھی کر لیا کہ ان لیمپوں کے درمیان مجھے بگھی کا سیاہ خاکہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ بگھی بڑی تیز رفتاری سے آ رہی تھی اور کسی قسم کا شور مچائے بغیر' حالانکہ پہیوں کے نیچے برف کی ایک فٹ موٹی تہہ بچھی تھی۔

اب لیمپوں کے عقب میں بگھی واضح شکل اختیار کر گئی تھی۔ اچانک ایک شے نے میرے ذہن میں سر اٹھایا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اپنے خیالوں میں غرق میں نے چوراہا عبور کر لیا ہو اور "سائن پوسٹ" نہ دیکھ پایا ہوں؟ اور کیا یہ وہی کوچ ہو سکتی ہے جس پر مجھے سوار ہونا ہے؟

مجھے اپنے آپ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت دوسری مرتبہ پیش نہ آئی کیونکہ اتنی دیر میں بگھی سڑک کے موڑ پر آ گئی۔ ایک ڈرائیور' ایک محافظ' ایک بیرونی مسافر اور چار خاکستری رنگ کے گھوڑے جن کے نتھنوں سے بھاپ نکل رہی تھی' سبھی روشنی کے ایک نرم غبار میں لپٹے ہوئے تھے اور اس غبار میں سے لیمپ یوں روشن تھے جیسے شہاب ثاقب کا جوڑا!

میں اچھل کر آگے بڑھا' اپنا ہیٹ ہلایا اور زور سے چیخا۔ بگھی پوری رفتار سے قریب آئی اور میرے پاس سے گزرنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ڈر گیا کہ شاید مجھے دیکھا ہی نہیں اور نہ میری آواز سنی گئی ہے لیکن یہ ایک پل کی بات تھی۔ اگلے ہی لمحے بگھی کے ڈرائیور نے باگیں کھینچیں۔ محافظ جس نے آنکھوں تک اپنے چہرے کو ٹوپی اور مفلر میں لپیٹ رکھا تھا' اس نے نہ تو میرے سلام کا جواب دیا اور نہ نیچے اترنے کی ذرا سی بھی کوشش کی۔ بیرونی مسافر نے بھی اپنا سر تک نہ گھمایا۔ میں نے خود ہی دروازہ کھولا اور اندر دیکھا۔ اندر تین مسافر تھے۔ میں نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور خالی کونے کی جانب کھسک کر اپنی خوش قسمتی پر خود کو مبارک باد دینے لگا۔

بگھی کے اندر کی فضا باہر کی نسبت زیادہ ٹھنڈی تھی اور عجیب نامانوس سی بو آ رہی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی مسافروں کی طرف دیکھا۔ تینوں مرد تھے اور بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ تینوں سوئے ہوئے بھی نہیں لگتے تھے' لیکن جیسے ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر اپنی سوچوں میں غرق تھا۔ میں نے گفتگو چھیڑنے کی خاطر کہا:

"آج تو بہت سردی ہے۔" میرا مخاطب سامنے والا مسافر تھا۔

اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا' میری جانب دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دیا۔

"اس بار تو لگتا ہے کہ موسم سرما بڑی بے تابی سے شروع ہوا ہے۔" میں نے بات آگے بڑھائی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگرچہ جس کونے میں وہ بیٹھا تھا' وہاں خاصی تاریکی تھی اور میں اس کے خدوخال اچھی طرح سے نہیں دیکھ سکتا تھا' لیکن میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں پوری طرح مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود اس نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ تک نہ کہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں آزردگی محسوس کرتا اور اس کا اظہار بھی کر دیتا لیکن جانے کیوں اس لمحے میں نے خود کو بہت بیمار محسوس کیا۔ رات کی ہوا کی برفیلی ٹھنڈک میری ہڈیوں کے گودے میں اتر گئی تھی اور بگھی کے اندر کی عجیب و غریب بو سے مجھے متلی کی سی کیفیت محسوس ہو رہی تھی۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ گیا اور اپنے بائیں جانب کے مسافر کی جانب مڑتے ہوئے میں نے پوچھا کہ میرے کھڑکی کھولنے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔

اس نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی اپنی جگہ سے جنبش کی۔

اس بار میں نے اونچی آواز میں اپنا سوال دہرایا' لیکن نتیجہ وہی رہا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور میں نے کمربند نیچے کر لیا۔ جیسے ہی میں نے یہ عمل کیا چمڑے کی بیلٹ ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گئی اور میں نے دیکھا کہ کھڑکی کے شیشے پر پھپھوندی کی موٹی تہہ جمی ہوئی ہے' شاید برسوں سے جمع شدہ ہے! اب میں نے بگھی کی حالت پر توجہ دی' میں نے بغور اس کا جائزہ لیا اور بیرونی لیمپوں کی متزلزل روشنی میں دیکھا کہ یہ اپنے زوال کے بالکل آخری مرحلے پر ہے۔ اس کا ہر حصہ نہ صرف یہ کہ ماورائے مرمت تھا بلکہ خستہ پن کے انتہائی درجے پر تھا۔ کمربند محض چھونے ہی سے ٹوٹ جاتے تھے۔ چمڑے کی فٹنگ پر کائی کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور وہ لغوی طور پر گل سڑ چکی تھیں۔ میرے قدموں تلے کا فرش بھی تقریباً ٹوٹا ہوا تھا غرض سارے کا سارا ڈھانچہ سیلن میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں تیسرے مسافر کی جانب مڑا جسے میں نے ابھی تک مخاطب نہیں کیا تھا اور کہا:

"یہ بگھی تو بہت خستہ حالت میں ہے۔ کیا نئی ڈاک گاڑی مرمت کے لیے گئی ہے؟"

اس نے اپنا سر آہستگی سے گھمایا اور ایک لفظ بولے بغیر میرے چہرے کو تکنے لگا۔ اپنی پوری زندگی کے دوران میں اس کی وہ نگاہیں کبھی بھول نہیں پاؤں گا۔ مجھے ٹھنڈے پسینے آ گئے۔ اب بھی جب مجھے یاد آتا ہے تو ٹھنڈے پسینے آ جاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیرفطری چمک تھی۔ اس کا چہرہ کسی لاش کا سا چہرہ تھا۔ اس کے بے خون ہونٹ

اندر کو مڑے ہوئے تھے جیسے موت کی اذیت سے مڑ گئے ہوں اور دانتوں کی قطار ...ائی دے رہی تھی۔

جو الفاظ میں کہنے والا تھا' وہ میرے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئے اور مجھے ایک عجیب و ...یب دہشت.......... ایک جان لیوا دہشت نے آ لیا۔ میری بصارت اب بگھی کے اندر ...ے اندھیرے کی عادی ہو گئی تھی۔ میں اپنے سامنے والے مسافر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ...ی میری جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ویسی ہی زردی اور آنکھوں میں وہی ...ک تھی۔ میں نے اپنے ابروؤں پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر کی ...رف سر گھمایا اور دیکھا.......... اوہ خدایا.......... میرے پاس بتانے کو الفاظ نہیں کہ میں ...نے کیا دیکھا؟ میں نے دیکھا کہ وہ زندہ آدمی نہ تھا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی میری طرح ...زندہ نہ تھا۔ ایک زرد فاسفورسی روشنی.......... سڑاند کی روشنی ان کے چہروں پر رقصاں ...تھی' بلکہ بالوں اور جسم کے دیگر تمام حصوں پر۔ ان کے کپڑوں پر مٹی تھی جیسے قبر میں ...تھڑے ہوئے کفن پر ہو۔ ان کے ہاتھ یوں تھے جیسے مدتوں سے قبر میں دفن مردے کے ...ہاتھ ہوں۔ صرف ان کی آنکھوں' ان دہشت ناک آنکھوں میں زندگی تھی اور وہ آنکھیں ...میکانکی انداز سے مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

دہشت سے میں چیخ اٹھا۔ یہ مدد اور رحم کے لیے ایک ناقابل فہم چیخ تھی جو میرے ہونٹوں سے نکلی اور میں بے اختیار دروازے سے چمٹ کر اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس ایک پل کے عرصے میں ایک مختصر مگر نہایت واضح پل میں' میں نے دیکھا کہ چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہے اور اس کی نقرئی روشنی سامنے نصب اس سائن پوسٹ پر پڑ رہی ہے جہاں پر لکھا ہے: "خبردار' دیوار ٹوٹی ہوئی ہے۔" ساتھ ہی انگلی کا اشارہ بھی ہے لیکن اتنی دیر میں گھوڑے بے قابو ہوتے ہیں اور پچاس فٹ گہری سیاہ کھائی میں گرنے لگتے ہیں۔ بگھی یوں گھومتی ہے جیسے سمندر میں بحری جہاز' پھر تڑاخے کی زوردار آواز کے ساتھ درد کی ایک شدید لہر اٹھتی ہے اور ہر طرف اندھیرا چھا جاتا ہے۔

جب میری آنکھ کھلی تو لگا جیسے برسوں بعد گہری نیند سے جاگا ہوں۔ میں نے دیکھا میری بیوی میرے بستر کے کنارے بیٹھی ہے۔ میری بیوی نے روتے ہوئے جو کچھ بتایا' وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں مختصر الفاظ میں آپ کے گوش گزار کرتا ہوں۔ اس کے مطابق میں اس کھڑی چٹان سے نیچے گر پڑا تھا جو پرانی اور نئی سڑک کے چوراہے پر واقع ہے۔ خوش قسمتی سے جس جگہ میں گرا، وہاں برف کی موٹی تہہ جم چکی تھی جس نے مجھے موت سے بچا لیا۔ صبح دو چرواہوں نے برف میں دبے دیکھا تو اٹھا کر نزدیکی پناہ گاہ پر لے گئے اور سرجن کو بلایا گیا۔ سرجن نے مجھے بے ہوشی کے عالم میں پایا۔ میرے سر پر بھی چوٹ آئی تھی اور بازو ٹوٹ گیا تھا۔ میری جیبوں میں رکھے ہوئے خطوط سے انہیں میرا نام اور پتہ معلوم ہوا چنانچہ میری خبرگیری کے لیے میری بیوی کو بلا بھیجا گیا۔ آخرکار میری حالت خطرے سے باہر ہو گئی۔ مجھے یہ وضاحت کرنے کی شاید ضرورت نہیں کہ میرے گرنے کی جگہ وہی تھی جہاں آج سے نو برس پہلے شمالی ڈاک بگھی کو حادثہ پیش آیا تھا۔

میں نے اپنی بیوی سے ان خوفناک واقعات کا ذکر نہیں کیا جو ابھی ابھی آپ کو بتائے ہیں۔ میں نے اپنے سرجن کو بتایا تھا لیکن اس کے مطابق میرے دماغ کو بخار چڑھ جانے سے میں نے اس قسم کا خواب دیکھا تھا۔ ہم نے اس پر بار بار بحث کی، لیکن جب متفق نہ ہو سکے تو یہ موضوع ہی ترک کر دیا کیونکہ سرجن اپنے نقطہ نظر پر ڈٹا رہا جبکہ میں اپنے تجربے کی حقیقت پر قائم تھا۔ دوسرے لوگ چاہے جو مرضی نتیجہ اخذ کریں، لیکن میں جانتا ہوں کہ آج سے بیس برس پہلے میں حادثے کا شکار ہونے والی "فانٹم کوچ" کا چوتھا مسافر تھا۔

O☆O

زندہ لاش

خاصا کھلا گھر تھا اور پھر سستا بھی۔ اسی لیے میں نے فوراً خرید لیا۔ چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا، اس کے ساتھ ڈائننگ اور پھر کچن، درمیان میں کشادہ کوریڈور۔ دوسری جانب گیسٹ روم۔ لائبریری اور سٹور ایک قطار میں تھے۔ گیٹ کے ساتھ ہی پورچ تھا اور پورچ کے برابر مختصر سا لان۔ دونوں طرف صحن اور برآمدے تھے۔ اندر والے برآمدے سے سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔ صحن کے کونے میں ہار سنگھار کا ایک بہت بڑا درخت تھا۔ اس کے نیچے کوڑے والا ڈرم رکھا تھا۔ سامنے باتھ روم تھا۔

میں ۲۵ دسمبر ۱۹۶۹ء کو یہاں آئی تھی۔ میری مستقل ملازمہ رشو پانچ دن پہلے آ چکی تھی۔ ڈرائنگ روم میں صوفے، قالین اور کئی سینریاں کیلنڈر اور ڈیکوریشن پیس سجے تھے۔ ڈائننگ میں قدیم خاندانی میز اور چار کرسیاں تھیں۔ دائیں جانب دیوار میں لگے شوکیس میں برتن سجے تھے۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ فریج تھا جس کے ساتھ کچن میں کھلنے والا دروازہ تھا۔

میں دس سال سے سراغرسانی کے ایک پرائیویٹ ادارے "نیٹو" میں ملازم تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تنخواہ معقول سے بھی زیادہ تھی۔ یوں بھی تنہا ہونے کی وجہ سے اخراجات کچھ خاص نہ تھے۔ اس لیے ہر ماہ اچھی خاصی تنخواہ بچا کر میں ٹھاٹ سے گزر بسر کر رہی تھی۔

ایک دن کا ذکر ہے' میں دفتر میں بیٹھی کام کر رہی تھی کہ اچانک میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی کسی نے پوچھا۔ "مے آئی کم ان میڈم!"

"یس!" میں جواب دے کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک ادھیڑ عمر اور دوسرا جوان۔ دونوں میرے سامنے بیٹھ گئے۔ "فرمایئے!" میں نے پوچھا۔

"گزشتہ ایک ماہ سے رات بارہ بجے کے بعد ہمارے گھر میں کنکر پھینکے جاتے ہیں بعض اوقات سارا سامان الٹ پلٹ کر دیا جاتا ہے۔ ہم نے ساری ساری رات جاگ کر نگرانی کی۔ پولیس کئی مرتبہ آئی لیکن پتہ نہیں چلتا کہ پتھر آتے کدھر سے ہیں۔ ساری کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے ٹوٹ چکے ہیں۔ تنگ آ کر ہم آپ سے رجوع کر رہے ہیں۔" ادھیڑ عمر شخص بتا رہا تھا۔

"آپ کا نام؟" میں نے کہا۔

"فیض الحسن چشتی۔" اس نے بتایا۔ "کل ہم آپ کے باس سے ملے تھے۔ انہوں نے آپ سے مل کر رپورٹ درج کرانے کے لیے کہا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے آہستہ سے سر ہلایا اور پوچھا۔ "کیا ہر روز پتھر آتے ہیں؟"

"جی شروع میں ایک دو روز کے وقفے سے آتے تھے۔ اب ڈیڑھ ہفتے سے مسلسل ایک ہی ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔" فیض صاحب بولے۔

"کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی؟" ایک اور سوال۔

"چوری تو نہیں البتہ بکھرا سب سامان ہوتا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر مت کریں۔ رات اطمینان سے سوئیں اور صبح کسی چیز کو چھیڑیں مت۔ میں انشاء اللہ نو بجے صبح آپ کے گھر آؤں گی۔" میں نے تسلی دی۔

وہ اپنا مکمل پتہ لکھوا کر اجازت لے کر چلے گئے۔

"نیٹو" کا شروع سے اصول تھا کہ ہر سراغرساں اپنی تفتیشی رپورٹوں کی فائلیں تیا کرتا تھا۔ یہ اس کی کارکردگی کا ریکارڈ ہوتا تھا۔ اس دن بھی میں ایک پچھلے کیس کی

تفصیل لکھ رہی تھی۔ رات کے نو بج گئے مگر فائل مکمل نہیں ہوئی' چنانچہ میں نے فائل ساتھ لی' اندر اپنی کمپنی کے رائٹنگ پیڈ پر فیض صاحب کا ایڈریس لکھ کر رکھا اور گھر چلی آئی۔

دس منٹ تک مسلسل ہارن دینے کے باوجود گیٹ نہ کھلا۔ یہ ناممکن تھا کہ رشو سو جائے۔ آج تک کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ تنگ آ کر میں گاڑی سے باہر نکلی اور گیٹ پیٹ ڈالا مگر بے سود۔ گیٹ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ رشو کبھی گہری نیند نہیں سوئی تھی۔ یوں بھی وہ اکثر بے خوابی کا شکار رہتی تھی۔ مجھے طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ آخر کار دیوار پھاند کر میں اندر گئی اور گیٹ کھولا۔

کوریڈور کی لائٹ آن تھی۔ کچن میں بھی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کی ہلکی روشنی میں' میں نے رشو کو اوندھے منہ برآمدے میں گرا دیکھا۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر برآمدے کا بلب روشن کر دیا۔ رشو بے ہوش تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں خوف کی واضح جھلک تھی۔ میں نے اسے ہوش میں لانے کے لیے کئی حربے آزمائے لیکن ناکام رہی۔ تھک ہار کر میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا۔

دن چڑھے رشو کو ہوش آیا مگر وہ کچھ بتانے سے اب بھی قاصر تھی۔ ڈاکٹر رخصت ہو گیا۔ میں اس کے پاس آ بیٹھی۔ کئی گھنٹے بعد جب اس کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے کہنا شروع کیا:

"اس وقت شام کا ملگجا اندھیرا رات کی سیاہی میں تبدیل ہو رہا تھا' میں کچن میں تھی۔ اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے صحن میں کوئی موجود ہو۔ میں باہر نکل آئی اور یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ صحن میں پڑے ڈسٹ بن میں ایک خوفناک شکل والا آدمی کھڑا تھا۔ اس کے بدن سے خون ٹپک رہا تھا اور سارا جسم خونم خون ہو رہا تھا۔ آنکھیں ابلی ہوئی تھیں اور زبان باہر لٹک رہی تھی۔ مجھے وہ اپنی جانب بڑھتا دکھائی دیا اور پھر مجھے کوئی خبر نہ رہی۔"

مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ رشو ڈر گئی ہے۔ دوسرا خیال یہ تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے' یہاں آدھی آدھی رات اور سارا سارا دن تنہا رہی ہے' کبھی کسی چیز سے اسے خوف نہ آیا۔ پھر میں نے سوچا اسے نظر کا دھوکا ہوا ہوگا اور پھر کئی خیال اوپر تلے آتے چلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ے۔

"تمہیں نظر کا دھوکا ہوا ہوگا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"یقین کیجئے مادام! میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا تھا۔" رشو نے ایک ایک لفظ پر ... دیتے ہوئے کہا۔

میں نے باہر نکل کر پورے صحن کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ہار سنگھار کے پتے صحن میں بکھرے ہوئے تھے' ڈرم میں تھوڑا سا کچرا پڑا تھا۔ اردگرد خون کا معمولی سا دھبہ بھی نہ تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک خون سے بھرا شخص وہاں کھڑا ہو اور خون نیچے نہ گرے۔ میرا خیال یقین میں بدل گیا۔ یہ سب رشو کے ذہن کی تخلیق تھی۔

پوری رات جاگنے کی وجہ سے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس لئے میں اطمینان سے سو گئی۔ جب آنکھ کھلی' ہلکی ہلکی شام ہو رہی تھی۔ کچن سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں کسلمندی سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ "ارے رشو کیا پکا رہی ہو؟"

"آپ تو سو رہی تھیں مادام' اس لیے جو ذہن میں آیا پکا دیا۔" وہ تیزی سے برتن اِدھر اُدھر رکھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آں۔ ہاں۔" اس نے آہستگی سے سرہلایا پھر اچانک اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں لہرانے لگیں جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مادام' آج رات آپ بھی جاگ کر اسے دیکھیں گی ناں؟"

"ہاں۔" میں نے کہہ تو دیا لیکن میں اب بھی اس کی بات کا یقین کرنے کو تیار نہ تھی اور اسے یوں مصر دیکھ کر جھٹلانا بھی نہ چاہتی تھی۔

رات کا کھانا کھا کر ہم برآمدے میں کرسیاں بچھا کر بیٹھ گئے۔ لائٹ آف کر دی اور سرگوشیوں میں باتیں ہونے لگیں۔ زیادہ تر گفتگو میں ہی کرتی رہی۔ رشو اندھیرے میں ہار سنگھار پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ کبھی کبھار کوڑے والے ڈرم کو بھی گھور لیتی۔

ڈرائنگ روم میں لگے کلاک کی سوئیاں یکساں رفتار سے آگے بڑھتی رہیں۔ بارہ

ے پھر ایک............ دو............ تین۔ مسجدوں سے اذان کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے ری رات جمائیاں لیتے ہوئے گزار دی تھی۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آیا تھا۔

"لو بھئی رشو تمہارا بیان غلط ثابت ہو گیا۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"آپ کو یقین نہیں آتا۔" اس کی نظروں میں التجا تھی۔

"ٹھنڈ بہت ہے۔ کافی کی شدید حاجت ہو رہی ہے۔" میں اٹھتے ہوئے بولی اور پھر و کے جواب کا انتظار کئے بغیر بستر میں گھس گئی۔ لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی اور خاصی بعد کھلی۔ تپائی پر رکھی ہوئی گھڑی پر نظر ڈالی۔ آٹھ بج رہے تھے۔ گھڑی کے پاس ڈی کافی رکھی ہوئی تھی اور ساتھ والے بستر پر رشو بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ رشو ساتھ ہی مجھے اس کے واہمے کا خیال آیا پھر گزشتہ دو دنوں کے واقعات میرے ذہن تازہ ہو گئے۔ ساتھ ہی ذہن میں فیض الحسن کا خیال آ گیا۔ اوہ! مجھے تو نو بجے ان کے پہنچنا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جلدی جلدی اپنے لئے ناشتہ تیار کیا اور تیار ہو کر صاحب کے گھر جا پہنچی۔ ان سے دیر سے آنے کے لیے معذرت کی۔ وہ بولے۔ ئی بات نہیں............ آئیے۔ گھر کی چیزوں کا معائنہ کر لیجئے۔"

میں اندر داخل ہو گئی۔ اوسط درجے کا گھرانہ تھا۔ سارے گھر میں عجیب دھماچوکڑی تھی۔ ڈرائنگ روم میں صوفے اوندھے پڑے تھے۔ پردے ایک جگہ ڈھیر تھے۔ صحن جوتے اور کنکر بکھرے پڑے تھے۔ الماریوں' کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے ٹوٹ چکے ' ایک جگہ گھر بھر کے کپڑے جمع تھے' دوسرے کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر تھا۔ ن میں برتن اوندھے پڑے تھے۔ سٹور میں گرد جمی ہوئی تھی اور فرش پر عجیب سے ں کے نشان تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی لمبے لمبے ناخنوں اور گول پاؤں والی چیز ل قدمی کرتی رہی ہے۔

میں دیر تک اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ مگر کوئی اور خاص چیز دکھائی نہ دی۔ اتنے میں اسسٹنٹ بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں بالوں کا ایک گچھا تھا۔ "یہ کہاں سے ملا؟" انے سوال کیا۔

"سر بال باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے شیشے میں اٹکے تھے۔" اس نے بتایا۔ میں نے ں کے گچھے کو الٹ پلٹ کر اچھی طرح دیکھا۔ وہ انسان کے بال نہیں تھے۔ انسانی بال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باریک اور قدرے ملائم ہوتے ہیں۔ یہ موٹے اور کھردرے تھے۔

"آپ کے گھر میں کوئی جانور ہے؟" میں فیض صاحب کی طرف مڑی۔

"جی نہیں۔ ہمیں جانوروں سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"اچھی طرح سوچ کر بتایئے کل یا پرسوں محلے میں کوئی مداری تو نہیں آیا تھا جس کے پاس ریچھ یا بندر ہو۔" میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ تمام وقت گھر پر نہیں ہوتا۔" وہ کہنے لگے۔

"آیا تھا انکل۔ کل ایک مداری آیا تھا۔ گلی کی نکڑ پر کرتب دکھا رہا تھا۔" فیض صاحب کا کمسن بھتیجا جو پاس کھڑا تھا، فوراً بولا۔

"اس کے پاس ریچھ تھا؟" فیض صاحب نے پوچھا۔

"جی نہیں بندر تھا اور اتنا سا لڑکا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے لڑکے کا قد بتاتے ہوئے کہا۔

"ان کو احتیاط سے اپنے پاس رکھ لو۔ کوئی بال ضائع نہ ہونے پائے۔" میں نے اپنے اسسٹنٹ کو ہدایت کی۔

ہم باتیں کرتے ہوئے بڑے کمرے میں آ گئے۔ جس میں صرف چارپائیاں بچھی تھیں۔ "یہ چارپائیاں نہیں اوندھی ہوئیں؟" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جن پر ہم سوئے ہوئے ہوتے ہیں، وہ بچ جاتی ہیں لیکن چارپائی ضرور الٹی ہوئی ملتی ہے۔" فیض صاحب نے بتایا۔

"آپ کے سامنے الٹ جاتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں، بس نیند کی ایک جھلک سی آتی ہے۔ اس کے بعد فوراً چونک کر آنکھ پھاڑ دیتے ہیں تو سامنے چارپائیاں الٹی پڑی ہوتی ہیں۔" وہ بتانے لگے۔

"آپ اس مکان میں کب سے رہ رہے ہیں؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"اکیس سال سے اس مکان میں رہ رہا ہوں۔ پچھلے سات برسوں سے میرے بچے بھی یہاں مقیم ہیں۔"

"پہلے کبھی ایسا کوئی واقعہ ہوا؟"

"میرے علم میں نہیں۔" انہوں نے سر ہلا دیا۔

"آپ سے پہلے یہ گھر کس کی ملکیت تھا؟"

"یہاں میرے امی ابا رہتے تھے۔" وہ بولے۔

"اور ان سے پہلے؟"

"یہ مکان انہوں نے خود بنوایا تھا لیکن یہاں زیادہ عرصہ رہنا انہیں نصیب نہ ہوا۔ دو سال بعد فوت ہو گئے۔ تب میں اور میرے بھائی یہاں رہ گئے پھر میری شادی ہو گئی اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلے گئے۔ وہاں سے واپسی پر سکھر پوسٹنگ ہو گئی۔ سات سال پہلے وہ ٹرانسفر کرا کے یہاں آ گئے تھے۔" فیض صاحب نے میرے سوالوں سے زچ ہو کر ساری تفصیل خود سنا دی۔

فیض الحسن صاحب کی باتیں سننے کے بعد میں سوچ میں کھو گئی۔ تھوڑی دیر سوچتی رہی پھر کہا۔ "آج رات میں خود یہاں رہوں گی اور تفصیلی مشاہدہ کروں گی۔" وہاں سے نکل کر اپنے آفس آئی، خوش قسمتی سے باس وہیں مل گئے۔ اسسٹنٹ کی زبانی سب حالات سن چکے تھے، مجھے دیکھتے ہی بولے۔ "یہ کسی انسان کا کام نہیں۔ یقیناً کوئی جن یا بدروح ہے۔ میں فیض الحسن سے لی ہوئی ایڈوانس رقم واپس کر کے معذرت کر لیتا ہوں۔"

میں خاموش رہی۔ سیکرٹری بولا۔ "باس آپ تو کہتے تھے ہمارا مقصد انسانوں کو آرام و سکون سے رہائش کے مواقع مہیا کرنا ہے۔ پھر اتنی جلدی ہمت کیوں ہار دی؟"

"ہماری جنگ مجرم پیشہ لوگوں سے ہوتی ہے۔ مافوق الفطرت عناصر اور قوتوں سے کیونکر مقابلہ کریں گے۔" وہ زچ ہو کر بولے۔

"ایک صاحب میرے واقف ہیں جن کے قبضے میں جن وغیرہ ہیں ان سے کیوں نہ مدد لی جائے؟" سیکرٹری نے کہا۔

"ٹھیک ہے ان سے مل کر کوشش کر لو۔" باس نے اجازت دے دی۔

"ویسے ہمارا آج رات فیض صاحب کے گھر گزارنے کا پروگرام ہے۔" میں نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ تم بھی اپنی سی کر دیکھو۔" انہوں نے ہاتھ جھٹکے اور ایک فائل کھول کر سامنے رکھ لی۔ دن کا باقی وقت میں نے پچھلے کیس کی فائل تیار کرنے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گزارا۔

شام کو چند ساتھیوں کے ہمراہ آستانہ فیض پر جا پہنچی۔ پہرے دار پارٹی کو اس کے کھڑے ہونے کی جگہیں دکھائیں اور رات گیارہ بجے سے ڈیوٹی سٹارٹ کی۔ گھر کے باہر دو کھڑکیاں کھلتی تھیں' دونوں کے آگے دو دو آدمی کھڑے کیے۔ ایک باغ میں درخت کے نیچے اور دوسرا باہر والے دروازے کے پاس۔ چند آدمیوں کو ہدایت کی کہ وہ گھوم پھر کر مکان کے سارے حصوں پر نظر رکھیں۔

میرے پاس نیند اڑانے والی گولیاں تھیں۔ ان گولیوں کا اثر عام طور پر دو گھنٹوں کے لیے ہوتا ہے۔ ایک گولی دو گھنٹے تک جگائے رکھتی ہے مگر ہم حفظ ماتقدم کے طور پر ہر آدھ گھنٹے بعد ایک گولی حلق میں اتار رہے تھے۔

چھنک چھن کی ہلکی سی آواز اندھیرے میں سناٹے کو توڑتی ہوئی ابھری' میرے کان کھڑے ہو گئے۔ ایسا لگا تھا جیسے کسی نے گھنگھرو بجائے ہوں۔ پھر جیسے بھونچال آ گیا۔ صوفے الٹنے کی آواز آئی۔ دروازے زور زور سے کھلنے اور بند ہونے لگے۔ اس کے بعد کنکروں کی بارش ہونے لگی۔ میں دبے پاؤں اٹھ کھڑی ہوئی۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ اریڈ؛ کی بنی چمکدار سوئیاں بارہ بجا رہی تھیں۔ میں دم سادھے آہستہ روی سے چلتی ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ تاہم میں نے ہمت سے کا لیا اور اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ آگے بھاری پردہ تھا۔ میں جانتی تھی دروازے - پاس ہی سوئچ بورڈ ہے اور دائیں طرف کا پہلا سوئچ کمرے کی لائٹ کا ہے۔ ایک لمحہ رک کر میں نے بے ترتیب سانسوں پر قابو پایا اور جھپاک سے اندر داخل ہو کر پھرتی - سوئچ دبا دیا۔ کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ میں نے صرف ایک جھلک دیکھی جیسے کوئی گوریلا ریچھ یا اس سے مشابہہ کوئی جانور صوفے کے پاس جھکا تھا۔ روشنی ہوتے ہی وہ کھڑکی جانب بڑھا اور غائب ہو گیا۔

میں حیران ہو گئی۔ کھڑکی بند تھی۔ ٹوٹے شیشوں کے سوراخ ضرور تھے لیکن میں سے اس جانور کا ہاتھ بھی بمشکل نکل سکتا تھا چہ جائیکہ وہ خود پورے کا پورا یہاں باہر کود سکتا۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ نیچے ایک ساتھی موجود تھا۔ میں

ٍاز دی۔ "یہاں سے کوئی گزرا تو نہیں؟"

"ابھی ابھی ایک سایہ سا گزرتا محسوس ہوا تھا۔ میں نے اسے وہم سمجھ کر نظرانداز ردیا۔" اس نے بتایا۔ میں پلٹ آئی۔ کمرے میں' میں نے سرشام مٹی ڈلوا دی تھی۔ اس بنجوں کے ایسے ہی نشانات بنے تھے جیسے سٹور میں تھے۔ گول اور لمبے ناخنوں والے۔ ام کے بعد اس کمرے میں کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ آنکھ کے پردے نے تصویر محفوظ کی نظر کا دھوکا یا واہمہ ہرگز نہیں تھی۔ میں اپنی تسلی کر چکی تھی اس لیے رہ ہٹا دیا اور چلنے کو تیار ہو گئی۔ راستے بھر صوفے کے پاس جھکا سایہ میرے ذہن میں لردش کرتا رہا۔

گیٹ کو تالا لگا تھا۔ میں نے بٹ صاحب کے مکان کی بیل بجائی۔ تھوڑی دیر بعد سزبٹ گھبرائی ہوئی باہر آئیں۔ "رشو اور تابی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے انہیں تسلی دی اور ان کے ساتھ چل پڑی۔ بٹ صاحب کا گھر دو منزلہ فا۔ تابی ان کی بیٹی تھی۔ رشو جب بھی گھر میں تنہا ہوتی' تابی کے پاس چلی آتی۔ وہ دیر تک ٹی وی کے سامنے بیٹھی مختلف پروگرام دیکھتی رہیں۔ پھر اوپر کمرے میں سونے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میرا پروگرام چونکہ رات کو دیر سے آنے کا تھا اس لئے رشو نے بٹ صاحب کے ہاں رک جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ تابی اور رشو کو اوپر کمرے میں گئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ مسز بٹ اور مسٹر بٹ نچلے کمرے میں بیٹھے ابھی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اچانک رشو کی خوفناک چیخ سنائی دی۔ یہ میرے وہاں پہنچنے سے دس منٹ پہلے کی بات تھی۔ دونوں میاں بیوی دوڑے دوڑے اوپر پہنچے۔ تابی بے ہوش ہو چکی تھی' رشو البتہ ہوش میں تھی مگر کچھ بتانے سے قاصر! اس کی آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ "مادام!" مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی وہ بولی۔ "وہ.......... وہ اس س س ڈ ڈرم م۔"

بٹ صاحب کے کمرے کی کھڑکی سے ہار سنگھار کا پودا صاف نظر آ رہا تھا۔ سردیوں کی یخ بستہ چاندنی میں وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کے نیچے پڑا ڈرم بھی دکھائی دے رہا تھا۔ صحن خاموش اور خالی تھا۔

رشو کی طبیعت ذرا ٹھیک ہوئی' تو میں اسے ساتھ لے کر اپنے گھر میں آ گئی۔ صبح ناشتے کی میز پر اس سے رات کے واقعے کے تفصیل معلوم کی۔ اس نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں اور تابی بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ چند لمحے پہلے ہم نے ٹی وی پر ایک خوفناک انگلش فلم دیکھی تھی۔ میں نے تابی کو ڈرم والا واقعہ سنایا۔ تابی نے بھی یقین کرنے سے انکار کر دیا اور میری بات کو محض نظر کا دھوکا قرار دے کر ہنس پڑی لیکن پھر اچانک اس کی نظر ڈرم پر جا پڑی۔ وہ خوفناک صورت اس دن کی طرح ڈرم میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر تابی کی زبان گنگ ہو گئی۔ اس نے مجھے ٹھوکا دیا۔ میں نے ہٹ کر دیکھا اور لرز گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ خوفناک آدمی ڈرم سے باہر نکل آیا۔ اس کے سارے بدن پر خون ہی خون تھا۔ میں ڈر کر بے اختیار چیخ اٹھی۔ دوسری طرف تابی بھی بغیر آواز نکالے بے ہوش ہو گئی۔"

ناشتے کے بعد میں نے بٹ صاحب کے ہاں فون کیا۔ پتہ چلا تابی کو شدید بخار چڑھا ہوا ہے۔

"تم دن کو تو تنہا رہ سکتی ہو رشو؟" میں نے آفس جانے سے پہلے پوچھا۔

"نہیں مادام' مجھے اس گھر سے خوف آتا ہے۔" وہ کانپ کر بولی۔

"چلو پھر میرے ساتھ ہی چلو۔ چند دنوں تک میں خاصی مصروف ہوں۔ اس کے بعد زیادہ وقت گھر پر گزاروں گی۔" میں نے کہا۔

ابھی میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف باس کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے فوراً آنے کو کہا۔ میں رشو کو ساتھ لئے آفس آ گئی۔ باس نے ایک آدمی کا تعارف کرایا۔ ان کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ غالباً کوئی انصار صاحب تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس کے متعلق سیکرٹری نے بتایا تھا کہ اس کے قبضے میں جن ہیں اور وہ کوئی پہنچا ہوا عامل ہے۔

رشو کو آفس چھوڑ کر ہم "آستانہ فیض" آ گئے۔ انصار صاحب نے گھر کے صحن میں ایک لمبی لکیر لگائی۔ پھر دوسری اس کے مخالف سمت اور دونوں جس نقطے پر اکٹھی ہوئی تھیں' خود وہاں بیٹھ گئے۔

خاصی دیر ہو گئی' آخر انہوں نے آنکھ کھولی اور ہمیں بتایا کہ اس گھر میں ایک جن رہتا ہے۔ وہ یہاں کیوں رہتا ہے اور مکینوں کو کیوں تنگ کرتا ہے' یہ میں نے ابھی معلوم نہیں کیا۔ اس کے لیے چند روز مسلسل یہاں آنا پڑے گا۔

چند دن خاموشی سے گزر گئے۔ یہ اوائل جنوری کی بات ہے۔ میں عشاء کی نماز پڑھ کر اٹھی تو یوں محسوس ہوا جیسے باہر صحن میں کوئی چل پھر رہا ہو۔ "کچھ سنا تم نے؟" میں نے رشو سے سرگوشی کی۔ "یہ قدموں کی چاپ کیسی ہے؟"

رشو کان لگا کر سننے لگی۔ میں نے ریوالور لوڈ کر کے ہاتھ میں لے لیا اور دبے پاؤں چلتی برآمدے میں آ گئی۔ مجھے کسی سائے کی ہلکی سی جھلک نظر آئی اور پھر وہ غائب ہو گیا۔ میں نے صحن کا بلب روشن کیا۔ باہر کسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ دل کی دھڑکن بے اختیار تیز ہو گئی۔ چند دن پہلے ہمارے سٹاف کے چند آدمی "انتقام" کا نشانہ بننے سے بال بال بچے تھے۔ انہوں نے کسی کیس میں ایک سمگلر کو گرفتار کرا دیا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے انتقاماً ان کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ قسمت اچھی تھی وہ زندہ بچ نکلے لیکن پھر بھی کئی دنوں تک انہیں ہسپتال میں زیرعلاج رہنا پڑا۔

میں شرلک ہومز تو نہیں البتہ کئی برسوں سے سراغرسانی کے میدان میں موجود تھی اور اب تک کئی جرائم پیشہ افراد کو پولیس کے ہاتھوں گرفتار کروا چکی تھی اور کئی قاتلوں کو تختہ دار پر کھنچوایا تھا۔ سوچا' عین ممکن ہے یہ پراسرار آدمی بھی انہیں میں سے کسی ملزم کا ساتھی ہو۔ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ صبح رشو کے جھنجھوڑنے پر نیند سے بیدار ہوئی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چھوٹتے ہی بولی۔ "عجیب بات ہوئی مادام!" میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں آنکھیں ملتی ہوئی اس کے پیچھے ہو لی۔ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ میں نے دیکھا سامنے والے کونے میں قالین پر ڈھیروں خون پڑا تھا جیسے کئی دن پہلے یہاں کسی کو ذبح کیا گیا ہو اور خون وہیں سوکھ گیا ہو۔ میں نے خون کا کچھ نمونہ محفوظ کر کے رشو کو قالین صاف کرنے کو کہا اور خون لیبارٹری میں معائنہ کے لیے بھجوا دیا۔

رشو ساری ساری رات کروٹیں لیتے گزار دیتی تھی۔ اس دن میں نے اس کے لیے ویلیم کی گولیاں بھی خریدیں۔ آدھی رات ہو گی۔ جب میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ ڈرائنگ روم سے عجیب سی آواز آ رہی تھی جیسے کسی جاندار کا گلا دبایا جا رہا ہو اور وہ خود کو چھڑانے کی جدوجہد میں چیخنا چاہتا ہو۔ ایک لمحے کے لیے میرا سارا بدن پسینے میں نہا گیا۔ خوف سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے میں دبے پاؤں اٹھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی۔ نیم وا دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ ایک آدمی خون میں لت پت پڑا تھا۔ دوسرے نے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر اس کا گلا دبا رکھا تھا۔ نیچے گرا ہوا شخص تڑپ رہا تھا اور اس کی حلق سے آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اندر داخل ہو کر لائٹ جلا دی۔ کمرے میں روشنی ہوئی تو سب منظر غائب تھا' البتہ اس جگہ پر خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ جما ہوا خشک خون! یہ وہی جگہ تھی جہاں گزشتہ روز خون پایا گیا۔ میں باہر نکل آئی۔ صحن میں کوئی ٹہل رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔

اف خدایا! میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ ایک لاش تھی۔ اس کا چہرہ بگڑ چکا تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئیں۔ زبان ایک طرف لٹکی ہوئی اور بدن پر خون ہی خون! وہ شدت کی سردی میں ایک شلوار اور قمیض پہنے تھی اور بے چینی سے صحن میں گھوم رہی تھی۔ میں برآمدے میں جہاں کھڑی تھی' وہیں کھڑی رہ گئی۔ ہمت جواب دے گئی' قدم من من کے ہو گئے۔ آنکھیں اس پر گڑی رہ گئیں۔

پراسرار لاش گھومتے گھومتے اچانک پلٹی اور اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے برآمدے کی طرف چلنا شروع کیا۔ میں نے چیخنا چاہا۔ منہ کھلا تھا لیکن آواز جیسے گھٹ کر رہ گئی تھی۔

وہ لاش مجھ سے تقریباً پانچ فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رک گئی۔ اس کی باہر نکلی ہوئی آنکھوں میں ایک التجا تھی' بے چارگی تھی۔ اس نے میری طرف منہ کر کے کچھ اشارے کیے۔ اس کی بے نور آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔ چند منٹ وہیں کھڑے رہ کر اس نے اِدھر اُدھر ہاتھ ہلائے اور واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ ہار سنگھار کے درخت کے پاس پہنچ کر وہ پھر میری طرف گھومی اور پھر کوڑے والے ڈرم میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے آنکھیں ملیں' چٹکی بھری۔ یہ خواب نہیں تھا' یہ خواب نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے دوبارہ ڈرم کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل خالی تھا۔

میں صحن میں آ گئی۔ چاندنی میں ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔ زمین پر خون کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ ڈرم میں بھی کوڑے کچرے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں دیر تک اِدھر اُدھر گھومتی رہی۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ رشو کو قالین صاف کرنے کا کہہ کر میں نے لیبارٹری فون کیا۔ وہاں سے جواب ملا خون کئی سال پہلے کا ہے لیکن ہے انسان کا ہی۔ کئی سال پہلے

کا؟ کئی سال پہلے تو یہ قالین بھی نہیں بنا تھا' اس پر کئی سال پہلے کا خون کہاں سے آ گیا؟ میں الجھ گئی۔

اس رات بھی دیر تک نیند نہ آئی اور جب تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگی تو قدموں کی مخصوص چاپ سن کر اٹھ بیٹھی۔ نہ جانے مجھے کیا سوجھا کہ اٹھ کر برآمدے میں آ گئی۔ وہی لاش ٹہل رہی تھی۔ اس نے کل کی طرح پانچ فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو کر میری طرف کچھ اشارے کیے۔ میں غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ وہی بے نام سی اداسی اور التجا آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔ وہ دوبارہ ڈرم میں داخل ہو کر میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ میں اس کے متعلق سوچتی رہی' لیکن کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔

صبح پھر قالین پر اسی جگہ خشک خون موجود تھا!

"یہ اسی خوفناک بلا کی حرکت ہے مادام!" رشو گھبرا کر بولی۔

"کوئی بات نہیں رشو' ساری زندگی خوفناک بلاؤں سے نمٹنے میں گزری ہے۔ اس سے بھی نمٹ لیں گے۔ تم آج پھر قالین صاف کر دینا۔" میں نے کہا۔

"مادام میری بات مانیں اور یہ گھر چھوڑ دیجیے۔" رشو ہاتھ جوڑ کر بولی۔ میں نے ذرا سختی سے ڈانٹا تو خاموش ہو کر اپنے کام میں لگ گئی۔

میں اگلے دن شام کو برآمدے میں بیٹھی فائل مکمل کر رہی تھی۔ آخری صفحہ باقی تھا کہ رشو نے کھانا تیار ہونے کی اطلاع دی۔ میں کاغذ قلم وہیں چھوڑ کر کھانا کھانے اندر چلی گئی۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا اور نہ یہ خیال آیا کہ باہر میرے کاغذات پڑے ہیں۔

صبح آنکھ کھلتے ہی میں سب سے پہلے ڈرائنگ روم میں آئی۔ خون کا دھبا حسب سابق قالین پر موجود تھا۔ جما ہوا' خشک' کئی سال پرانا خون! میں پردے برابر کر کے ہاتھ منہ دھونے باہر نکل گئی۔

برآمدے میں پہنچ کر اپنے کاغذات پر نظر پڑی۔ میں جھک کر انہیں اٹھانے لگی تھی کہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اوپر والے صفحے پر کسی نے سرخ رنگ سے لکھا تھا۔ "بے گناہ قتل + ناکام پولیس = روح کا انتقام۔"

یہ تحریر میری نہیں تھی نہ رشو کا ہینڈ رائٹنگ معلوم ہوتا تھا۔ ذرا غور کیا تو ایسا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محسوس ہوا جیسے خون سے لکھا گیا ہے۔ اف خدایا! یہ اتنا خون کہاں سے آگیا؟ میں حیرت سے بڑبڑائی۔ پھر وہ کاغذ اٹھا کر سنبھال لیا۔ رشو اٹھ چکی تھی۔ اسے قالین صاف کرنے کا حکم دیا اور خود ٹیلی فون اٹھا کر برآمدے میں آگئی۔ وہاں بیٹھ کر اس مکان کے پہلے مالک کے نمبر ڈائل کئے اور اپنا نام پتہ بتاتے ہوئے اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اوہ آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟" اس نے چونک کر پوچھا۔

"جی ہاں اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" میں اطمینان سے بولی۔

"دراصل.......... اچھا آپ آج شام آجایئے۔ مفصل بات چیت ہوگی۔" اس نے کچھ کہنا چاہا' مگر پھر کچھ سوچ کر بات کو ملاقات پر ٹال دیا۔ "پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا ہے' ممکن ہے اسے سب کچھ معلوم ہو۔" میں نے سوچا۔

وقت مقررہ پر میں اس کے ہاں موجود تھی۔

"آپ فون پر کچھ کہنا چاہتے تھے؟" میں نے بات شروع کی۔

"آپ فرمایئے کس بات کو پوچھنے کے لیے یہاں آنے کی زحمت کی؟" اس نے میرا سوال نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ آپ اپنے مکان میں بالکل مطمئن زندگی گزار رہے تھے؟" میں نے براہ راست سوال پوچھا۔

"میں وہاں خود تو کبھی نہیں رہا۔ کئی سال سے یہیں رہ رہا ہوں وہ مکان کرائے پر اٹھائے رکھتا تھا۔ دراصل وہ میرے بھائی کے حصے میں آیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے اسے کرائے پر اٹھا دیا۔ اب یاد نہیں کتنے سال کرائے پر دیئے رکھا مگر پھر ایک دم یوں ہوا کہ جو کرایہ دار آیا' چند دنوں میں بوریا بستر سمیٹ کر رفوچکر ہوگیا۔ تنگ آکر میں نے کرائے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ پچھلے سال کاروبار میں کچھ نقصان ہوا تو اسے دوبارہ کرائے پر چڑھانا پڑا۔ لیکن اب بھی کوئی شخص دو ہفتوں سے زیادہ نہ ٹک سکا۔ تھک ہار کر میں نے اسے بیچ دینے کا ارادہ کیا۔" اس نے مفصل بتایا۔

"آپ کے کرایہ دار فوراً چلے جانے کی کوئی وجہ نہیں بتاتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی نے کھل کر کچھ نہیں کہا مگر ان کی بیویاں ضرور کہتی تھیں کہ رات بھر ہیبت ناک آوازیں انہیں پریشان کئے رکھتی ہیں اور کوئی صحن میں چپکے چپکے دبے پاؤں گھومتا

رہتا ہے۔"

"آپ نے خود تجربہ نہیں کیا؟"

"میں بزدل سا آدمی ہوں۔ قصے سن سن کر ایسا خوفزدہ ہوا کہ ادھر جانے کی ہمت نہیں پڑی۔" وہ بولا۔

"ذرا ذہن پر زور دے کر بتایئے یہ سلسلہ کب شروع ہوا تھا؟"

"غالباً آخری کرائے دار دو بھائی تھے۔ انہی دنوں ان کے والد فوت ہو گئے تھے اور ان کے درمیان اکثر جائیداد کی تقسیم کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ چند ماہ بعد صرف بڑا بھائی رہ گیا۔ چھوٹے بھائی کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ خود بھی مکان چھوڑ کر چلا گیا۔"

"اس کی رہائش کے دوران پولیس وغیرہ تو نہیں آئی تھی؟" میں نے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں' ہاں۔" اس نے سرہلایا۔ "ایک ہمسائے نے شکایت کی تھی کہ اردگرد کہیں کوئی لاش ہے کیونکہ جب ذرا تیز ہوا چلتی ہے تو بڑی سخت بدبو آتی ہے جیسے اردگرد کہیں کوئی لاش موجود ہو۔ پولیس کئی دن تک اسے تنگ کرتی رہی۔ سنا ہے ڈرائنگ روم میں تعفن سے سانس لینا تک دشوار تھا لیکن پورے کمرے میں انسان چھوڑ کسی چڑیا کی لاش بھی نہیں تھی۔ پولیس ناکام لوٹ گئی۔ بعد میں کرایہ دار مکان چھوڑ کر بھاگ گیا کہ پولیس اسے تنگ کرتی تھی۔"

"آپ کے پاس اس کرائے دار کا ایڈریس ہے؟"

"دیکھتا ہوں۔" وہ اٹھا اور مختلف کتابیں ٹٹولنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک گردآلود بوسیدہ سی ڈائری نکالی۔ اس کے ورق الٹتے ہوئے مجھے ایک ایڈریس لکھوایا۔ فیصل آباد کے قریب کسی گاؤں کا ایڈریس تھا۔

میں ایک صبح دیئے ہوئے پتے پر گاؤں جا پہنچی۔ وہاں معلوم ہوا جس سے ملنا تھا' اسے فوت ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔ یوں ایک گتھی حل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

O☆O

رات کے پچھلے پہر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والی چارپائی پر رشو بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے خواب آور گولیاں کھا رکھی تھیں۔ اچانک دروازے پر کسی نے دھیرے سے دستک دی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ دوبارہ دستک ہوئی۔ میں نے تپائی پر رکھا ہوا ریوالور اٹھایا اور دروازہ کھول دیا۔ باہر وہی لاش کھڑی تھی۔ اسے اتنا قریب پا کر جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ مجھے دیکھ کر وہ واپس جا رہی تھی۔ مجھے وہاں کھڑے کھڑے کتنی ہی دیر گزر گئی' لیکن اتنی ہمت نہ ہوئی کہ دروازہ بند کر دوں یا واپس اپنے بستر پر چلی جاؤں۔ تھوڑی دیر بعد جب ذرا حواس بجا ہوئے تو دوبارہ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کسی کو ذبح کیا جا رہا ہو اور وہ اپنی جان بچانے کے لیے چیخنا چاہتا ہو۔

میں وہیں منجمد ہو کر رہ گئی۔ ایک تو جنوری کی شدید سردی۔ اوپر سے یہ ڈرامہ۔ اب بات میری قوت برداشت سے باہر ہو رہی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے عنقریب میں بھی یہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔ رشو جیت جائے گی اور یہ گتھی یونہی الجھی رہے گی۔

انہی سوچوں میں وقت گزرتا گیا۔ پھر میں نے بستر پر پڑی شال اٹھائی اور اسے اپنے گرد لپیٹ کر باہر آ گئی۔ صحن کی طرف سے قدموں کی چاپ واضح سنائی دے رہی تھی لیکن وہ پراسرار وجود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ جلد ہی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے وضو کیا اور مصلے پر کھڑی ہو گئی۔ کتنا اطمینان تھا ان لمحات میں۔ کتنا سکون تھا خدا کی یاد میں۔ سب الجھنوں اور پریشانیوں کو بھول کر میں نماز پڑھ رہی تھی۔

صبح کا اجالا پھیلا تو مسز بٹ ملنے آ گئیں۔ انہوں نے بتایا کہ تابی رات سے مجھے بلوانے پر اصرار کر رہی ہے۔ میں نے تھوڑی دیر بعد آنے کا وعدہ کیا۔ وہ اٹھ کر جانے لگیں تو میں نے پوچھا۔ "ایک بات بتائیے' آپ سے پہلے جو لوگ آپ کے گھر میں رہتے تھے' وہ اب کہاں ہوتے ہیں؟"

"مال پر رہتے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "زبانی تو مجھے ایڈریس یاد نہیں گھر جا کر دیکھتی ہوں۔ فون کر کے آپ کو بتا دوں گی۔"

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ مسز بٹ نے ٹیلی فون پر ایڈریس بتا دیا۔ "آپ ہمارے ہاں آئیں گی ناں۔" انہوں نے اصرار کیا۔

"میں فارغ ہو کر آؤں گی۔ ابھی ایک دو ضروری کام کرنے ہیں۔ میری آمد تک

تابی کا خیال رکھیں اور اسے اوپر نہ جانے دیں۔"

"اوپر نہ جانے دوں؟" انہوں نے حیرت سے دہرایا۔

"جی ہاں۔ وہ خوفزدہ ہو جاتی ہے نا' اس لیے کہہ رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "اسے ہمارے صحن میں عجیب و غریب چیزیں نظر آتی ہیں۔ چاندنی رات میں ہار سنگھار کے پتے ہلتے ہیں تو ان کے بنتے بگڑتے سایوں سے فرش پر یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز حرکت کر رہی ہو اور تابی اس سے خوفزدہ ہو جاتی ہے۔"

"میں بھی یہی کہتی ہوں مگر وہ مانتی ہی نہیں۔" انہوں نے کہا۔ پھر اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔

مسز بٹ کے دیئے ہوئے ایڈریس پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ اندر سے ایک بوڑھا نکلا۔ میں نے اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ تیزی سے بولا۔ "آیئے۔ تشریف لایئے۔" اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے گزرنے کے لیے راستہ دے دیا۔ میں اندر چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ "میں نیٹو کو جانتا ہوں۔ بڑا فرض شناس ادارہ ہے۔ فرمایئے ہم سے کس سلسلے میں مدد درکار ہے؟"

"آپ پہلے ۱۶۶ نیمل سٹریٹ میں رہتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" جواب ملا۔

"آج کل میں ۱۶۷ میں رہتی ہوں۔ معلوم ہوا تھا کہ گزشتہ سال آپ اچانک یہ مکان بیچ کر چلے آئے تھے۔ اس کی کوئی وجہ بتا سکتے ہیں۔" میری نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ بوڑھے کا جھریوں بھرا چہرا ایک دم کملا گیا۔ چند منٹ فرش کو گھورتے رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"پہلے ہمارا مختصر سا کنبہ تھا۔ ہم نچلی منزل میں ہی رہتے تھے۔ اوپر کبھی کبھار ہی جانا ہوتا تھا۔ میں تو ویسے بھی ضعیف ہوں اوپر جانے سے کتراتا تھا۔ کچھ عرصے بعد دونوں بڑے بیٹے بھی ساتھ رہنے لگے تو ہمیں اوپر والا پورشن استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مجھے دائیں جانب والا کمرہ دے دیا گیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ اس کی ایک کھڑکی ۱۶۷ کی طرف کھلتی ہے اور وہاں سے سارا صحن خصوصاً ہار سنگھار والا کونا صاف نظر آتا ہے۔" وہ میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جی ہاں- پھر؟"

"میں اکثر بیمار رہتا ہوں- بڑھاپا بذات خود بیماری ہے اور بیماری پہلے نیند اور سکون چھین لیتی ہے- آپ کو معلوم ہی ہے؟" وہ پھر رک گیا-

"جی-"

"تو میں بھی بہت کم سویا کرتا تھا- رات گئے تک مطالعہ کرتا رہتا- اس رات پڑھتے پڑھتے جب کتاب پر سے نظر اٹھائی تو ۱۶۷ کے صحن میں کسی کو ٹہلتے دیکھا- بارہ بجے کا وقت ہوگا- اس وقت کسی کا اس طرح مٹرگشت کرنا بڑا عجیب سا معلوم ہوا- یوں بھی ان دنوں وہ گھر خالی تھا' اس لیے میں چونک اٹھا- غور سے دیکھا تو ٹہلنے والے کا چہرہ عجیب سا محسوس ہوا- نچا ہوا' خوفناک! وہ کچھ دیر تک یونہی ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا پھر ہار سنگھار کے درخت کے نیچے پڑے ڈسٹ بن میں گھس گیا- میں نے ساری رات جاگ کر گزار دی اور صبح مکان چھوڑ دینے پر اصرار کیا- باقی لوگ نہ مانے تب میں نے انہیں رات کا قصہ سنایا- ان کا خیال تھا کہ رات کے وقت میری آنکھوں کو دھوکا ہوا ہوگا- اگلے روز چھوٹی بہو نے انکشاف کیا کہ ساتھ والے مکان میں کسی کو قتل کر دیا گیا ہے کیونکہ اس نے مرنے والے کی چیخیں خود سنی ہیں- چند دن بعد میں نے آدھی رات کو پھر اس شخص کو دیکھا تو اپنے بیٹوں کو بلا کر دکھایا اور پھر ٹہلنے والا خوفناک شخص اور پراسرار چیخیں روز کا معمول بن گئیں- ہمارا راتوں کو سونا دشوار ہو گیا- تنگ آ کر ہم نے وہ مکان بیچ دیا اور یہاں آ گئے-"

مسلسل بولنے سے بوڑھے کا سانس پھول چکا تھا- اس لیے میں کچھ دیر خاموش رہی پھر پوچھا- "اور اس سے پہلے آپ نے پولیس کو اطلاع بھی دی تھی؟"

"ہاں- ان دنوں تعفن نے ہمارا جینا دوبھر کر رکھا تھا- وہ دو بھائی تھے- حامد اور محمود- سنا ہے دونوں کچھ جناتی عمل جانتے تھے- ایک دن حامد نے بتایا اس کے والد فوت ہو گئے ہیں- چند روز بعد دونوں بھائیوں کے درمیان دیر تک جھگڑا ہوتا رہا- وہ آدھی رات تک لڑتے رہے پھر محمود کی چیخیں سنائی دیں- اس کے بعد مکمل سناٹا چھا گیا- ہم نے صبح بدبو کا بہانا بنا کر پولیس کو اطلاع دی مگر وہ لاش برآمد نہ کر سکی- حامد نے بتایا کہ محمود کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر گیا ہے- ہمارا شک یقین میں بدل گیا کہ اس نے محمود کو

ز رکے لاش کہیں غائب کر دی ہے- پھر واقعی بدبو کی انتہا ہو گئی- یہ بدبو ڈرائنگ روم ے آتی تھی لیکن وہاں کسی لاش کا نشان تک نہ تھا- نہ فرش کی اینٹیں اکھاڑنے کے کوئی ثار تھے-"

"اور وہ شخص جسے آپ ٹہلتے ہوئے دیکھتے تھے' اس کی شکل کیا محمود سے ملتی تی؟"

"نہیں' اس کی شکل عجیب سی تھی- وہ سرے سے انسان لگتا ہی نہیں تھا-"

میں کچھ دیر وہاں بیٹھی رہی پھر اٹھ کر چلی آئی- واپسی پر آفس میں رک گئی- فیض ن کے گھر میں وہ شخص ابھی تک حصار کے اندر بیٹھا ہوا تھا- دو تین دوسرے کیس جو نے شروع کیے تھے اسی طرح ادھورے پڑے تھے-

"کیا بات ہے کچھ پریشان نظر آتی ہو؟" باس نے پوچھا- میں نے انہیں سارا قصہ یا- جب میں خونی تحریر تک پہنچی تو وہ چلا کر بولے- "وہ مارا-"

"کیا؟" میں حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگی-

"بات صاف واضح ہے پولیس کی ناکامی کے بعد محمود کی روح خود انتقام پر تل گئی -" وہ بولے-

"یہی بات میں نے بھی سوچی تھی-" میں نے کہا- "لیکن کئی پوائنٹ میرے ذہن بل حل ہیں- اگر محمود کی روح انتقام لینا چاہتی ہے تو وہ برسوں سے صرف گھر میں کیوں تی ہے؟ ڈرائنگ روم میں اپنے قتل کا ڈرامہ کیوں رچاتی ہے اور اب جبکہ حامد بھی طبعی موت مر چکا ہے وہ کس سے انتقام لے گی' کیوں کرلے گی؟"

"آں.......... ں-" باس سوچ میں پڑ گئے- "یہ بات تو ہے- کل "آستانہ فیض" گے- دیکھیں ہمارے عامل انصار صاحب اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"

اگلے دن میں وقت مقررہ پر "آستانہ فیض" پہنچی- وہاں باس ان کے سیکرٹری' ر صاحب' فیض الحسن اور ان کے بھائی پہلے سے موجود تھے-

"سٹ ڈاؤن! اصل میں فیض الحسن والا کیس تم سے بھی متعلق رہا ہے- تمہیں اس کے انجام سے دلچسپی ہوگی-" باس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا- میں بیٹھ گئی صار صاحب نے کہنا شروع کیا- "فیض الحسن کے والد مولوی عنایت کے قبضے میں جن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھے' انہوں نے ساری عمران جنوں سے بے شمار کام لئے۔ بڑھاپے میں انہوں نے سب ک
آزاد کر دیا تھا لیکن ایک ابھی تک ان کے قبضے میں تھا۔"

"انہوں نے اسے آزاد کیوں نہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"شاید کسی شخص سے بچنے کے لیے یا اپنی حفاظت کا انتظام مقصود تھا۔" انصا
صاحب نے جواب دیا۔

"پھر؟" فیض الحسن کے بھائی نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

"بدقسمتی سے مولوی صاحب کو یہ جن آزاد کرنے کا موقع نہ ملا اور وہ فوت
گئے۔" انصار صاحب نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "جن کو قابو کرنے کے بعد
احتیاط بے حد ضروری ہوتی ہے کہ اسے سرکش نہ ہونے دیا جائے۔ اس شخص کی وفا
کے بعد جن سرکش ہو جاتے ہیں۔ یہی کچھ مولوی عنایت کے ساتھ ہوا۔ ان کی وفات
بعد یہ سرکش جن ان کی قبر کے گرد گھومتا رہا۔ ہنگامے بھی کئے لیکن اس سے اس کی ت
نہ ہوئی۔ آخرکار وہ مولوی عنایت کی قیامگاہ میں اودھم مچانے لگا۔ اس کی شرارتوں
فیض الحسن اور عماد الحسن کو مشکلات اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب وہ جن میرے
میں ہے۔ میں چاہوں تو اسے انہیں تنگ کرنے کی سزا دے کر آزاد کر دوں یا اپنے
میں رکھوں۔"

"اباجی نے تو کبھی اس قسم کا ذکر نہیں کیا۔" فیض الحسن نے زبان کھولی۔

"یہ انہوں نے اور بھی اچھا کیا' ورنہ آپ کی جانیں نہ صرف خطرے میں ہو
بلکہ اب تک آپ سب ختم ہو چکے ہوتے۔" انصار صاحب بولے۔

"آپ اس کا اب کیا کریں گے؟" عماد الحسن نے پوچھا۔

"دراصل جن کو قابو کرنے سے زیادہ طویل اور خوفناک عمل اسے آزاد کر
ہوتا ہے۔ یوں بھی میرے پاس پہلے ہی خاصی تعداد میں "ملازم" ہیں' اس لیے میں
جنوں کو سزا دے کر آزاد کر دیا کرتا ہوں۔"

"لیکن اسے لوگوں کو تنگ کرنے کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔" سیکرٹری نے
دی۔

"لیکن اسے سزا کیا دیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے کسی گہرے اور ویران کنوئیں یا کھائی میں تمام عمر کے لیے قید کر دوں گا
اں اس کے دوست اور ساتھی اسے ملنے آ سکیں گے مگر وہ کہیں نہیں جا سکے گا۔" انصار
اب نے بتایا۔

"اس سے سخت سزا کوئی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ان کے لیے یہ سب سے شدید سزا ہے' کیونکہ ان کا کوئی ٹھوس جسم تو ہوتا نہیں
کوڑے لگا کر تکلیف پہنچائی جا سکے۔" انصار صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "سزا یافتہ جن
س سزا سے اکتا کر جلد ہی خود کو ختم کر لیتے ہیں اور یہ مدت چند ماہ سے چند سال کی ہو
ی ہے' کیونکہ جن سیلانی ہوتے ہیں' گھومنا پھرنا ان کے لیے لازمی ہے قید کی ایک ایک
ڑی ان کے لیے قیامت ہوتی ہے۔ یہ جس شخص کے قبضے میں ہوتے ہیں تمام وقت
کے ساتھ نہیں رہتے۔ ایک خاص عمل سے بوقت ضرورت بلا لئے جاتے ہیں ورنہ
زاد پھرتے ہیں۔ یہاں کے حالات اور واقعات کا سرسری جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے
پہنچا ہوں کہ حامد نے محمود پر کوئی جناتی عمل کر دیا تھا۔ محمود کی روح اس گھر سے باہر
یں جا سکتی۔ اپنی قید اور پولیس کی ناکامی نے اسے انتقام لینے والی بدروح بنا دیا ہے تاہم
کی حقیقت جاننے میں ابھی چند دن اور لگیں گے۔" انصار صاحب اپنی بات مکمل کر
خاموش ہو گئے۔

چند دن بعد وہ ہمارے مکان پر حاضر ہوئے۔ ہار سنگھار کا درخت اسی شان سے کھڑا
۔ کچرے کا ڈرم بھی اسی حالت میں تھا۔ انصار صاحب نے اسے ایک ٹھوکر ماری۔ ڈرم
چھلتا ہوا کئی گز دور جا پڑا۔ ڈرم کے عین درمیان والی زمین میں آدھ انچ چوڑا سوراخ
۔ انصار صاحب نے ہار سنگھار کے درخت کی ایک ٹہنی توڑ کر اس سوراخ میں پھنسا
۔ اس سے سوراخ بالکل بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد گھٹی گھٹی سی چیخیں سنائی دینے
یں۔ پھر زمین پر کچھ فاصلے پر ایک سوراخ بن گیا۔

انصار صاحب تمام رات حصار میں بیٹھے قرآنی آیات کا ورد کرتے رہے۔ صبح
ہ کچھ بتائے بغیر کہیں چلے گئے۔ مجھے ایک کیس کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑا۔
ن بعد واپسی ہوئی۔ تیسرے دن انصار صاحب کا پیغام ملا۔ "انجام دیکھنا ہے تو ہفتے کے
ن گھر پر ہی رہنا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہفتے کے دن وقت مقررہ پر گھر میں داخل ہوئی تو انصار صاحب پہلے سے موجود تھے۔ رشو بٹ صاحب کے گھر تھی۔ برآمدے میں ایک تابوت پڑا تھا۔ انصار صاحب عجیب سا حلیہ بنائے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی زور سے چلائے۔ "ادھر مت آنا وہیں رہو۔" میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

چاروں طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ ابھی چاند نہیں نکلا تھا۔ پورے گھر میں صرف برآمدے کی لائٹ آن تھی۔ میں کوریڈور میں کھڑی تھی۔ جہاں سے برآمدے اور صحن کا سب منظر صاف نظر آ رہا تھا۔

ڈرائنگ روم میں لگے کلاک نے گیارہ بجائے۔ میں نے باہر دیکھا۔ انصار صاحب اکڑوں ہو کر بیٹھے تھے۔ یکایک تابوت میں حرکت ہوئی اور اس کا ڈھکنا تھرتھراتا ہوا اوپر اٹھا۔ اگلے ہی لمحے ایک انسانی ہیولا سا نظر آیا اور محسوس ہوا جیسے کوئی زندہ لاش آہستہ آہستہ اس میں سے باہر نکل رہی ہو۔ معاً مجھے صحن میں کسی اور شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بے اختیار گردن موڑ کر دیکھا تو ڈرم والی جگہ پر ایک اور ہیولا سا نظر آیا۔ نُچا ہوا، مسخ شدہ خدوخال۔ یہ محمود کی بے چین و بے قرار روح تھی جو مجھے اور رشو کو اکثر صحن میں ٹہلتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بیک وقت شدید نفرت اور خوف جھلک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی جائے پناہ کی تلاش میں ہو۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک عجیب و غریب واقعہ رونما ہوا، پلک جھپکتے میں حامد کی گردن محمود کے ہاتھ میں تھی، اور پوری قوت سے اس کا گلا دبا رہا تھا۔ گھٹی اور خوفزدہ چیخیں رات کے سناٹے میں گونج رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد حامد کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور........... اور پھر اچانک دونوں ہیولے غائب ہو گئے، اور ہر طرف گہری خاموشی اور سناٹا چھا گیا۔ گویا یہاں کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ حامد نہ محمود۔ نہ روح نہ بدروح۔

انصار صاحب نے وہ رات وہیں گزاری۔ سارا وقت حصار کے اندر ہی اکڑوں بیٹھے رہے۔ سحری کے وقت اس دائرے سے باہر نکلے، میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا۔ "ڈرامہ ختم۔ اب اطمینان سے یہاں رہیے۔ کوئی چیز آپ کو پریشان نہیں کرے گی۔ میں تابوت صبح منگوا لوں گا۔"

جواب میں، میں بھی دھیرے سے مسکرا دی۔ انہیں الوداع کہہ کر واپس صحن میں آئی تو ہار سنگھار کے درخت کے اوپر سے پچھلی رات کا زرد چاند طلوع ہو رہا تھا۔

ناگ کی داسی

اس قدیم حویلی کے بارے میں ہر شخص اپنے ذہن کے مطابق قیاس کرتا تھا۔ لراف و اکناف میں وہ بھوت گھر کے نام سے مشہور تھی۔ اندھیری راتوں میں لوگ حویلی ے قریب سے گزرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے حالانکہ عام حالات میں حویلی کے قریب ے گزرنے والوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ قرب و جوار کی عورتیں اپنے بچوں کو ت گھر کا نام لے کر ڈراتی تھیں۔ "چپ ہو جا نہیں تو بھوت گھر میں لے جا کر چھوڑ ں گی۔" بچوں کے لیے بھوت گھر کا نام ہی کافی ہوتا تھا۔ بچوں میں اس حویلی کے بارے ا بہت سے قصے، کہانیاں اور واقعات مشہور تھے۔ گاؤں کا ہر بچہ حویلی کے بارے میں ائیں کہانیاں اپنے ذہن میں بٹھائے ہوئے تھا۔ "سنا تم نے کل رات کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"رمضان کا بیل حویلی کی طرف نکل گیا۔ پھر کیا تھا۔ حویلی کی چھت سے ایک آگ لا تیزی سے بیل کی طرف بڑھا۔ جیسے بیل کی نظر آگ کے گولے پر پڑی وہ چرنا چھوڑ بھاگ کھڑا ہوا۔ اب بیل آگے آگے اور گولہ پیچھے پیچھے۔ رمضان کے کھیت کے بیچ جو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کنواں ہے نا' بیل اس میں چھلانگ لگانے ہی والا تھا کہ آگ کا گولہ اس کے آگے آ گیا۔ پھر جتنی دیر میں بیل پیچھے مڑ کر بھاگتا۔ آگ کے گولے نے بیل کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا۔"

"لیکن یار یہ سب دیکھ کون رہا تھا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں' یہ رمضان کی بیٹی نے خود مجھے بتایا۔"

"رمضان کی بیٹی' ابے یار وہ بہت جھوٹ بولتی ہے۔ اس کا ایک جھوٹ تو میں نے پکڑ ہی لیا۔ کہہ رہی تھی۔ دن کے ٹھیک بارہ بجے حویلی کی چھت پر ایک بڑا سا الو بیٹھتا ہے آ کر اور اس الو کی گول گول آنکھوں سے شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ جس کی بھی اس الو پر نظر پڑتی ہے شعلے اس کی طرف لپکتے ہیں۔"

"تم نے اس الو کو دیکھنے کی کوشش کی ہوگی؟"

"ہاں کئی بار کوشش کر چکا ہوں' لیکن سالا الو مجھے تو کبھی نظر نہیں آیا۔"

"ابے تجھے ڈر نہیں لگا الو کو دیکھتے ہوئے؟"

"دن میں یار مجھے ڈر نہیں لگتا۔ پھر میں تو کئی بار حویلی کے اندر بھی جا چکا ہوں۔"

"حویلی میں تو میں بھی بہت مرتبہ گیا ہوں۔ میرا بابا تو حویلی میں ہی کام کرتا ہے اس کے ساتھ میں کبھی کبھی چلا جاتا ہوں۔"

"پھر تو تم اماں راحیلہ سے بھی ملے ہو گے؟"

"کیوں نہیں' وہ بہت اچھی عورت ہے۔ بڑی محبت سے پیش آتی ہے۔ مگر یار اس کی آنکھوں سے خوف آتا ہے۔ کاش اس کے چہرے پر آنکھیں نہیں ہوتیں۔"

"میں نے تو کبھی اس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بس سر جھکائے اس کی باتیں سنتا رہا۔ میرے ماموں کہہ رہے تھے کہ اماں راحیلہ کی آواز مندر میں بجنے والی گھنٹیوں کی طرح ہے۔ جب وہ بات کرتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے بہت سارے پجاری ایک ساتھ گھنٹیاں بجا رہے ہوں۔"

"حویلی میں ایک مندر بھی تو ہے۔"

"ہاں ہے' لیکن میں کبھی مندر کے قریب نہیں گیا۔"

"اچھا ہوا تو نے ادھر جانے کی کوشش نہیں کی' اگر کرتا تو تجھے روک دیا جاتا۔"

نے تو جیسے ہی مندر کی طرف قدم بڑھایا پیچھے سے حویلی کے مالی کی آواز آئی۔ لڑکے مندر کی طرف مت جانا۔ بری بات ہے چلو' واپس آؤ۔"

"تو نے مالی سے پوچھا نہیں کہ ادھر کیوں نہ جاؤں؟"

"پوچھا تھا اس نے کہا کہ اماں راحیلہ کی اجازت نہیں ہے۔ وہ اس طرف کسی کو جانے ہی نہیں دیتی۔"

"کیا وہ دیکھتی رہتی ہے کہ کون مندر کی طرف جا رہا ہے اور کون نہیں۔"

"دیکھتی تو نہیں رہتی یار مگر اسے اطلاع ہو جاتی ہے۔"

"کیسے اطلاع ہو جاتی ہے؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا' لیکن ماموں کہہ رہے تھے کہ کئی لوگوں نے دن ہی نہیں راتوں میں بھی مندر کی طرف جانے کی چوری چھپے کوششیں کی تھیں لیکن اماں راحیلہ کو خبر ہو گئی اور اس نے اپنے خاص آدمی بھیج کر مندر کی طرف جانے والوں کو پکڑ لیا۔"

"اماں راحیلہ کے خاص آدمی کون ہیں؟"

"چھ سات سابق فوجی ہیں جو دن رات حویلی ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی گاؤں میں ان میں سے دو تین نظر بھی آتے ہیں مگر وہ نہ کسی سے بات کرتے ہیں اور نہ دوستی۔"

"چھوڑ یار تو ان فوجیوں کو۔ یہ بتا کہ پھر اس بیل کا کیا ہوا' آگ کا گولہ اس کے گرد چکر لگا رہا تھا پھر.........."

"پھر مجھے پتہ نہیں' رابعہ بتا ہی رہی تھی کہ رمضان کی بیوی نے آواز دی اور وہ سالی بھاگ کر گھر میں چلی گئی۔"

"یہی تو سالی مصیبت ہوتی ہے' کوئی بھی پوری بات نہیں بتاتا۔"

بچے ہی نہیں گاؤں کے سبھی لوگ حویلی کے بارے میں دن کے کسی لمحے میں گفتگو ضرور کرتے تھے۔ عورتیں تو بیکاری کا سارا وقت حویلی' راحیلہ' اس کے ملازمین' حویلی میں واقع مندر' اندھا کنواں' حویلی کی چھت' حویلی کے تین بند رہنے والے کمروں' اماں راحیلہ کی آنکھیں اور اس کے لے پالک امانت علی کے بارے میں گفتگو کر کے گزارتی تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راحیلہ زیب کی عمر ستر پچھتر سال سے کم نہیں تھی لیکن وہ دیکھنے میں چالیس پینتالیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ سر کا ایک بال بھی سفید نہیں ہوا تھا۔ سارے دانت موجود تھے۔ چہرے' ہاتھ اور گردن پر کوئی جھری نہیں تھی۔ شام کے چھ بجے جب وہ کسی بھی ہلکے رنگ کی ساڑھی باندھے' لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرائے حویلی کے وسیع و عریض احاطے میں ٹہلتی تو یوں لگتا جیسے کوئی قیامت چہل قدمی کر رہی ہو۔ گورا چٹا رنگ' کھڑی ناک' کشادہ پیشانی' دلوں میں گدگدی کرنے والے انداز کے رس بھرے ہونٹ' صراحی دار گردن' سروقد اور چال ایسی کہ جیسے نسیم سحر کے جھونکے ہوں۔ راحیلہ زیب کی آنکھیں عجیب تھیں۔ ان کی بناوٹ کا صحیح اندازہ لگانا اور ان کے رنگ کے بارے میں یہ کہنا کہ سبز' بھوری' سیاہ یا سیاہی مائل بھوری اور سبز ہیں کتنا غلط ہی تھا۔ آنکھوں کی بناوٹ اور رنگ عجیب و غریب ہی تھا اور شاید ہی کوئی ایسا ہو گا جو براہ راست ان کی طرف دیکھنے کی جرات کر سکے۔

جب راحیلہ زیب کی عمر چالیس سال تھی تو اس نے اپنے باپ کے مشورے سے امانت علی کو گود لیا تھا۔ امانت علی کی عمر اس وقت صرف ڈھائی سال تھی اور اس کی ماں کو مرے ہوئے صرف تین دن ہوئے تھے۔ امانت علی سے راحیلہ زیب کا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش کے صرف ڈھائی سال بعد ایک رات اس کی ماں کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ چند ساعتوں ہی میں مر گئی۔ تین دن بعد راحیلہ زیب نے اس کسان کو بلایا اور کہا کہ وہ اپنا بیٹا اسے دے دے۔ کسان انکار کی جرات نہیں کر سکا۔

راحیلہ زیب کنواری تھی' اس لیے کسان کا خیال تھا کہ ناتجربہ کار راحیلہ اس کے بچے کی جان لے لے گی' لیکن راحیلہ زیب نے امانت علی کی پرورش' تعلیم و تربیت کا خیال بالکل سگی ماں ہی کی طرح کیا۔ جب امانت علی دس سال کا ہوا تو اس کا باپ بھی مر گیا۔ اس طرح امانت علی کا کوئی وارث نہیں رہا نہ ہی امانت علی کو جوان ہونے تک یہ علم تھا کہ وہ راحیلہ زیب کا لے پالک ہے۔ جب لوگوں نے اسے بتایا کہ راحیلہ زیب اس کی سگی ماں نہیں ہے تو اسے یقین نہیں آیا کیونکہ راحیلہ کا سلوک اس کے ساتھ سگی ماں سے بھی کہیں زیادہ بہتر تھا۔

اپنے والد اورنگ زیب کے انتقال کے بعد راحیلہ نے اپنی ہزاروں ایکڑ زمین اور باغات اپنے عزیز و اقارب میں تقسیم کر دیئے۔ حویلی سے ملحقہ ایک باغ اور یہ جدی پشتی حویلی اس نے اپنے لئے رکھ لی تھی۔ اورنگ زیب کا ایک لڑکا وجاہت علی نوجوانی ہی میں افریقہ کے کسی ملک میں جا بسا تھا۔ پانچ سات سال تک اس کا رابطہ رہا اور پھر اچانک ہی منقطع ہو گیا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اورنگ زیب نے اپنے لڑکے کی تلاش شروع کی تھی لیکن انہیں اس کا پتہ نہیں چلا اور ایک رات وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

مرتے وقت اورنگ زیب کی عمر ایک سو ایک سال تھی اور اس عمر میں بھی تندرست و توانا تھے۔ اگر وہ حویلی کی چھت سے اندھے کنوئیں میں نہ گرتے تو ان کے مرنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ وہ کئی دنوں سے حویلی کی چھت پر جانے لگے تھے اور وہاں کئی کئی گھنٹے رہتے تھے۔ چوتھے دن جب وہ چھت پر جا رہے تھے تو راحیلہ نے کہا تھا۔ "بابا چھت پر جانے کا جو سلسلہ آپ نے شروع کیا ہے وہ کچھ مناسب نہیں ہے۔ ملازمین آپ کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور مجھے کوفت ہوتی ہے۔" لیکن اورنگ زیب نے چھت پر جانا بند نہیں کیا اور آخر کار وہیں پراسرار حالت میں اس کی موت ہو گئی' اصل میں وہاں سے وہ ایک اندھے کنوئیں میں گر گیا اور کیسے گرا یہ بات کوئی نہ جان سکا۔

اس حادثے کی اطلاع گاؤں کی پولیس کو دی گئی۔ تھانیدار کئی سپاہیوں کے ساتھ حویلی آیا۔ لوگوں کے بیانات لئے اور اپنی سی کوشش لاش نکالنے کے سلسلے میں بھی کی۔ کنواں بہت گہرا تھا۔ سرچ لائٹ کی روشنی بھی تہہ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ کئی لوگ رسی کی مدد سے نیچے اترے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی تیزی سے اوپر آ گئے۔ ان کا بیان تھا کہ پندرہ بیس فٹ کے بعد ہی اندر اتنی گھٹن ہے کہ چند لمحے رکنا بھی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ بہرحال اورنگ زیب کی لاش نکالی نہیں جا سکی۔ حویلی میں کئی دنوں تک سوگ رہا اور پھر لوگ اورنگ زیب کو بھول بھال گئے۔

دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ حویلی میں ہر دور میں ایک کنواری رہی اور اس کی شادی بھی کرنا چاہی تو نہ ہو سکی۔

راحیلہ کی عمر جب سترہ سال ہو گئی تو اس کی والدہ نے اپنے بھائی کے لڑکے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے رشتے کی بات کی۔ اورنگ زیب سالے کے لڑکے کو اپنی لڑکی دینے پر تیار نہیں تھے لیکن بعد میں تیار ہو گئے۔ ابھی بات چیت آخری مرحلے میں بھی نہیں پہنچی تھی کہ وہ لڑکا ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ راحیلہ کی پھوپی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اس لڑکے کے مرنے کے دو سال بعد جب راحیلہ کی عمر انیس سال تھی ایک رشتہ خاندان ہی میں سے آیا۔ اورنگ زیب نے فوراً ہاں کہہ دی۔ شادی کے انتظامات چٹ پٹ کئے گئے۔ بارات گاؤں سے چل پڑی۔ شادی کی خوشی میں حویلی کو سنوارا سجایا گیا۔ دور دور کے مہمان حویلی میں جمع تھے۔ شہنائیاں بج رہی تھیں گاؤں کی لڑکیاں ڈھولک پر شادی کے گیت الاپ رہی تھیں۔

بارات کو عصر کے وقت پہنچنا تھا۔ حویلی اطلاع پہنچ گئی تھی کہ گاؤں سے بارات چل پڑی ہے۔ حویلی والے گاؤں اور جہاں سے بارات آ رہی تھی اس گاؤں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا وہاں سے سہ پہر کے وقت بیل گاڑیوں کا ایک قافلہ روانہ ہوا تھا۔ بارات کا استقبال کرنے کے لیے سارا گاؤں ہی حویلی کے سامنے جمع تھا۔ عصر کے وقت تک لوگوں نے بڑی بے چینی سے بارات کا انتظار کیا۔ عصر کا وقت گزر گیا لوگوں کی بے چینی میں قدرتی طور پر اضافہ ہوا اور پھر کچھ لوگوں کو اس راستے پر دوڑایا گیا جس راستے سے بارات آ رہی تھی۔ مغرب کے بعد وہ لوگ واپس آئے۔ ان کے ساتھ ایک بری خبر بھی گاؤں پہنچی تھی کہ دولہا کو آدھے راستے ہی میں ایک خطرناک سانپ نے ڈس لیا۔ وہ سانپ اتنا زہریلا تھا کہ چند لمحوں ہی میں دولہا کی لاش بری طرح نیلی ہو گئی۔

راحیلہ کی پھوپی سے پہلے جو کنواری تھی اس کے ہونے والے دولہا کو بھی سانپ ہی نے ڈس لیا تھا اور اس کا رنگ بھی ذرا سی ہی دیر میں نیلا کانچ جیسا ہو گیا تھا۔ راحیلہ کی یہ بارات آخری بارات تھی اس کے بعد نہ کسی خاندان کے لڑکے کے والدین کو جرات ہوئی کہ وہ رشتہ لے کر حویلی پہنچے اور نہ ہی کسی غیر خاندان سے اس کا کوئی رشتہ آیا۔ جب راحیلہ پچیس سال کی عمر کو پہنچی تو اس کی وجہ سے گاؤں کے ایک خوبصورت اور توانا جوان کی موت واقع ہوئی۔

منصور گاؤں کے ایک کسان کا لڑکا تھا۔ ایک دن راحیلہ اور اس کا سامنا ہوا اور وہ راحیلہ پر مرمٹا۔ وہ راحیلہ کا اتنا دیوانہ ہوا کہ اسے اپنی حیثیت کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ

مختلف بہانوں سے حویلی جانے لگا۔ کہیں نہ کہیں راحیلہ اس سے ٹکرا جاتی۔ ایک دن موقع دیکھ کر منصور نے اظہار محبت کر دیا۔ راحیلہ کے لبوں پر ایک اداس سی مسکراہٹ رقص کرنے لگی اور پھر اس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے شدید محبت کرتے ہو لیکن میں تم سے محبت کا اظہار کر کے تمہاری جان لینا نہیں چاہتی۔"

"میں سمجھ گیا تمہاری بات!" منصور نے کہا۔ "میں چھوٹے باپ کا بیٹا ہوں اس لیے بارات لے کر حویلی میں نہیں آ سکتا لیکن اگر تم............"

"نہیں، میں تمہارے ساتھ فرار نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ جس دن میں نے تمہارے ساتھ بھاگنے کا ارادہ کر لیا اسی دن تم اس دنیا میں نہیں رہو گے۔"

"یہ تمہارا وہم ہے۔" منصور نے کہا۔ "میں جاہل نہیں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اتفاقات کو لوگ............"

"نہیں یہ اتفاقات نہیں ہیں، صدیوں سے حویلی میں ایک کنواری موجود رہی ہے جب بھی اس کنواری کی شادی کی کوششیں ہوئیں دولہا اس دنیا میں نہیں رہا۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ بھاگنے پر راضی نہ ہونا میں تمہیں کسی طور لے جاؤں گا۔ یہ سمجھ لیں کہ ایک طرح اغوا کے انداز میں کیونکہ بہرحال یہ اغوا تو نہ ہو گا۔"

اس گفتگو کے دوسرے ہی دن منصور راحیلہ کو حاصل کرنے کی نیت اور بندوبست سے گھر سے باہر نکلا۔ اس نے ابھی چند قدموں کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اس کا حشر بھی دولہا جیسا ہی ہوا۔ اس کی لاش گاؤں کی ایک پگڈنڈی پر ہی نیلی پڑی تھی۔ اسے بھی کسی موذی سانپ نے ڈس لیا تھا۔ اس کی موت کا اصل سبب گاؤں والوں کو معلوم نہیں تھا وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ ایک حادثہ ہے، جبکہ راحیلہ جانتی تھی کہ منصور کیوں مرا۔ اس کے بعد مشتاق نامی ایک نوجوان نے بغیر شادی کے ہی اس کے ساتھ وہ سب کچھ کرنا چاہا جو شادی کے بعد ہوتا ہے لیکن عین وقت پر جب وہ راحیلہ سے فیض یاب ہونے جا رہا تھا سانپ نے ڈس لیا۔

اس سانپ کو راحیلہ نے بھی مشتاق کو ڈس کر جاتے دیکھا۔ یہ تو وہی سانپ ہے۔ راحیلہ نے سانپ کے جانے کے بعد سوچا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے اس سانپ یا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ناگ کو کتنی بار دیکھا ہے۔ بعض اوقات تو اس نے یہ بھی محسوس کیا تھا جیسے یہ ناگ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ بستر پر ہی بیٹھی غور کرتی رہی۔
پہلی بار یہ سانپ اسے اس دن نظر آیا تھا جس دن اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا اور پھر ہر چاند کی چودھویں رات کو یہ ناگ اسے نظر آ جاتا تھا۔ یہ ایک عجیب بات تھی کہ اس ناگ سے اسے نہ پہلے دن خوف محسوس ہوا تھا نہ ہی اس کے بعد وہ کبھی خوفزدہ ہوئی۔
اس وقت بھی وہ خوفزدہ تو نہیں تھی لیکن مشتاق کی موت نے اسے لرزا دیا تھا۔ ایک سوال اس کے ذہن میں تیزی سے گردش کر رہا تھا کہ اب وہ مشتاق کو باہر کیسے لے جائے گی۔ بیڈ روم میں مشتاق کی لاش کا ملنا بدنامی کا باعث بھی ہو سکتا تھا۔

خاصی دیر اس مسئلے پر غور کرنے کے بعد وہ بیڈ سے نیچے آئی اور اپنے کپڑے درست کرنے کے بعد اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ باہر سناٹے کا راج تھا۔ دروازہ کھلا ہی چھوڑ کر راحیلہ یہ سوچتی ہوئی مشتاق کی طرف مڑی کہ پاؤں پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسے کمرے سے باہر تو کسی نہ کسی صورت کر ہی دیا جائے۔ اتنی دیر میں مشتاق نہ صرف اکڑ گیا تھا بلکہ اس کا رنگ بھی نیلا پڑ گیا تھا۔ راحیلہ نے اس کے دونوں پاؤں کو اپنی گرفت میں لیا تو اسے یوں لگا جیسے اس نے برف کی دو ہلکی پھلکی لکڑیوں کو اٹھا لیا ہو۔ بغیر طاقت صرف کئے ہی مشتاق کی ٹانگیں اس نے اٹھا لی تھیں۔ پھر جیسے ہی اس نے دروازے کی طرف کھینچا تو وہ کھنچتا ہی چلا گیا۔ مشتاق بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

اپنے بیڈ روم کے دروازے پر رک کر اس نے لمحہ بھر سوچا اور پھر وہ مشتاق کی ہلکی پھلکی، ہری نیلی لاش کھینچتی ہوئی آیا ماں کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ راحیلہ کو ایسا کرتے ہوئے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مشتاق کی لاش کو آیا ماں کے کمرے کے آگے ڈال کر جب وہ واپس ہوئی تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ "کو............ کون............ کو............ن ہے؟" راحیلہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر سرگوشی کی۔

"رکھوالا............ تمہارا رکھوالا۔" راحیلہ کی سماعت سے آواز ٹکرائی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے در و دیوار سے پھنکاریں پھوٹ رہی ہوں۔ "تم............ تم میر............ی امانت ہو............"

اس کے بعد کمرے میں پہنچنے تک راحیلہ نے کوئی آواز نہیں سنی، لیکن جو آواز اس نے سنی تھی وہی اس کے دماغ کی گونج بازگشت بن گئی تھی۔ "رکھوالا............ تمہارا رکھوالا............ تم میری امانت ہو............ رکھوالا............ امانت............ میری............ ہو تم............ امانت............ رکھوالا............ امانت............" کمرے میں پہنچنے کے بعد اس نے سر کو کئی بار جھٹکے دیئے جیسے اس بازگشت سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہو۔ پھر اس نے سوچا اب لیٹ جانا چاہئے۔ یہی سوچ کر اس نے بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہے شب خوابی کا لباس پہنا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نادیدہ ہستی اس کے وجود کے مخفی گوشوں سے کھیل رہی ہو۔ ایک کیف، ایک لذت پیدا ہوئی اور اپنے عروج پر پہنچ کر دم توڑ گئی اور جیسے اسے ایک گہرا سکون میسر آ گیا۔

صبح بیدار ہوئی تو اس کا خیال تھا کہ مشتاق کی موت نے حویلی میں خاصا ہنگامہ برپا کر دیا ہو گا کہ آیا ماں کی بہرحال حویلی میں ایک حیثیت تھی لیکن جب وہ نہا کر اور لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم سے باہر آئی تو ہر کام معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ ناشتے کی میز پر گئی۔ چونکہ سب لوگ ناشتہ کر چکے تھے اس لیے اسے تنہا ہی ناشتہ کرنا پڑا، چائے کا آخری گھونٹ لے کر اس نے کپ میز پر رکھا ہی تھا کہ آیا ماں کمرے میں داخل ہوئیں۔ "لو تم یہاں بیٹھی ہو راحیلہ میں تمہیں دیکھنے تمہارے کمرے تک گئی تھی۔ آج تمہیں بیدار ہونے میں دیر ہو گئی۔"

"کیوں آیا ماں کوئی خاص بات؟" راحیلہ نے اپنے چہرے کو سپاٹ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"خاص تو زیادہ نہیں لیکن رات مشتاق کہیں گیا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔"

"آپ سے پوچھ کر گیا تھا؟"

آیا ماں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ "ہاں مجھے کچھ ایسا یاد تو پڑتا ہے کہ وہ مجھ سے کہہ کر ہی گیا تھا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ دس بجے سے پہلے آ جانا ورنہ حویلی بند ہو جائے گی۔ اس نے وعدہ بھی شاید کیا تھا۔ عجیب ہو گیا ہے ذہن کچھ یاد ہی نہیں آتا۔ بعض وقت مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ رات گئے تک میرے کمرے ہی میں تھا اور پھر میری آنکھ لگی تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ نکل گیا' کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سرِشام ہی پوچھ کر کہیں گیا ہو۔"

"حویلی کے گیٹ سے پتہ کیا تھا؟"

"ہاں پوچھ آئی ہوں؟" آیا ماں نے کہا۔ "دونوں چوکیدار کہتے ہیں کہ نہ انہوں نے مشتاق کو نکلتے دیکھا نہ آتے ہی دیکھا ہے۔"

"آ جائے گا آیا ماں۔" راحیلہ نے اپنے لہجے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کوئی بچہ تو ہے نہیں کہیں چلا گیا ہوگا دوستوں کے ساتھ یا شہر جا کر وہاں رک گیا ہوگا۔ آپ فکر کیوں کر رہی ہیں؟"

"شہر کون سا دور ہے بیٹی۔ بارہ کلومیٹر۔ صبح پیدل بھی چلتا تو ابھی تک پہنچ جاتا۔ شہر سے کئی بسیں اب تک یہاں آ چکی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے میں گاؤں میں کسی کو بھیج کر معلوم کراتی ہوں۔"

آیا ماں کے جانے کے بعد راحیلہ نے سوچا تو مشتاق کی لاش غائب ہو گئی' مگر کہاں' کس نے غائب کی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی میرا دشمن.......... نہیں' میرا کون دشمن ہو سکتا ہے۔ پھر سانپ کے زہر سے مرنے والے کے بارے میں کیا تحقیق ہو سکتی ہے؟ یہی کچھ سوچتی ہوئی وہ ناشتے کی میز سے اٹھ گئی تھی۔

ایک ہفتے تک مشتاق کی تلاش جاری رہی' پولیس میں رپورٹ بھی کی گئی اور پھر رفتہ رفتہ تلاش و جستجو کی رفتار کم ہو گئی' لیکن شاکر کی گمشدگی نے پھر لوگوں کو مشتاق کی تلاش تیز کرنے کی دعوت دی تھی۔ شاکر کی لاش تو راحیلہ نے لائبریری میں ہی چھوڑ دی تھی' لیکن صبح لائبریری میں شاکر کی لاش کسی کو نہیں ملی۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے جب شاکر نے راحیلہ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ وہ ایک دلچسپ کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی کہ قدموں کی چاپ پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ "تم.......... تم یہاں کیسے؟" راحیلہ نے شاکر کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ شاکر اسے اچھا تو لگتا تھا لیکن اس نے کبھی شاکر کے حوصلے کو مہمیز نہیں کیا تھا۔

"آپ اس.......... طرف آئیں' ایک بات ہے۔" شاکر نے عجیب سے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ "جوانی اور

ن کو برباد کرنا بھی گناہ ہے۔ میرا خیال ہے آپ میرا مطلب سمجھ رہی ہوں گی۔"

"لیکن.......... لیکن.........." راحیلہ نے تذبذب کے عالم میں کہا۔ "یہ بریری.........."

"تو کیا ہوا۔" شاکر نے کہا اور پھر دوسرے ہی لمحے راحیلہ اس کی گرفت میں تھی لن پھر وہی ہوا۔ شاکر کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ کسی بھیگے ہوئے کپڑے ہی کی طرح احیلہ کے قدموں میں ڈھیر ہو گیا تھا۔ شاکر کے لبوں سے نہ تو کوئی چیخ کی آواز بلند ہوئی ی اور نہ ہی فرش پر گرنے کی آواز پیدا ہوئی تھی۔

راحیلہ نے شاکر کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر انتہائی تیزی سے لائبریری سے باہر گئی۔ اسے لائبریری کا دروازہ بند کرنے کا ہوش بھی نہیں تھا لیکن وہ چند قدم ہی چلی تھی لہ اس نے دروازہ بند ہونے کی آواز سنی۔ گھبرا کر چلتے چلتے اس نے مڑ کر دیکھا کہ کہیں دئی ملازم نہ ہو۔ لیکن لائبریری کے بند دروازے کے پاس کوئی نہیں تھا۔

صبح صفائی کرنے والی کو لائبریری میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آئی تھی جب وہ بریری کو جھاڑو دے کر آ گئی تو راحیلہ نے اسے یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو' تمہیں شاکر لی مری نیلی لاش تو نہیں ملی۔ جھاڑو والی نے راحیلہ کے خاموش سوال کا کوئی جواب نہیں یا اور خاموشی سے اس کے قریب سے گزر گئی۔

شاکر کی تلاش بھی مشتاق کی طرح ہی شروع ہوئی اور ویسے ہی سرد پڑ گئی۔ اس کے ند بھی بہت سارے لوگوں کی للچائی ہوئی نظریں راحیلہ کی طرف اٹھتی رہیں لیکن کسی نے ں کے قریب ہونے کی جرات نہیں کی۔ یہ بات تو خیر پوری حویلی میں پھیلی ہوئی تھی کہ راحیلہ اپنی پھوپی کی طرح کنواری ہی رہے گی۔ حویلی کا بھوت راحیلہ کی شادی کے خلاف ہے جو بھی راحیلہ سے شادی کرنے کی کوشش کرے گا وہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

راحیلہ میں کئی غیر معمولی باتیں بھی تھیں۔ آنکھیں تو اس کی تھیں ہی ایسی کہ زیادہ دیر ان پر نگاہیں نہیں ٹک سکتی تھیں۔ اس کی آواز میں بھی بلا کی کشش تھی۔ جیسے لترنگ بج رہا ہو۔ وہ جو بات منہ سے نکال دیتی وہی کچھ ہو جاتا تھا۔ وہ حویلی کے ہاں بھی ے میں بے خوف چلی جاتی تھی۔ حویلی کی خواتین یہ بات بھی جانتی تھیں کہ راحیلہ مرف بارہ سال کی عمر میں بالغ ہو گئی تھی اور یہ کہ بالغ ہونے کے بعد سے وہ تنہا سونے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگی تھی۔ اگر اسے گھر کی بزرگ خواتین کے درمیان سلایا جاتا تو وہ رات کے کسی پہر اس کمرے میں چلی جاتی تھی جو بعد میں اس کا بیڈ روم بن گیا۔ اپنے بیڈ روم کے دروازے کی وہ اندر سے کنڈی کبھی نہیں لگاتی تھی۔

اپنی شادی کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد ہی اس نے ایک بچے کو گود لیا اور اس کی پرورش پر توجہ دینے لگی۔ جب اس کالے پالک سات سال کا ہوا تو اس کے ایک رشتے کے چاچا کے گھر ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ چاچا حویلی سے بہت دور ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ لڑکی کی پیدائش کے تین سال بعد راحیلہ نے اپنے رشتے کے چاچا کو حویلی میں آکر رہنے کا مشورہ دیا۔ پہلے تو اس کے چاچا مانے نہیں' لیکن چند دنوں بعد انہوں نے حویلی میں رہنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ اس طرح پری وش کی پرورش حویلی میں ہونے لگی۔

پری وش جب سات سال کی ہوئی تو راحیلہ نے اپنے لے پالک بیٹے کا رشتہ مانگ لیا۔ چاچا نے اس رشتے پر مسرت کا اظہار کیا تھا۔ جب پری وش تیرہ سال کی ہوئی تو وہ امانت علی کی بیوی اور راحیلہ زیب کی بہو بن گئی تھی۔ راحیلہ زیب نے اپنے منہ بولے بیٹے کو حویلی کا وہ حصہ دے دیا جو کبھی اس کی پھوپی کی تحویل یا استعمال میں تھا۔ اس حصے میں دو کمرے' ایک اسٹور روم اور ایک بیٹھک تھی۔ یہ حصہ مندر کے بالکل مقابل تھا' یہ الگ بات کہ حویلی کی دیوار اور احاطے کی وسیع زمین درمیان میں تھی۔

امانت علی اس شادی سے خوش نہیں تھا۔ وہ کسی غیر ملکی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مغربی ممالک کی عورتیں وفاشعار اور برابری کی بنیاد پر زندگی گزارنے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ ان کی ذہنیت غلامانہ ذہنیت نہیں ہوتی' وہ شوہر کو اپنا دوست سمجھتی ہیں سرتاج یا زندگی کا مالک نہیں۔

راحیلہ زیب کو امانت علی کے ان خیالات کا اندازہ نہیں تھا اور نہ ہی امانت نے کبھی اپنی ماں سے اس انداز میں گفتگو کی تھی حالانکہ ماں بیٹے دونوں بہت فری تھے اور زندگی کے ہر مسئلہ اور موضوع پر گفتگو کر لیتے تھے۔ اگر راحیلہ کو یہ معلوم ہوتا کہ پری وش' امانت علی کو پسند نہیں تو وہ اور کچھ نہ سہی پری وش میں دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش ضرور کرتی۔ وہ ایسے حالات پیدا کرتی کہ امانت علی پری وش میں دلچسپی لینے لگے۔ شادی

کے بعد تو کچھ نہیں ہو سکتا تھا اور وہ اپنے بیٹے کو دوسری شادی کی اجازت قطعی نہیں دے سکتی تھی کیونکہ ان کے خاندان میں دو شادیاں کسی کی نہیں ہوئی تھیں' یہ الگ بات ہے کہ مردوں نے اپنی عیاشیوں کے لیے دوسرے راستے نکالے ہوئے تھے جن کا خاندان پر نہ کبھی اثر پڑا اور نہ نسل بگڑی تھی۔ اسے فخر تھا کہ وہ سب ایک دادا ہی نہیں ایک دادی کی اولاد بھی ہیں' امانت علی کو وہ اولاد سے زیادہ اپنا کھلونا سمجھتی' اور اس کی ہر طرح سے حفاظت کرتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ حویلی والوں کی نسل اس سے نہیں بلکہ اس کے بھائی سے کہیں نہ کہیں پروان ضرور چڑھ رہی ہوگی۔ اس کا بھائی زندہ سلامت ہوگا اور کبھی نہ کبھی خود اس کی اولادوں میں سے کوئی حویلی تک پہنچ جائے گا۔

امانت علی کے نکاح کے بعد صرف تین ماہ تک حویلی کے حالات پرسکون رہے لیکن شادی کے تین ماہ بعد ہی امانت علی پر شدید قسم کا دورہ پڑا۔ وہ پوری حویلی میں دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ حویلی کے ملازمین اسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اول تو وہ کسی کے ہاتھ میں نہیں آتا تھا اور اگر اتفاق سے وہ اسے پکڑ بھی لیتے تو وہ چار پانچ ملازموں کو اس انداز میں دور پھینک دیتا جیسے وہ انسان نہیں کنکر پتھر ہوں۔ تھوڑی دیر تک تو امانت علی صرف دائیں بائیں آگے پیچھے بھاگتا رہا لیکن پھر اس نے نامانوس زبان میں چیخ چیخ کر کچھ کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔

راحیلہ زیب نے حویلی کے مرکزی دروازے کو بند کرنے کا حکم دیا تھا' وہ دروازہ بند بھی ہو گیا لیکن امانت علی دروازے کی سمت تو جا ہی نہیں رہا تھا۔ پہلے وہ حویلی کے گرد چکر لگاتا رہا' اور پھر مندر کے گرد تین چکر لگانے کے بعد مندر کے بند دروازے کے سامنے کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔ مندر کی طرف جانے کی کسی ملازم کو اجازت نہیں تھی اس لیے جب امانت علی نے مندر کا رخ کیا تو سارے ملازمین رک گئے تھے۔ راحیلہ نے بھی امانت علی کو گرتے دیکھا تو یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ "میرے پیچھے کوئی نہ آئے۔"

"بڑی بہادر بنتی ہے۔" ایک ملازم نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ "پاگل ہو گیا ہے سالا اس کی گردن ہی نہ توڑ دے۔"

"کیا کہہ رہے ہو تم۔" دوسرے ملازم نے کہنے والے کے قریب ہوتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پوچھا۔

"کچھ نہیں یار کہہ رہا ہوں پتہ نہیں یہ اچانک اسے کیا ہو گیا۔"

"وہ چیخ چیخ کر معلوم نہیں کیا کہہ رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے چینی' جاپانی زبان میں کچھ کہہ رہا ہو۔"

"وہ چینی' جاپانی زبان نہیں تھی۔"

"کیا تو چینی جاپانی زبان جانتا ہے؟"

"جانتا تو نہیں ہوں یار لیکن میں نے چینیوں اور جاپانیوں کو بات چیت کرتے سنا ہے۔"

"ارے وہ تو اس کے قریب بیٹھ گئی ہے۔" راحیلہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے تیسرے ملازم نے کہا۔ "یار تیار رہو' کہیں وہ بیگم کو کوئی نقصان نہ............"

"ہم تو تیار ہیں' لیکن یہاں سے آگے بڑھنے کا حکم نہیں ہے۔"

"کسی کی جان بچانے کے لیے حکم کی کون پروا کرتا ہے اگر بیگم مجھے خطرے میں نظر آئے گی' میں حکم کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھ جاؤں گا۔"

"خیر کروں گا تو میں بھی یہی۔"

ملازمین نے دیکھا کہ راحیلہ' امانت کے قریب بیٹھ گئی' پھر اس نے امانت کا سر اپنی گود میں رکھا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایسا کرتے ہوئے اسے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ امانت اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں مچکا مچکا کر ادھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر بولا۔ "ممی میں کہاں ہوں............ اور آپ............ ارے زمین پر............ اٹھ جائیں ملازمین دیکھ رہے ہیں۔"

"تمہاری طبیعت تو اب ٹھیک ہے۔" راحیلہ نے سرد آواز میں پوچھا۔ "ملازمین کو تماشا دکھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمہیں جو کچھ کہنا تھا مجھ سے کہتے' اگر میں انکار کرتی تو تمہاری مرضی میں آتا تم کر سکتے تھے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ممی؟"

"میں جو کچھ کہہ رہی ہوں' ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" راحیلہ کا لہجہ اب بھی سرد تھا۔ "یا کوئی کام تم مجھے درمیان سے نکال کر کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا ممی۔"

راحیلہ خالی خالی نظروں سے امانت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دیکھنے اور کہنے کے انداز سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا مخاطب امانت نہیں کوئی اور ہو۔ "میں نے تمہاری خاطر اپنی جوانی اپنی مسرتیں اور اپنی زندگی داؤ پر لگا دیں اور تم............ تم۔"

"ممی چلیں۔" امانت نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "آئیں میرے ساتھ۔ پتہ نہیں میں یہاں کیسے آیا۔ میں تو اپنے کمرے میں فون کے قریب تھا۔"

"تم فون کس کو کر رہے تھے؟" راحیلہ نے کھڑے ہونے کے بعد براہ راست امانت سے پوچھا۔ اس کی نظریں امانت کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"میں فون نہیں کر رہا تھا۔" امانت نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بلکہ کسی نے مجھے فون کیا تھا۔"

"کس نے فون کیا تھا تمہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔" امانت نے جھوٹ بولا کیونکہ فون کرنے والی کو امانت جانتا تھا۔ اس نے اس جرمن لڑکی کو دیکھا نہیں تھا لیکن دونوں کا غائبانہ تعارف تھا۔ آج وہ اس سے ملاقات کا وقت لے ہی رہا تھا کہ امانت کے ہاتھ سے فون گر گیا اور پھر اسے یاد نہیں کہ کیا ہوا تھا اور پھر اس نے خود کو مندر کے سامنے لیٹے ہوئے دیکھا تھا۔

"کوئی عورت تھی کہ مرد............"

"ممی وہ............"

"وہ............ ہاں بتاؤ۔"

"وہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔"

"لڑکی!"

"ممکن ہے عورت ہو۔" امانت نے تھوک نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال نسوانی آواز تھی۔"

"تم اس سے کبھی نہیں ملے؟"

"نہیں ممی بالکل نہیں۔" امانت نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" راحیلہ زیب نے کھڑے ہوئے ملازمین کی طرف بڑھتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے کہا۔ "یہ لوگ پتہ نہیں کیوں کھڑے ہیں؟"

"میں تو سمجھ رہا تھا یہ آپ کے ساتھ آئے ہیں۔" امانت نے راحیلہ کے قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے کہا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں مندر تک کیسے آیا۔"

"جاؤ تم لوگ۔" راحیلہ نے امانت کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے ملازمین کو ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔

ملازمین تیزی سے حویلی کی طرف بڑھے اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ حویلی میں داخل ہو گئے تھے۔ راحیلہ اور امانت علی ملازمین کے پیچھے ہی حویلی میں داخل ہوئے تھے۔

O☆O

مولوی عابد حسین کو اپنے گھر ٹھہرے ہوئے چاروں مہمانوں سے محبت سی ہو گئی تھی حالانکہ جب ان کے ایک کاروباری دوست نے انہیں پندرہ دنوں پہلے لکھا تھا کہ اس کے چند دوست آ رہے ہیں' ان کا خیال کرنا تو اس نے برا سا منہ بنا کر سوچا تھا خیال کیا کرنا سیدھے سیدھے کہو ان پر مال خرچ کرنا۔ جب یہ چار مہمان اس کے گھر پہنچے تو اسے حیرت ہوئی تھی۔ ان مہمانوں میں ایک خاتون بھی تھی۔

"ہمارے ناموں سے تو آپ واقف ہی ہوں گے؟" چاروں مہمانوں میں سے ایک نے کہا۔

"حیرت ہے آپ کو اردو آتی ہے۔" عابد حسین نے اس شخص کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں آئے گی' میں جے پور کا رہنے والا ہوں۔" اس شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا نام گھنشام داس ہے۔ یہ روزا ہے' اس کا تعلق جرمنی سے ہے' لیکن گزشتہ دس سال اس نے مصر' شام اور عراق میں گزارے ہیں اور ہمارا اس کا ساتھ مصر ہی میں ہوا۔ یہ میرے دوست جمال فاروق ہیں۔" گھنشام نے ایک ادھیڑ عمر' پستہ قد' گنجے سر والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور برنارڈ ڈیسوزا ہیں۔ ان کا تعلق یوں تو انگلستان سے ہے لیکن رہائش مصر میں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سب سے مل کر۔" مولوی عابد حسین نے کہا۔ "ہمارے شہر کا رخ غیر ملکی بہت کم کرتے ہیں۔ کراچی' لاہور' اسلام آباد اور پشاور میں اتنی کشش ہے

کہ سارے غیر ملکی اس طرف بھاگتے ہیں۔ یوں ہمارے شہر میں کوئی قابل دید مقام نہیں ہے۔"

"آپ تو ہیں اس شہر میں!" گھنشام داس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ کو انگریزی تو آتی ہی ہوگی؟" یہ سوال بھی گھنشام داس نے اردو ہی میں کیا تھا۔

"کیوں نہیں مجھے انگریزی آتی ہے' میں عربی میں بھی بات کر سکتا ہوں۔" عابد حسین نے کہا۔

مولوی عابد حسین پھلوں کا کاروبار کرتا تھا۔ عرب ممالک میں سے بیشتر ملکوں میں وہ پھل بھیجتا رہا' گزشتہ چند ماہ سے پھل بھیجنے والے ممالک کی فہرست میں مصر کا نام بھی شامل ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اس نام کو اپنی فہرست سے نکالنے ہی والا تھا۔ اس کی وجہ بعض کاروباری دقتیں تھیں۔ جن دنوں وہ اپنے کاروباری دوست کو کاروبار منقطع کرنے کے بارے میں اطلاع دینے کی سوچ رہا تھا انہی دنوں اس کا خط اسے ملا اور پھر یہ مہمان آ گئے۔

"مجھ سے یہی کہا گیا تھا کہ آپ پڑھے لکھے آدمی ہوں گے۔" گھنشام داس نے کہا۔

"بس اتنا پڑھا لکھا ہوں کہ کاروبار چل رہا ہے۔"

"میری معلومات کے مطابق' آپ پہلے کسی مسجد میں پیش امام تھے۔" روزا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس دوران آپ.........."

"آپ کی معلومات درست ہیں۔" مولوی عابد حسین نے کہا۔ "میں سبھی کچھ کرتا تھا۔ پھو' چھا' تعویذ گنڈہ' جن بھوت اتارنا' دم درود کرنا۔ پھر ایک دن میرا دل ان چیزوں سے اکتا گیا اور میں نے کاروبار شروع کر دیا۔ پہلے میں اپنے نام کے ساتھ عامل لگاتا تھا پھر خود کو مولوی لکھنے لگا۔ کچھ میرے جاننے والے اب بھی مجھے عامل عابد حسین ہی کہتے ہیں۔"

"ہمیں یہ سب کچھ معلوم ہے۔" روزا نے کہا۔ "ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ نے کئی بار زیر زمین دبی.........."

"میرے بارے میں آپ کی معلومات قابل رشک ہیں۔" عابد حسین نے حیرت سے روزا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کام میں کچھ ہاتھ نہیں آتا اس لیے میں نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوڑ دیا۔"

"ایسا تو نہیں کہ اس کام میں کچھ ہاتھ آنے کے بعد آپ نے اسے چھوڑ دیا ہو۔" روزا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں عامل منظور بیگ سے مل چکی ہوں۔ وہ کبھی آپ کے ساتھ ہوتے تھے۔ جب ہم نے یہاں آنے کا پروگرام بنایا تو اس نے آپ کا نام لے کر کہا تھا کہ آپ ہماری بہت مدد کر سکتے ہیں۔"

"منظور بیگ سے کہاں ملاقات ہوئی تھی تمہاری؟" عابد حسین نے مشکوک انداز میں روزا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مصر ہی میں ملاقات ہوئی تھی' وہ خاصے عرصے مصر میں رہے۔"

"اب کہاں ہے؟"

"اس کا علم مجھے نہیں' جانے سے قبل انہوں نے بتایا نہیں تھا' بس اچانک ہی چلے گئے۔ یہاں آنے سے قبل میں نے ان سے رابطے کی کوشش کی تو پتہ چلا وہ تو ملک ہی چھوڑ گئے ہیں۔"

"ممکن ہے وہ دوبارہ یہاں آ گیا ہو؟"

"اس سلسلے میں' میں کیا کہہ سکتی ہوں؟" روزا نے کہا۔

تین چار دنوں کے اندر ہی اندر مولوی عابد حسین نے مہمانوں کی آمد کا مقصد پالیا تھا اور اسے بھی ان کے مقصد سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ عابد حسین نے مہمانوں کو بتایا تھا کہ شہر سے بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر جو حویلی ہے اس میں کسی وقت اسے بھی دلچسپی تھی لیکن بعد میں وہ کچھ ایسی الجھنوں کا شکار ہوا کہ حویلی کے سلسلے میں کچھ کرنا اس کے ذہن میں نہیں رہا۔ پھر اس نے سب چھوڑ چھاڑ کر کاروبار ہی شروع کر دیا تھا۔ روزا' گھنشام داس' جمال فاروق اور برنارڈ ڈیسوزا کے پاس بھی حویلی سے متعلق بہت معلومات تھیں۔ ان لوگوں کے پاس تو حویلی سے وابستہ خاندان کے بارے میں بھی بڑی تفصیلی معلومات تھیں۔

ایک رات ان پانچوں نے طویل بحث کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ حویلی میں چوری چھپے جانا زیادہ فائدہ مند نہیں ہے بلکہ اس میں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسا چکر چلایا جائے کہ حویلی میں رہنا نصیب ہو جائے۔ گھنشام داس نے گفتگو کے دوران

احیلہ زیب کے بھائی کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اس سے ملاقات کر چکا ہے۔ اس ے ملاقات کے بعد ہی اسے حویلی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ حویلی سے متعلق جو بیشتر علومات میرے پاس ہیں وہ راحیلہ زیب کے بھائی وجاہت علی کی دی ہوئی ہیں۔ میں نے ت کوشش کی تھی کہ وجاہت میرے ساتھ یہاں آئے اور مجھے حویلی میں چند ماہ گزارنے اموقع فراہم کرے لیکن وہ تیار نہیں ہوا۔"

"تمہیں معلوم ہے' وجاہت علی اب کہاں ہے؟" مولوی عابد حسین نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا' وہ سیلانی آدمی تھا۔ پتہ نہیں کہاں گیا۔ اپنے بارے میں بھی اس نے شراب کے نشے میں بتایا تھا۔ جب وہ سب کچھ بتا چکا تو پھر میں نے بہت کچھ معلوم کر ا۔"

"خیر چھوڑو۔" عابد حسین نے کہا۔ "میرا خیال ہے راحیلہ زیب کے لے پالک ے روزا دوستی کرے۔ میری معلومات کے مطابق امانت علی دل پھینک بندہ ہے۔ یہ الگ ت ہے کہ اسے حویلی سے باہر نکلنے کے مواقع کم ملتے ہیں لیکن جب بھی وہ باہر آتا ہے۔ زاری عورتوں کے ساتھ کچھ وقت گزار کر جاتا ہے۔"

"لیکن روزا.........." جمال فاروق نے کہا۔

"روزا کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ اپنی آبرو بچانا جانتی ہے۔" ڈیسوزا نے کہا۔ "اور اگر روزا کا دل بھی اس پر آ جائے تو.........."

"مسٹر ڈیسوزا۔" روزا نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ "جب آپ عام مردوں جیسی باتیں کرتے ہیں تو مجھے.........."

"اچھا خیر کام کی بات کرو۔"

"کام کی بات یہ ہے کہ حویلی میں داخل ہوا جائے۔ ڈیسوزا اور روزا تو امانت علی کے ذریعے حویلی تک پہنچیں۔ جمال فاروق اور میں وجاہت کا نام لے کر حویلی میں داخل ں گے۔" گھنشام داس نے کہا۔

"اور میں۔" مولوی عابد حسین نے کہا۔

"آپ مقامی ہیں۔ ہمارے دوست ہیں اس لیے ہم سے ملنے آتے جاتے رہیں۔"

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد ہی روزا نے امانت علی سے رابطہ کیا تھا۔ پھر جب وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوبارہ فون کر کے ملاقات کا وقت لے رہی تھی کہ سلسلہ اچانک ایسا ٹوٹا تھا کہ امانت کی آواز آنی بند ہو گئی۔ روزا کو یوں لگا جیسے ریسیور نیچے گر گیا ہو پھر چند لمحوں بعد ہی کئی ملی جلی آوازیں کبھی مدہم کبھی تیز آنے لگیں۔ روزا ریسیور کان سے لگائے ان آوازوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی نے ریسیور اٹھا کر کریڈل پر رکھ دیا۔ اس وقت روزا کے قریب صرف ڈیسوزا تھا۔

"کیا ہوا؟" ڈیسوزا نے روزا کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں یہ تو نہیں بتا سکتی کہ کیا ہوا لیکن یہ کہہ سکتی ہوں کہ کچھ برا ہی ہوا ہے۔ میرا خیال ہے وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے ہاتھ سے ریسیور گر گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی کسی نے بغیربات کئے ریسیور رکھ دیا۔"

"ممکن ہے کسی کو آتا دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا ہو۔"

"خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے وہ کہہ سکتا تھا کہ دوست سے بات کر رہا ہوں۔"

"ممکن ہے اس کی بیوی آ گئی ہو۔"

"بیوی سے تو شاید وہ اتنا خوفزدہ نہیں ہو سکتا کہ ریسیور ہی مارے خوف کے اس کے ہاتھ سے چھوٹ جائے۔"

"اپنی ماں سے تو وہ بہرحال بہت ڈرتا ہے۔"

"پھر اب کیا کیا جائے؟"

"میرا تو خیال ہے کہ رات پھر کسی وقت اس سے رابطہ کیا جائے یا پھر سب کو آ جانے دو۔ مشورہ کر کے کچھ کرنا۔"

"معلوم نہیں یہ لوگ کب آئیں گے؟"

"ارے آ جائیں گے۔ یہ کام عجلت کے نہیں تسلی سے کرنے کے ہوتے ہیں۔ ہم لوگ یہاں چھ ماہ رہنے کا بندوبست کر کے آئے ہیں۔ عجلت میں کام بگاڑ مت دینا۔"

"کب تک آنے کا کہہ کر گئے ہیں؟"

"میں یہ آدھی بوتل ختم کروں گا تو وہ آ جائیں گے۔" ڈیسوزا نے مسکرا کر بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

"تمہاری یہ دن کے وقت شراب نوشی مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔"

"اب پورا دن کہاں رہا۔ آدھے سے زیادہ تو آسمان نگل چکا ہے۔"

"کسی دن آسمان تمہیں بھی نگل جائے گا۔"

"تم سے بچوں گا تو نگل سکے گا ورنہ اس بے چارے کے ہاتھ کیا آئے گا؟"

"تمہیں کھا کر میں بدہضمی کا شکار نہیں ہونا چاہتی۔"

"اب میں اتنا برا بھی نہیں ہوں۔" ڈیسوزا نے جام لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ دو گھونٹ بھرنے کے بعد گلاس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "جمال فاروق کے چکر میں مت رہنا' بہت خبیث ہے۔ عورت کو کام نکلنے کے بعد دنیا کی ذلیل ترین شے سمجھتا ہے۔"

"اور میں مردوں کو یہی سمجھتی ہوں۔" روزا نے کہا اور پھر صوفے سے اٹھ گئی۔

"میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔"

روزا کے جانے کے بعد ڈیسوزا نے ایک ہی سانس میں جام ختم کیا اور سگریٹ جلاتے ہوئے سوچا۔ روزا اور گلی کی آوارہ کتیا میں زیادہ فرق نہیں ہے اس کے باوجود بھی مجھے اچھی لگتی ہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں اس کے ساتھ ہی کسی بحری جہاز میں دنیا کی سیر کو نکل جاؤں گا۔

O☆O

پری وش کو کچھ دن بعد پتہ چلا تھا کہ اس کے شوہر پر کس انداز کا دورہ پڑا تھا۔ راحیلہ زیب سے پوچھنے کی تو اس میں ہمت نہیں تھی اور اپنے شوہر سے وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ امانت کبھی کبھی ہی اس سے سیدھے منہ بات کرتا تھا اور گزشتہ دو دنوں میں تو وہ سونے کے لیے بیڈروم میں آیا ہی نہیں تھا۔ اس نے یہ دو راتیں حویلی کے کس کمرے میں گزاریں اسے اس کا علم نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے کسی سے پوچھا تھا۔ جب سے اسے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے اس دن سے اسے اعتماد ہو گیا تھا کہ اب اس کے قدم حویلی میں جم گئے ہیں ورنہ امانت علی کی عدم توجہی نے اسے اپنے مستقبل سے مایوس کر دیا تھا۔

رات بارہ بجے تک اس نے امانت علی کا انتظار کیا اور پھر مایوسی سے بیڈروم کو نیم تاریک کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جب انسان کا ذہن جاگ رہا ہوتا ہے تو اس کی آنکھوں میں نیند کہاں بھر سکتی ہے۔ پری وش کا ذہن بھی جاگ رہا تھا اور وہ کروٹیں بدل رہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ پھر اسے یوں لگا جیسے وہ سو گئی ہو۔

"آؤ میرے ساتھ!" پھنکار سے مشابہ ایک تیز سرگوشی بیڈروم کے درودیوار سے ٹکرائی۔

پری وش کو یوں محسوس ہوا جیسے اس نے بیڈروم کی ایک ایک دیوار کو دیکھا ہو اور پھر آواز کی سمت کا تعین کر کے بستر سے اٹھ گئی ہو۔ "کہاں چلنا ہے؟"

"میرے ساتھ آ.......... آ میرے ساتھ.......... میں تجھے لینے آیا ہوں.......... آ میرے ساتھ۔" یہ آواز اپنے دونوں کانوں کے قریب لگی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے بولنے والا اس کے دونوں کانوں پر منہ رکھ کر بول رہا ہو۔ "اِدھر اُدھر گھبرا کر مت دیکھ۔ تجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تو میرے ساتھ ہے.......... میرے ساتھ.......... میرے ساتھ۔"

آنکھیں بند کئے پری وش آگے بڑھنے لگی۔ بند آنکھوں سے بھی سوائے بولنے والے کے وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ بیڈروم کا کھلا دروازہ' راہداری' دوسرا کمرہ' اسٹور روم' بیٹھک' بیرونی دروازہ' حویلی کا احاطہ' ٹھنڈی ٹھنڈی زمین.......... اور مندر.......... مندر کی گھنٹیوں کی آواز' مندر کا کھلا دروازہ اور.......... اور اندھا کنواں۔ مندر کا طواف کرتے ہوئے پری وش کی جیسے سانسیں پھول گئیں اس کے پاؤں اس کے قابو میں نہیں تھے۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ طواف کرتی رہی اور پھر اچانک ہی اس کی رفتار میں اضافہ ہو گیا۔ معلوم نہیں اس نے مندر کے گرد کتنے چکر لگائے تھے کہ کسی نے اسے مندر سے اندھے کنوئیں کی طرف دھکا دیا اور اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ تیزی سے اندھے کنوئیں کی سمت بڑھی اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ کنوئیں کے اندر گر رہی تھی۔

کنوئیں میں گرنے میں اس کی نیچے کی سانس نیچے اور اوپر کی اوپر رہ گئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز بھی جسم ہی کی طرح اس کے قابو میں نہیں تھی۔ چند لمحے بعد ہی وہ بے وزنی جیسی کیفیت کا شکار ہو گئی۔ گرتے ہوئے اس کا خیال تھا کہ وہ دم گھٹنے اور چوٹ لگنے سے مر جائے گی۔ لیکن وہ محسوس کر رہی تھی جیسے بہت دھیمی رفتار سے بالکل سیدھے پیروں کے بل کنوئیں کی تہہ تک پہنچ رہی ہو۔ تھوڑی دیر تک تو وہ تاریکی میں ڈوبی نیچے اترتی رہی اور پھریوں لگا جیسے بڑا سا چاند کنوئیں کی دیوار سے ٹکرا کر کرچی کرچی ہو گیا ہو۔ پورے کنوئیں میں روشنی پھیل گئی۔ ٹوٹے ہوئے چاند کے ایک ایک ٹکڑے

ایک ایک کرچی سے روشنی پھوٹنے لگی۔ پری وش روشنی میں نہا گئی۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اور جب وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ وہ کنوئیں کی ایک دیوار سے لگی کھڑی ہے اور اس کے چاروں طرف ٹھنڈی ٹھنڈی آگ بھڑک رہی ہے۔ آگ کی چادر سے پرے اسے رینگتے' بل کھاتے' کنڈلی مارے بیٹھے ہوئے سانپ ہی سانپ نظر آئے۔

سانپوں کی سرسراہٹ' پھنکاریں اور ناقابل فہم آوازیں اس کے کان کے پردوں کو پھاڑ رہی تھیں' لیکن چند لمحے بعد ہی وہ ان آوازوں سے مانوس سی ہو گئی۔ سانپ آگ عبور نہیں کر سکیں گے' اس نے سوچا لیکن ان میں سے کوئی اڑ کر بھی تو ادھر آ سکتا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ پڑا اس کا بدن سردی کھائی ہوئی بھیڑ کی طرح لرزنے لگا اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں پھیلتی جا رہی ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں بند کرنا چاہتی تھی لیکن آنکھیں تو جیسے پتھرا گئی تھیں۔ پپوٹوں کو حرکت دینا اس کے بس ہی میں نہیں تھا۔

پری وش آنکھیں بند کرنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ یک لخت منظر بدل گیا۔ ہزاروں سانپوں کے درمیان کنڈلی مارے بیٹھا ہوا ایک سانپ اونچا ہونے لگا۔ جیسے کوئی بیٹھا ہوا شخص کھڑا ہو رہا ہو۔ پری وش کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سانپ دم پر کھڑا ہو گیا اور پھر وہ پھولنے لگا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا حجم بڑھنے لگا۔ پھر.......... پھر اس سانپ نے انسان کی شکل اختیار کر لی لیکن اس کے بدن کا رنگ بالکل کسی ناگ ہی کا تھا۔ گول سر' گول گول آنکھیں' کوتاہ گردن اور زبان جیسے ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی۔

انسان بن جانے والے سانپ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر یوں اشارہ کیا جیسے کسی کو رخصت کر رہا ہو۔ اس اشارے کے ساتھ ہی سارے سانپ ایک ساتھ حرکت میں آئے اور ان کی سرسراہٹ اور پھنکاروں سے ساری فضا لرزنے لگی۔ چند لمحوں بعد ہی کنوئیں میں ایک سانپ بھی نہیں تھا وہ انسان نما سانپ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگا۔ پری وش کی نگاہیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا تعاقب کرنے لگیں۔ کنوئیں کا قطر اتنا بڑھ گیا تھا کہ پری وش خود کو ایک میدان میں تصور کر رہی تھی۔ سانپ چلتے چلتے اس جگہ مڑ گیا جہاں ایک چوکی پڑی ہوئی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چوکی خالی نہیں تھی۔ چوکی پر ایک عورت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور اس کے لمبے لمبے بال اس کے جسم کا احاطہ کئے ہوئے تھے۔ اس کی برہنہ کہنیاں بالوں سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ سانپ کے چوکی کے قریب پہنچتے ہی اس عورت نے گھٹنوں سے سر نکالا۔ اس عورت کی شکل دیکھتے ہی پری وش کی چیخ نکل گئی لیکن یہ چیخ ایسی تھی کہ اس کی آواز خود پری وش کی سماعت سے نہیں ٹکرائی تھی۔ یہ............ یہ تو میری ساس ہے۔ راحیلہ زیب' یہ............ یہاں کیسے' یہ کب آئیں۔ اس نے سوچا۔

سانپ پر نظر پڑتے ہی راحیلہ زیب کی آنکھوں میں نفرت سی اتر آئی۔ "تم............ تم............"

"ہاں میں!" سانپ نے پھنکارنے والے انداز میں کہا۔ "اس طرف دیکھ............ دیکھ اس طرف............"

راحیلہ نے پری وش کی طرف دیکھا۔ "اسے............ اسے کیوں لائے ہو' بتاؤ کیوں لائے ہو؟"

"اس کے پیٹ میں لڑکا ہے۔" انسان نما سانپ نے اپنی زبان کو اندر کر کے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "پورے ڈھائی ماہ کا بچہ۔ تیرا وارث۔ حویلی کا مالک............"

"پھر............ پھر تو کیا کرے گا............ بتا تو............" راحیلہ نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ "کیا کرے گا تو؟"

"میں اسے اپنے روپ میں پیدا کروں گا۔ تیری بہو سانپ کو جنم دے گی اور وہ سانپ اس کی اولاد پیدا ہوتے ہی پہلے اپنے باپ کو............"

"نہیں نہیں............ تو............"

"باپ کو ڈسنے کے بعد وہ اپنی ماں کو ڈس لے گا۔ دیکھ بالکل ایسے۔" انسان نما سانپ کے یہ کہتے ہی منظر بدل گیا۔

پری وش درد زہ میں مبتلا ہے۔ دائی بچہ پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ امانت علی کمرے کے دروازے کے باہر بے چینی سے ٹہل رہا ہے اور راحیلہ............ راحیلہ دائی کے بالکل قریب کھڑی ہے۔ پری وش نے ایک کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ ماری

ر دائی اس کی ٹانگوں کے درمیان سے اچھل کر دور ہٹ گئی۔ پری وش کی چیخ کے ساتھ ی دائی کی چیخ بھی نکل گئی تھی۔

"کیا ہے' کیا ہوا؟" راحیلہ نے حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میں سوال کیا اور پھر ہشت سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تین ساڑھے تین فٹ کا موٹا تازہ ناگ پری وش کی انوں کے درمیان سے نکل کر دروازے کی طرف رینگ رہا تھا۔ دروازے کے قریب نچتے ہی اس کی رفتار میں اضافہ ہوا اور پھر اس نے دروازے کے آگے ٹہلنے والے امانت لی کو اچھل کر ڈس لیا۔ امانت علی کی چیخ کے ساتھ ہی پری وش نے آنکھیں کھول دیں۔

س............ سا............ سانپ!" راحیلہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میرا............ میرا............ بچہ............ بچہ امانت علی............ اما............ نت!"

امانت علی کی لاش چوکھٹ کے درمیان پڑی تھی۔ وہ آدھا کمرے میں آدھا کمرے کے باہر تھا۔ "یہ............ یہ کیا ہوا............ امانت تو نیلے............ نیلے پڑ گئے ہیں۔"

سانپ آہستہ آہستہ سرسراتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ "یہ............ یہ اس ے بچو............ یہ سانپ............!" راحیلہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ............ یہ میرا بچہ............ میرا بیٹا ہے۔" پری وش نے کہا اور سانپ کی طرف محبت پاش نظروں سے تکنے لگی۔ سانپ سیدھا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ند ہی وہ پری وش کے سینے پر یوں سر مارنے لگا جیسے بکری کا بچہ اپنی ماں کے تھن پر آہستہ آہستہ منہ مار کر دودھ نیچے اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ "ارے............ ارے میرا بچہ ھوکا ہے............ بھوکا............ لے............ لے میرے لال دودھ پی۔" پری وش نے کرتا وپر اٹھاتے ہوئے کہا پھر جیسے ہی پری وش کا ایک دودھ باہر آیا' سانپ نے اچھل کر اس کے دودھ پر ڈس لیا۔

پری وش کی چیخ بڑی بھیانک تھی۔ اس چیخ کے ساتھ ہی منظر بدل گیا تھا۔ راحیلہ وکی پر کھڑی اپنے بال نوچ رہی تھی اور اس کے لمبے لمبے بال اس کے برہنہ ہرے نیلے ن کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ "تو............ تو ایسا نہیں کر سکتا۔ میں تجھے ایسا ہیں کرنے دوں گی ہرگز نہیں۔"

"تو جانتی ہے میں سب کچھ کر سکتا ہوں' سب کچھ۔" انسان نما سانپ نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”میں امین ہوں.......... جس چیز کی حفاظت میں صدیوں سے کر رہا ہوں اس کی حفاظت کرتا رہوں گا اور جو ہاتھ اس امانت کی طرف بڑھیں گے میں انہیں فنا کر دوں گا۔ ان کے خاندانوں کو تباہ کر دوں گا۔“

”میں نے تیری اس چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔“

”آخری عمر میں تیرے باپ نے دیکھا تھا۔“ انسان نما سانپ نے کہا۔ ”وہ چھت پر موجود اس کھڑکی سے کنوئیں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔“

”کھڑکی سے کنوئیں..........“

”ہاں۔ چھت میں ایک ایسا سوراخ موجود ہے۔ عام طور پر نظر نہیں آتا لیکن سورج کی کرنیں جب ایک مخصوص زاویئے سے اس پر پڑتی ہیں تو وہ نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ اس لمحے اس سوراخ سے کنوئیں کی دیوار میں بنا ہوا وہ دروازہ بھی نظر آتا ہے جس کے پیچھے میں اپنی چیز پر بیٹھا رہتا ہوں اور تو جانتی ہے کہ سورج کی موجودگی میں میری حیثیت ایک مٹی کے سانپ سے زیادہ نہیں۔ ان اوقات میں کوئی شخص مجھ تک پہنچ سکتا ہے‘ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے وہ چیز لے جا سکتا ہے جس کی حفاظت پر مجھے مقرر کیا گیا ہے۔“

”لیکن میرا ان باتوں سے کیا تعلق ہے؟ تو مجھے کیوں ستا رہا ہے؟ تو میرا بھی رکھوالا ہے تو میرا بھی تو..........“

”ہاں میں تیرا رکھوالا ہوں۔ مجھے تو پسند ہے‘ تیرے بدن کی خوشبو مجھے مست کر دیتی ہے۔ تیرے جسم کے ایک ایک حصے سے بین کی مدھر لے پھوٹی ہے لیکن تو.......... تو نے اب.......... نہیں.......... نہیں..........“

”بول‘ بول.......... میں نے کیا کیا؟“

”تو مجھ سے بیزار رہنے لگی ہے۔ اس دن سے جب میں نے تجھے بتایا کہ تیرے جسم میں اتنا زہر بھر دیا ہے کہ اب میں خود تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ بس یہ راز مستی میں میری زبان سے نکل گیا تھا۔ اسی دن سے تو مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ جو مہمان آج کل تیرے گھر میں ہیں‘ ان کے بارے میں تجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے تباہ کر کے وہ یہاں سے لے جانا چاہتے ہیں جس کی میں حفاظت کر رہا ہوں اور تو یہ بھی جانتی ہے کہ میں انہیں فنا کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔“

”میں ان مہمانوں کی نیت سے رات ہی واقف ہوئی ہوں۔“

”تیرا بیٹا یہ بات کئی دنوں سے جانتا ہے۔ میں نے اسے سزا بھی دی صرف تیری خاطر ورنہ میں اسے فنا کر دیتا لیکن اس سزا کے فوراً بعد ہی اس نے ان لوگوں..........“

”وہ روزا کو پسند کرتا ہے۔“ راحیلہ نے دبی دبی آواز میں کہا۔ ”اسے تیری حفاظت میں موجود کسی چیز کے حاصل کرنے کا نہ لالچ ہے نا شوق۔“

”وہ تو تیرے دل میں بھی نہیں۔“ انسان نما سانپ نے قہر آلود انداز میں گھورتے ہوئے کہا۔ ”اگر تو اپنے بیٹے‘ اپنی بہو کو میرے قہر سے بچانا چاہتی ہے تو انہیں اسی طرح ڈس لے جس طرح تو نے مشتاق اور شاکر کو ڈس لیا تھا۔“

”میں نے.......... مشتاق.......... نہیں نہیں.......... شاکر کو میں نے نہیں..........“

”تو نے ڈسا تھا انہیں..........“ انسان نما سانپ نے کہا۔ ”جب وہ جذبات سے بے قابو ہو کر تجھ سے لپٹ رہے تھے تو میں نے تیرے کان کے قریب سرگوشی کی‘ مشتاق کی گردن میں ڈس لے‘ شاکر کی گردن میں ڈس لے‘ تیرے دانتوں میں میرا زہر موجود ہے۔ لیکن جذبات سے تو بھی مغلوب ہو رہی تھی‘ اس کے باوجود بھی تو نے میرے کہنے پر عمل کیا۔ غیرارادی طور پر‘ غیرشعوری طور پر.......... تو.......... تو قاتل ہے.......... قاتل.......... مشتاق اور شاکر کی۔“

”نہیں.......... نہیں تو جھوٹ بولتا ہے۔“

”تو سوچ اگر میں ان کی لاشیں..........“

”بس.......... بس ختم کر.......... ختم کر بات کو میری بہو کو چھوڑ دے.......... چھوڑ دے..........“

”نہیں تیری بہو‘ تیرا بیٹا اور تیرا پوتا۔“

”نہیں اگر تو نے یہ کیا.......... یہ کیا تو میں سب تباہ کر دوں گی۔ سب کچھ تباہ! یہ تو طے ہے کہ تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..........“

”میں تجھے پاگل تو کر سکتا ہوں۔“ انسانی سانپ نے پھنکار جیسی آواز میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پہلے میں تجھے پاگل کروں گا اور پھر.........."

"نہیں بالکل نہیں تو ایسا نہیں کر سکتا' نہیں کر سکتا۔"

"تو.......... تو اپنے مہمانوں کو حویلی سے رخصت کر دے۔ میں انہیں حویلی میں دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"وہ چلے جائیں گے لیکن.........."

"لیکن کیا؟"

"لیکن یہ کہ میں انہیں اس انداز میں رخصت نہیں کر سکتی کہ وہ یہ تاثر لے کر جائیں کہ میں نے انہیں کسی خوف کی وجہ سے بھگا دیا۔"

"دو دنوں بعد چودھویں کی رات ہے۔ وہ رات جب میں.......... خیر اس رات سے قبل.........."

"ٹھیک ہے' میں کوشش کروں گی لیکن تجھے وعدہ کرنا پڑے گا کہ میرا بیٹا.......... میری بہو.......... میرا پوتا۔"

"تو میرا کام پہلے کر۔ میں کوئی وعدہ نہیں کرتا بس اب میرے قریب آ۔ مجھے سرشار کر۔ میری روح میں اتر جا۔ مجھے آسودگی' مجھے تسکین بخش۔" انسان نما سانپ نے راحیلہ کی طرف بڑھتے ہوئے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"نہیں' نہیں اب مجھ سے دور رہ۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں تیرا زہر نہ بھرا ہو۔ اب میرے قریب مت آنا۔ میں تیرے زہر کی آگ میں جل رہی ہوں۔ سلگ رہی ہوں' بے کل اور بے چین رہتی ہوں۔ بس اب مجھے کسی ایسی جگہ ڈس کہ میرا سارا وجود ٹھنڈا ہو جائے' برف کی طرح سرد.........."

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم مجھے پورے سات سو سال بعد ملی ہو' ابھی تو میرا پوری طرح دل بھی نہیں بھرا۔ میری پیاس نہیں بجھی۔ تم وہ عورت ہو جسے میرے لیے پہلی بار منتخب کیا گیا تھا۔ پہلی بار تم نے میرے ساتھ ڈھائی سو سال گزارے تھے۔ اس وقت تم نے اپنا انگ انگ میرے وجود میں بھر دیا تھا۔ میری روح' میرا زہر تمہاری شریانوں میں دوڑنے لگا تھا اور پھر ایک دن تم اچانک ہی ٹھنڈی ہو گئیں۔ میں بہت تڑپا' بلبلایا' چیخا تب میں نے محسوس کیا کہ تمہارا وجود میرے لیے کتنا ضروری تھا۔"

"بس بس خاموش ہو جاؤ۔"

"نہیں سنو' میری بات سنو۔" انسان نما سانپ نے جیسے حکم دیا۔ "پھر ایک رات نے کسی اور کے دامن میں سکون تلاش کیا۔ یہ سلسلہ سات سو سال تک جاری رہا۔ سات سو سالوں میں چھ عورتیں میرے تصرف میں رہیں اور پھر ایک دن تم مل گئیں۔ نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا لیکن تم مجھے نہیں پہچان سکیں۔ دوبارہ جب تم ملیں تو سو سال تک تمہارا میرا ساتھ رہا۔ اس کے بعد تم مر گئیں۔ میں پھر تڑپا بلبلایا لیکن ہیں زندگی دینا میرے بس میں نہیں تھا۔"

"یہ تم کیوں کہہ رہے ہو مجھ سے؟ بتاؤ کیوں کہہ رہے ہو؟" راحیلہ نے اپنے برہنہ کو بالوں کے درمیان سمیٹ کر چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"سنو پھر تم ہر سات سو سال کے وقفے سے مجھے ملتی رہی ہو۔ اب تم مجھ سے جدا جاؤ گی تو پھر سات سو سال بعد ہی ملو گی۔ اس لیے آ' میرے قریب آ تاکہ میں تیری ریانوں میں اپنا زہر بھر دوں۔ تیرے انگ انگ سے پھوٹنے والی خوشبو سے خود کو معطر کر ں۔ اپنی سدا کی بے چین زبان سے تیرے بدن کو غسل دوں' تجھے اتنا چاٹوں.......... اتنا ٹوں کہ میری زبان خون کے ذائقے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ آ.......... میرے قریب ر قریب.........." انسان نما سانپ کی آواز پھنکاروں میں بدلنے لگی اور پھر وہ حصہ ریک ہو گیا جہاں راحیلہ' چوکی اور انسان نما سانپ موجود تھے۔

اس حصے کے تاریک ہوتے ہی گھنٹیوں کا شور بلند ہوا۔ پری وش کو یوں لگا جیسے یہ ر اس کے کان پھاڑ دے گا۔ گھنٹیوں کے کان پھاڑ دینے والے شور کے درمیان بھی پری ش کو لذت و انبساط میں ڈوبی ہوئی راحیلہ کی سسکاریاں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر یک ت ہی گھنٹیوں کا شور اور سسکاریاں معدوم ہو گئیں۔ پری وش نے سکون کی سانس لی ا کہ ایک سرگوشی سنائی دی۔ "سب کچھ اس میں بھر دو۔" پری وش نے اس سمت ھا جدھر سے سرگوشی ابھری تھی۔

"اف اتنا سونا!" پری وش نے زیرلب کہا۔ سرگوشی اس پنڈت نے کی تھی جو نے' زیورات اور مختلف سکوں کے قریب کھڑا ہوا تھا۔

اس پنڈت نے منتر پڑھتے ہوئے کہا۔ "اس رنجن میں ایک ایک چیز صرف یہ پتری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈالے گی۔" پنڈت نے جس لڑکی کی طرف اشارہ کیا وہ بہت خوبصورت اور تقریباً تیرہ سال کی تھی۔

پری وش نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا تو پھر حیرت کے رنگ اس کے چہرے پر بکھر گئے۔ وہ لڑکی ہوبہو راحیلہ کی طرح تھی۔ میری ساس جوانی میں اس کی طرح ہوں گی۔ پری وش نے سوچا۔ لیکن یہ.......... کیسے ممکن ہے؟ کیسے ممکن..........

"جو ریکھا میں نے رنجن کے گرد کھینچ دی ہے اس کے اندر چلی جا۔" پنڈت نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہاں پڑی ہوئی ہر چیز اٹھا کر رنجن میں ڈال۔"

"ہاں بیٹی جو پنڈت جی کہہ رہے ہیں وہی کر۔" سونے سکوں اور زیورات کے ڈھیر سے دور کھڑے ہوئے ایک بوڑھے نے کہا۔ اس کا پیٹ بہت بڑا' سر گنجا اور تن ننگا تھا۔ وہ صرف کمر سے ایک دھوتی جیسا کپڑا لپیٹے ہوئے تھا۔

"لیکن بابو.......... یہ بہت.........." لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔ لب و لہجہ بالکل راحیلہ کی طرح تھا اور آواز بھی۔

"آہستہ آہستہ اٹھا کر ڈالتی جا بیٹی۔ رنجن بہت مضبوط ہے ٹوٹے گا نہیں۔" بوڑھے نے کہا۔ "جلدی کر۔"

رنجن کی شکل کسی بڑی سی ہانڈی کی طرح تھی۔ لڑکی سونے کی اینٹیں' زیورات' مختلف سکے اٹھا اٹھا کر رنجن کے بڑے سے منہ میں ڈالتی رہی اور پنڈت کچھ پڑھتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں لڑکی نے ایک ایک چیز رنجن میں ڈال دی تھی۔

"یہ ڈھکن اٹھا پتری!" پنڈت نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ "اسے رنجن کے منہ پر رکھ دے۔"

لڑکی نے قریب پڑا ہوا ڈھکن بھی رنجن کے منہ پر رکھ دیا۔

"اب یہ سانپ اٹھا۔" پنڈت نے چند لمحے تیز تیز آواز میں کچھ پڑھنے کے بعد کہا۔ "یہ سانپ مہاشے کی دولت کی حفاظت کرے گا۔"

لڑکی نے مٹی سے بنے ہوئے سانپ کی طرف دیکھا اور پھر اسے اٹھا کر ڈھکن کے درمیان رکھ دیا۔

پنڈت نے پھر تیز آواز میں کچھ پڑھا اور پھر لڑکی سے کہا۔ "اس رنجن کے گرد

سات پھیرے لگا تا کہ ناگ دیوتا تجھے قبول کر لے۔"

لڑکی نے دور کھڑے ہوئے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں کئی سوال تھے۔ "جو پنڈت جی کہہ رہے ہیں بیٹی وہی کر' میں اپنے پرکھوں کی دولت کو اپنی دنیا تک سلامت رکھنا چاہتا ہوں۔ تیری قربانی اگر اس دولت کو محفوظ کرتی ہے تو یہ تیرے لیے خوشی کا مقام ہے۔ ناگ دیوتا تیری قربانی قبول کرے' آنکھیں بند کر کے پھیرے لگا لے۔"

"چل ہندی پتری' سمے کم ہے اور کام بہت' جلدی کر۔"

لڑکی نے آنکھیں بند کر کے رنجن کے گرد سات پھیرے لگائے اور پھر کھڑی ہو گئی' اس کا بدن کانپ رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ پھیرے ختم ہونے کے باوجود بھی اس نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

پھیرے ختم ہونے کے بعد پنڈت نے ناریل اٹھا کر فرش پر مارا۔ ناریل ٹوٹ گیا۔ پنڈت نے اس طرح سات ناریل توڑے اور آرتی میں جلتا ہوا دیا اٹھا کر دیئے کے سات پھیرے رنجن پر دیئے اور بلند آواز میں بولا۔ "اے ناگ' اے اس دولت کے رکھوالے' یہ خوبصورت کنواری تیرے لیے ہے۔ اس دولت کی حفاظت بھی تیرا کام ہے اس کی طرف بڑھنے والے ہر ہاتھ کو فنا کر دینا۔ دولت جب تک محفوظ رہے گی' کنواری تیری رہے گی۔ اب تیری اجازت سے ہم اس دولت کو وہاں رکھ دیں گے جہاں ہمیں اسے رکھنا ہے۔ وہ جگہ اس دولت کی پہلی اور آخری جگہ ہے۔ اب تو ہمیں اس دولت کو اس جگہ لے جانے کی اجازت دے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی اس رنجن کو ایک گڑھے میں اتارا جا رہا تھا۔

"پنڈت جی' یہ گڑھا دس فٹ گہرا ہے اور گڑھے کو میں نے مندر اور باؤلی سے ملا دیا ہے۔ اب اس گڑھے تک ایک راستہ کالی ماتا کے مندر سے آتا ہے اور ایک راستہ باؤلی کی اس سمت والی دیوار سے۔ کنوئیں کی دیوار میں اوپر سے دس فٹ کے فاصلے پر ایک ایسا نشان لگایا گیا ہے جو عام طور پر دیکھنے سے نظر نہیں آتا۔ اسے ایک خاص وقت میں حویلی کی چھت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرا راستہ کالی ماتا کے قدموں کے نیچے تلاش کیا جا سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے' چودھویں رات کو آدھی رات کے بعد اس گڑھے کو پاٹ دینا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پنڈت نے کچھ پڑھ کر سات بار مٹی گڑھے میں ڈالنے کے بعد کہا۔ "تیرے خزانے کی جو حفاظت کرے گا وہ صدیوں سے یہی کر رہا ہے۔ اس کے سامنے جو قربانی تو نے دی ہے وہ اب تیرے خاندان کی روایت بن جائے گی۔ تیرے خاندان میں ایک کنواری اس کے نام پر رہے گی۔ اب اس لڑکی کا بیاہ تو زندگی بھر نہیں کرے گا' اگر کوشش کی جائے گی تو نقصان ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے مہاراج!" بوڑھے نے کہا۔ "اپنے پرکھوں کے مال کی حفاظت کے لیے یہ قربانی بڑی قربانی نہیں ہے۔ میرے خاندان کی کنواریاں تو زندہ رہیں گی نا' مرلی دھرنے تو ہر پچیس سال بعد ایک لڑکی بھینٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔"

"تم کسی اور کی بات مت کرو۔ اگر مرلی دھرنے کسی سے یہ کہا ہے تو وہ نقصان اٹھائے گا۔ تم نے جو وعدہ ناگ سے کیا ہے وہ کسی سے مت کہنا۔ لڑکی بھی اپنی زبان بند رکھے گی ورنہ یہ وقت سے پہلے ہی مرجائے گی۔"

"پنڈت جی!" بوڑھے نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ تاریخ والا چاندی کا [illegible] باہر ہی رہ گیا۔"

"میں نے جان کر چھوڑا ہے۔ تم نے اس پر عیسائیوں والی تاریخ کندہ کی ہے۔ تیرہ سو ایک' ہماری یہ تاریخ نہیں ہے۔ اب اسے رہنے دو۔ اس سے واپ [illegible] یوں بھی اس خزانے میں تاریخ رکھنے کی ضرورت نہیں' جو سونے کے سکے تم نے رکھے ہیں ان پر تاریخ موجود ہے۔"

پری وش نے لڑکی کی طرف دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے لڑکی کا رنگ بدل رہا ہو اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ ہری نیلی ہو گئی تھی۔ اس کے قریب کھڑے ہوئے بوڑھے نے مسکراتے ہوئے لڑکی کی طرف جھک کر کچھ کہا۔ جیسے ہی بوڑھا سیدھا ہوا لڑکی کے بدن میں آگ لگ گئی۔

لمحہ لمحہ بلند ہوتی ہوئی روشنی میں پری وش نے کچھ لوگوں کو رنجن گڑھے میں اتارتے اور گڑھے کو بند کرتے دیکھا۔ جب رنجن گڑھے میں اتارنے والے گڑھا بند کر رہے تھے تو اس بوڑھے نے چاروں مزدوروں کو ٹرے میں رکھے ہوئے گلاس اٹھا کر دیئے۔ ان مزدوروں نے بوڑھے کو تعظیم دی اور گلاس لبوں سے لگا لئے۔ جب انہوں

نے گلاس لبوں سے ہٹائے تو بوڑھے نے انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے ہی بیٹھے کرب سے تڑپ گئے اور پھر زندگی ان سے روٹھ گئی۔ بوڑھے نے ان چاروں کو ایک ایک کر کے گڑھے میں ڈالا اور پھر باقی بچی ہوئی مٹی گڑھے میں ڈال کر اسے بند کر دیا۔ گویا اس نے ان لوگوں کو بھی دفن کر دیا تھا جنہیں یہ معلوم تھا کہ بوڑھے نے یہ خزانہ یہاں دبایا ہے۔

بوڑھا گڑھا بند کر کے جیسے ہی سیدھا ہوا ماحول تاریک ہو گیا۔ پری وش کو اس اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ خود کو ٹٹول کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تاریکی چند لمحے ہی رہی اور پھر جب روشنی اس کے گرد پھیل گئی تو اس نے خود کو ان گنت سانپوں کے درمیان پایا۔ سانپوں کی پھنکاریں اور سرسراہٹیں اس کی سماعت میں جیسے زہر بھرنے لگیں۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے اور اس سانپ پر نظریں جما دیں جو تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ "نہیں............ نہیں............ بچاؤ............ بچاؤ۔" اس نے پوری قوت سے کہا' لیکن آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہ سانپ جب چند گز کے فاصلے پر رہ گیا تو اس نے پاؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی تاکہ پوری قوت سے دوڑ لگا دے۔ اس کے پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ پیروں کو حرکت کرتے دیکھ کر اسے مسرت ہوئی اور اس نے مڑ کر مخالف سمت میں دوڑ لگا دی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دیوار سے ٹکرا گئی' اس کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ تکلیف اتنی شدید تھی کہ اس کے ذہن سے سانپ کا خیال محو ہو گیا۔

"کیا ہوا' کیا ہو گیا تمہیں؟" کسی نے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔ "پری وش' اے پری وش' یہ فرش پر کیوں بیٹھی ہو؟"

"میں............ میں شاید بیڈ سے نیچے گر گئی۔" پری وش نے راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ............ آپ یہاں؟"

"میں ادھر سے گزر رہی تھی کہ تمہاری چیخ سن کر اندر آ گئی۔ امانت ابھی تک شہر سے واپس نہیں آیا۔"

"کیا وہ شہر............"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں شہر گیا تھا۔" راحیلہ نے کہا۔ "کہیں ایسا تو نہیں تم ڈر گئی ہو' کوئی خواب........." راحیلہ نے معنی خیز انداز میں فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ اصل میں یہی دیکھنے آئی تھی کہ پری وش سو رہی ہے یا جاگ رہی ہے۔ جب وہ پری وش کے کمرے کے آگے پہنچی تو اسے پری وش کی چیخ سنائی دی۔ "کوئی خواب تو نہیں دیکھ لیا؟"

"کیا آپ نے بھی کوئی خواب........." پری وش نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔

"میں تو سوئی نہیں۔" راحیلہ نے کہا۔

پری وش کو یوں لگا جیسے وہ جھوٹ بول رہی ہو چند لمحے غور کرنے کے بعد پری وش نے کہا۔ "مجھے بھی کوئی خواب نظر نہیں آیا بس اچانک ہی نہ جانے کیا ہوا کہ میں بیڈ سے نیچے گر پڑی۔ میرا خیال ہے چوٹ لگنے کی وجہ سے میری چیخ نکل گئی۔"

"ٹھیک ہے' سو جاؤ۔ امانت شاید صبح ہی واپس آئے۔" راحیلہ نے کہا۔ "اگر گھبرا رہی ہو تو میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

"نہیں۔" پری وش نے کہا۔ "میں اپنے ہی کمرے میں سو جاؤں گی۔"

"دروازہ اندر سے بند کر لینا۔" راحیلہ زیب کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"تھوڑی دیر سو لو۔ اب صبح ہونے ہی والی ہے۔"

راحیلہ کے جانے کے بعد پری وش نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور بیڈ پر لیٹ گئی۔ صبح ہونے والی ہے۔ سورج نکلنے والا ہے۔ اس نے سوچا۔ سورج نکلتے ہی......... نکلتے ہی......... میں حویلی چھوڑ دوں گی۔ میں کسی سانپ کو جنم دینا نہیں چاہتی۔ اگر میں یہاں رہی اور......... اور امانت علی یا راحیلہ نے......... نہیں' مجھے حویلی چھوڑ دینی چاہیے۔

اس کا ذہن مسلسل چل رہا تھا۔ مختلف باتیں تصور بن رہی تھیں۔ اب سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' فجر کا وقت تو ہو ہی گیا ہے۔

O☆O

راحیلہ کے مہمان ناشتے کے بعد ڈرائنگ روم میں آ گئے تھے۔ جمال فاروق' ڈیسوزا' گھنشام داس اور مولوی عابد حسین۔ ان چاروں نے رات ایک ہی کمرے میں گزاری تھی۔ "میں جانتا تھا کہ گفتگو لمبی ہو گئی تو رات آنکھوں میں ہی کٹ جائے گی۔"

مولوی عابد حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں انہیں چھوڑ کر جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن جمال فاروق تیار نہیں ہوئے۔ روزا میرے ہی گھر پر ہے۔"

"اگر آپ کہیں تو میں روزا کو بلا لیتی ہوں۔"

"رہنے دیں' کیا حرج ہے۔" مولوی عابد حسین نے کہا۔

عابد حسین کے کہنے کے باوجود راحیلہ نے امانت علی کو مولوی کے گھر بھیج دیا۔ مولوی کا پتہ اور فون نمبر امانت علی کو معلوم ہی تھا۔ امانت روزا کو لینے گیا تو پھر واپس ہی نہیں آیا تھا۔ ناشتے پر بھی روزا اور امانت علی کا انتظار کیا گیا۔

سورج ڈوبنے سے قبل ہی عابد حسین نے سب سے کہا تھا کہ اس نے کمرے کے گرد حصار کھینچ دیا ہے اس لیے کوئی باہر نہیں نکلے گا۔ اس نے مختلف خدشات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میرا خیال ہے اگر ہمارے خلاف کچھ ہو گا تو وہ سورج ڈوبنے کے بعد ہی ہو گا۔ "میرے حصار سے کوئی صاحب غیر مطمئن ہوں تو وہ اپنے طور اور عقائد کے مطابق اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ویسے میں نے جو حصار کھینچا ہے وہ ایسا نہیں کہ آپ لوگ اس کے اندر رہ کر کچھ نہ کر سکیں۔"

عابد حسین کی گفتگو ہر شخص نے توجہ سے سنی تھی اور پھر گھنشام نے کہا۔ "میں تمہارے حصار میں رہ کر بھی اپنے لیے کچھ کروں گا۔"

"ضرور کرو۔" عابد حسین نے کہا۔

"میں تو کر چکا ہوں۔" ڈیسوزا نے چاندی کی صلیب دکھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے عابد حسین کے حصار پر اعتقاد ہے۔" جمال فاروق نے کہا۔

ملازم جب انہیں کھانے کے کمرے میں چلنے کی دعوت دینے آیا تو ان لوگوں نے کہا تھا کہ وہ رات کا کھانا نہیں کھائیں گے۔ سفر کی وجہ سے تھک گئے ہیں اس لئے سو رہے ہیں۔ پھر ملازم کے جاتے ہی انہوں نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

حصار کے باوجود بھی ان چاروں نے رات سکون سے نہیں گزاری تھی۔ مختلف قسم کی آوازیں انہیں سنائی دیتی رہیں۔ بعض اوقات بڑی بھیانک چیخیں اور مدد کے لیے بلانے والی آوازیں بھی آئیں لیکن عابد حسین نے کسی کو نہ دروازہ کھولنے کی اجازت دی اور نہ جانے کی۔ "میرے کہنے کے خلاف عمل بالکل مت کرنا۔ میرا تجربہ آپ لوگوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زیادہ ہے۔ میں نے کئی عملی کام کئے ہیں جبکہ آپ نے صرف پڑھا اور چند توڑ سیکھے ہوئے ہیں۔" عابد حسین نے کہا تھا۔ "اس کمرے کے باہر موت ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ نکلے اور گئے۔ عابد حسین نے ڈیسوزا کو شراب کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا۔ "صبح چار بوتلیں پی لینا۔ اس وقت میں تمہیں ایک قطرہ بھی نہیں پینے دوں گا۔"

ڈرائنگ روم میں چند لمحے خاموشی رہی اور پھر ڈیسوزا نے کہا۔ "اگر روزا آجاتی تو جو کارروائی ہم کرنے جارہے ہیں اس کے بارے میں اس سے بھی مشورہ کر لیتے۔"

"ٹیلی فون کر لو' رکھا تو ہے۔" جمال فاروق نے کہا۔ "راحیلہ کا لڑکا بھی ابھی تک نہیں آیا۔"

ڈیسوزا نے فون نہیں کیا لیکن عابد حسین نے اپنے گھر کے نمبر ڈائل کئے۔ دوسری طرف اس کے ملازم نے ریسیور اٹھایا تھا۔ اس کے ہیلو کہنے کے بعد عابد حسین نے پوچھا۔ "مہمان کہاں ہیں؟"

"ناشتے کے بعد بیگم صاحبہ کے ساتھ کہیں نکل گئے۔ کہہ کر گئے ہیں دوپہر کے کھانے پر واپس آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے' تم کھانے کا انتظام کرو۔ انہیں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔" اتنا کہہ کر عابد حسین نے ریسیور رکھا اور گھنشام داس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "روزا تو شاید شام سے پہلے نہیں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے' ممکن ہے' ہم لوگ خود شام سے پہلے ہی یہاں سے چلے جائیں۔" عابد حسین نے کہا۔ "راحیلہ آجائے تو اس سے آخری بار بات کر لیں' اگر وہ مان جاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر............"

"اس کی بغیر اجازت یہاں کچھ کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ پولیس اور عدالت کے چکر میں پھنس گئے تو جان سے جائیں گے۔" جمال فاروق نے کہا۔ "حویلی کا جو نقشہ ہمارے ذہن میں تھا وہ حویلی سے مختلف ہی تھا۔ اندھا کنواں ہم نے کل بھی دیکھا تھا' آج پھر دیکھ لیں گے' مندر بھی باہر سے دیکھ ہی لیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق خزانے کا راستہ مندر ہی میں سے ہے یا پھر اندھے کنوئیں کے چاروں طرف کھدائی کی جائے کیوں کہ اندھے کنوئیں کے کسی سمت وہ دفن ہے۔"

"تم نے یہ سب کچھ جس سے معلوم کیا ہے' وہ معتبر ہے۔ وجاہت نے تم سے غلط نہیں کہا ہوگا۔ وہ اس حویلی کا مالک ہے اور اسے سب ہی کچھ معلوم ہوگا۔" عابد حسین نے کہا۔ "اس سلسلے میں راحیلہ ہماری مدد کرے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے راحیلہ ہماری مدد نہیں کرے گی۔" گھنشام داس نے کہا۔ "کنواریوں کی کہانیاں ہم سن چکے ہیں۔ راحیلہ بھی اس خاندان کی کنواری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خزانے کے رکھوالے کی مدد کرے گی' میں تو یہی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس نے ہمیں یہاں ٹھہرنے کی اجازت دی کیسے؟"

"شاید اسے یہ توقع ہو کہ صبح ہم زندہ نہیں ملیں گے۔" ڈیسوزا نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ابھی تک یہاں آئی بھی نہیں جب کہ اس نے فوراً آنے کا وعدہ کیا تھا۔"

"میں آگئی ہوں۔" راحیلہ نے ڈرائنگ روم کے دروازے ہی سے کہا۔ "اس سے پہلے کہ میں آپ سے کوئی اور بات کروں مولوی عابد حسین سے تھوڑی سی مدد لینا چاہتی ہوں۔"

"میں دل و جان سے حاضر ہوں۔"

"میری بہو' پری وش کو آپ اپنے گھر میں رکھیں چند دنوں کے لیے' پھر میں اس کے کہیں اور رکھنے کا بندوبست کروں گی۔"

"میں آپ سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ آپ یہ کیوں چاہتی ہیں۔" عابد حسین نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر راحیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرا کارڈ............"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں' میرا ڈرائیور آپ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ شاید وہ آپ کی بیوی کا عزیز بھی ہے۔" راحیلہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ نے اسے ایک سال پہلے حویلی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے یہاں ملازم کرایا تھا۔"

"آپ اسی کے ساتھ اپنی بہو کو بھیج دیں۔" مولوی عابد حسین نے دھیمی آواز میں کہا۔ "صبح آپ کی بہو ناشتے سے قبل مجھ سے مل چکی ہے۔ رات کے خواب کے کچھ حصے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سن چکا ہوں۔"

"میں نے پری وش کو بھجوا دیا ہے۔" راحیلہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اب آپ لوگ بتائیں۔"

"ہمارے یہاں آنے کے مقصد سے آپ واقف ہیں۔" عابد حسین نے کہا۔

"اور آپ لوگ میری ذات سے واقف ہیں۔" راحیلہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"ہاں' دن کی روشنی میں بھی اور رات کی تاریکی میں بھی۔" عابد حسین کا لہجہ سرد تھا۔ "ہم دن کی روشنی ہی میں سب کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"آپ لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں' اسے مارنا چاہتے ہیں جو آپ کو زندہ درگور کئے ہوئے ہے۔"

"آپ اس کے متعلق کیا جانتے ہیں؟"

"بہت کچھ۔" عابد حسین نے کہا۔ "اس چودھویں کے چاند کے طلوع ہونے سے قبل ہی ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں ورنہ وہ یہاں سے دور کھسک جائے گا۔ ممکن ہے ہمارے لئے مصیبتیں بھی کھڑی کرے۔"

"آپ لوگ مجھ پر اعتبار کرتے ہیں؟"

"صرف سورج کے چمکنے تک' جہاں وہ غروب ہوا' آپ پر اعتبار کرنا..........." عابد حسین نے کہا۔ "خیر اس بات کو چھوڑیں۔ آپ اس خزانے کے..........."

"میں سب جانتی ہوں۔ میرے والد' میرے بھائی بھی جانتے تھے لیکن..........."

"ہم اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔"

"اس کا انجام کیا ہوگا' میں جانتی ہوں۔"

"ہمیں اپنے انجام کی پروا نہیں' آپ کا انجام..........."

"مجھے اب اس کی پروا نہیں۔ جو اذیتیں مجھے ملنی تھیں وہ مل چکیں۔ اب میں خود زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ اپنی مرضی سے مرنا چاہتی ہوں۔"

"اپنی مرضی سے۔"

"ہاں اپنی مرضی سے۔" راحیلہ نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ "مرنے کے بعد

میں سکون سے رہنا چاہتی ہوں۔ رات ہی مجھے معلوم ہوا کہ میں کیوں کر سکون سے مر سکوں گی۔"

"رات معلوم ہوا۔" ڈیسوزا نے کہا۔

"ہاں' آپ لوگوں کو حصار میں دیکھنے کے بعد۔ میرا خیال تھا کہ آپ لوگوں میں سے ایک بھی نہیں بچے گا' لیکن آپ سب صحیح سلامت تھے۔"

"آپ بھی اس کے شر سے محفوظ رہ سکتی ہیں۔" عابد حسین نے کہا۔ "جب تک ہم لوگ یہاں ہیں آپ یہ حویلی چھوڑ دیں۔ ورنہ..........."

"کہاں جاؤں؟"

"میرے گھر چلیں۔ میرا خیال ہے میرا گھر اس کی حد سے باہر ہے۔ اگر نہیں بھی ہے تو میں آپ کو حصار میں رکھوں گا۔"

راحیلہ نے چند لمحے سوچا اور پھر عابد حسین کے گھر جانے پر راضی ہو گئی۔ عابد حسین' راحیلہ کے ساتھ ہی روانہ ہوا تھا۔ اس کی واپسی دو گھنٹے بعد ہوئی۔

"اب تو زوال کا وقت شروع ہونے والا ہے۔" گھنشام داس نے کہا۔

"چار گھنٹے پھر بھی ہمارے پاس ہیں۔" عابد حسین نے کہا۔ "سب سے پہلے مندر کو دیکھ لیں۔"

"نہیں' میرا خیال ہے' وہ عمل کیا جائے جس سے خزانہ خود بخود باہر آ جاتا ہے۔"

"تمہیں آتا ہے وہ عمل؟" عابد حسین نے پوچھا۔

"نہیں' کہتے ہیں مسلمان کو آتا ہے۔" ڈیسوزا نے کہا۔ "تم کرو نا وہ عمل۔"

"وہ عمل کرنے کا یہ وقت نہیں ہے۔" عابد حسین نے کہا۔ "آثار قدیمہ والوں نے تو صرف کھدائیاں کی تھیں' کوئی عمل نہیں کیا اور خزانے ان کے ہاتھ آئے۔"

"یہ خزانہ وہ نہیں ہے۔"

"پھر..... پھر کیا کریں؟"

آدھے گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد مندر اور اندھے کنوئیں کو ایک ساتھ اڑانے کا فیصلہ کیا گیا۔

گاؤں والوں نے اتنے بڑے دو دھماکے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ دھماکے کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے قبل حویلی خالی کرالی گئی تھی اور فون کے ذریعے پولیس کو بھی اطلاع کی گئی تھی۔ کیا یہ گیا تھا کہ مندر کو اڑا کر اس کی جگہ مسجد تعمیر کی جائے گی۔ دھماکوں کے ساتھ نہ صرف مندر اڑ گیا بلکہ حویلی کے بھی کئی حصے منہدم ہو گئے۔ اندھے کنوئیں کے قریب جو دھماکہ کیا گیا تھا اس نے اندھے کنوئیں کا قطر بہت وسیع کر دیا تھا۔

یہ دھماکے سورج غروب ہونے سے دو گھنٹے پہلے کیے گئے تھے اور سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے وہ چاروں پھر ایک کمرے میں بند ہو گئے۔ انہوں نے بند ہونے سے قبل حویلی کے صدر دروازے کو بند کرا دیا تھا۔ راحیلہ کے چار خاص آدمی حویلی ہی میں تھے' باقی ملازمین کی چھٹی کر دی گئی تھی۔

رات ایک بجے کے بعد حویلی میں جیسے طوفان آ گیا تھا۔ بھیانک آوازیں' سرسراہٹیں' قہقہے' چیخ اور چیخ کی بازگشت' مسلسل بازگشت' کتوں کے رونے کی آوازیں' بلیوں کے لڑنے اور رونے کی آوازیں اور دو بجے رات کو انہیں یوں لگا جیسے راحیلہ آوازیں دے رہی ہو' مدد کے لیے پکار رہی ہو۔

"یہ.......... یہ آواز راحیلہ کی ہے۔" ڈیسوزا نے کہا۔

"ہاں میں بھی سن رہا ہوں۔"

"پھر.......... پھر اسے بچائیں' معلوم نہیں اس پر کیا بیت رہی ہے۔"

"نہیں کمرے سے باہر قدم مت نکالنا ورنہ.........."

روزا کی آواز نے عابد حسین کو خاموش کر دیا۔ روزا دروازہ پیٹ رہی تھی۔

"ڈیسوزا دروازہ کھولو' میں روزا ہوں' کھولو دروازہ.......... ڈیسوزا.........."

"دروازے کے قریب بھی مت جانا۔" عابد حسین نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی جان سے پیاری بیوی کی آواز پر بھی دروازہ نہیں کھولوں گا۔" ڈیسوزا نے نفرت سے عابد حسین کی طرف دیکھا اور پھر دروازے کی طرف جست لگائی' لیکن عابد حسین نے اسے دروازے تک پہنچنے نہیں دیا۔ "جمال فاروق' یہ ہمیں تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

جمال فاروق نے آگے بڑھ کر ڈیسوزا کی گردن پر ہاتھ مارا۔ "دروازے کے قریب مت جانا ورنہ جان سے مار دوں گا۔"

یہ لوگ کمرے کے اندر الجھے ہوئے تھے اور باہر روزا اور راحیلہ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ انہیں مدد کے لیے بلا رہی تھیں' دروازہ کھولنے اور باہر آنے کی التجائیں کر رہی تھیں۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔ جمال فاروق اور مولوی عابد حسین زیر لب کچھ پڑھ بھی رہے تھے۔

رات کے تین بجے تھے جب روزا کی بھیانک چیخ اور راحیلہ کا قہقہہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی راحیلہ کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نہیں.......... نہیں مجھے چھوڑ کر مت جاؤ' نہ جاؤ' میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی' تباہ ہو جاؤں گی.......... نہیں بتاؤ.......... بتاؤ کہاں جا رہے ہو' میں وہاں پہنچوں گی' ضرور آؤں گی.......... بتاؤ مجھے بتاؤ۔"

"نہیں.......... نہیں.........." پھنکار جیسی آواز ابھری۔ "اب سات سو سال بعد ملیں گے۔ میں یہاں نہیں رک سکتا' نہیں رک سکتا۔"

"کھسک گیا وہ۔" عابد حسین نے کہا۔ "میرا خیال ہے وہ شمال کی طرف جائے گا۔ اس سمت میں میلوں دریا نہیں ہے۔"

"تو کیا اب ہم اسے.........."

"اسے تلاش کرنے میں اب سالوں لگیں گے۔" عابد حسین نے کہا۔ "وہ ہم سے کمزور تھا' ورنہ فرار نہیں ہوتا۔"

"تو کیا راحیلہ.........."

"اگر راحیلہ زندہ بچ گئی تو پاگل ہو جائے گی' خطرناک پاگل۔" عابد حسین نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

صبح روزا کی لاش اندھے کنوئیں کے قریب ہی ملی۔ اس کے قریب ہی راحیلہ پڑی ہوئی تھی۔ وہ بے ہوش تھی۔ بعد میں عابد حسین کے گھر والوں نے بتایا کہ دس بجے رات کو راحیلہ نے حویلی چلنے کی بات کی۔ امانت اور پری وش تو تیار نہیں ہوئے' روزا تیار ہو گئی تھی اور وہ دونوں راحیلہ کی کار ہی میں روانہ ہوئے۔

اسپتال پہنچ کر راحیلہ کو ہوش تو آ گیا تھا لیکن وہ آپے میں نہیں تھی۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکلتی تھیں۔ بعض اوقات وہ کسی سانپ ہی کی طرح پھنکارتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔

حویلی ویران ہو گئی تھی۔ امانت علی اور پری وش نے شہر ہی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ راحیلہ نے ان کے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ وہ خود تو پاگل خانے پہنچ گئی تھی۔ اسے خطرناک پاگلوں کے وارڈ میں رکھا گیا تھا' تین ماہ پاگل خانے میں رہنے کے بعد وہ مر گئی۔ اس کی موت بھوکا رہنے سے ہوئی تھی۔

ڈیسوزا' جمال فاروق اور گھنشام داس دو ہفتے عابد حسین کے مہمان رہے اور پھر یہاں سے خالی ہاتھ ہی روانہ ہو گئے۔ جمال فاروق نے جاتے ہوئے عابد حسین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ حویلی والے خزانے کا معلوم ضرور کرے کہ وہ کس سمت اور کتنی دور کھسک گیا ہے۔

O☆O

غار کی پراسرار مخلوق

یہ بھیانک داستان ڈاکٹر جیمز ہارڈ کیسل کے ذاتی کاغذوں میں سے دستیاب ہوئی ہے۔ ۴ فروری ۱۹۰۸ء کو ساؤتھ کنسنگٹن کے فلیٹ نمبر ۳۶ میں اس نے انتقال کیا۔ وہ دق کا پرانا مریض تھا۔ ڈاکٹر جیمز کو جاننے والوں کا بیان ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ایک بااصول' ذہین اور صاف گو آدمی تھا اور ہمیشہ کسی نہ کسی پراسرار گتھی کو سلجھانے میں مصروف رہتا۔ اسے کہانیاں گھڑنے اور مبالغہ آمیز باتیں کرنے کی عادت نہ تھی' اس لیے یقین ہے کہ جو تحریر اس کے کاغذات میں پائی گئی ہے' وہ سچی ہے اور اسے من گھڑت نہیں کہا جاسکتا۔ کہانی جن کاغذوں پر لکھی ہوئی ہے' وہ ایک بڑے اور سربمہر لفافے میں بند تھے۔ لفافے کے ایک طرف ڈاکٹر جیمز نے یہ الفاظ تحریر کیے:

"میں نے گزشتہ سال کا موسم بہار ڈربی شائر کے شمال مغربی حصے میں ایلرٹن فارم کے نزدیک گزارا۔ اس مقام پر میں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اسے مختصر الفاظ میں قلمبند کرتا ہوں۔"

لفافے کی دوسری طرف بھی پنسل سے چند سطریں لکھی تھیں:

"پیارے سٹین' گزشتہ برس مجھ پر ڈربی شائر میں جو کچھ بیتی' وہ میں تمہیں سنا چکا ہوں تم نے خود محسوس کیا تھا کہ واقعات کس قدر لرزہ خیز اور ناقابل یقین ہیں۔ جانتے ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں کبھی غلط بیانی نہیں کرتا۔ اگر یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا' تو کبھی یقین نہ آتا کہ بلیو جان کے تاریک اور تحت الثریٰ تک پہنچنے والے غار میں کون سی "مخلوق" رہتی ہے۔ میں اسے "مخلوق" ہی کہوں گا' کیونکہ ہم ہر طرح کی جاندار چیز کو "مخلوق" ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ تم نے مجھے ہدایت کی تھی کہ یہ قصہ کسی اور کو نہ سناؤں' اس سے خواہ مخواہ دہشت پھیلے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ لوگ میری دماغی صحت پر شبہ کرنے لگیں' چنانچہ میں نے تمہاری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا منہ بند کرلیا' مگر میری خواہش ہے کہ میرے مرنے کے بعد یہ لرزہ خیز داستان عوام تک پہنچے۔ میں نے اپنا فرض ادا کردیا ہے۔ شاید مستقبل قریب یا بعید میں کوئی شخص میری اس داستان سے فائدہ اٹھائے اور بلیو جان کے تاریک غار کی پراسرار مخلوق سے نوع انسانی کو نجات دلانے میں کامیاب ہو۔"

میں نے سٹین کے بارے میں خاصی پوچھ گچھ کی' لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا کہ یہ شخص کون تھا اور ڈاکٹر جیمز کو کہاں ملا؟ بہرحال اس شخص..... سٹین..... کے بارے میں کچھ زیادہ تردد کی ضرورت بھی نہ تھی' کیونکہ اس کا تعلق کہانی سے صرف اتنا ہی ہے کہ ڈاکٹر جیمز نے اپنی مہم کی روداد اسے ایک مرتبہ سنائی تھی۔ جہاں تک ڈاکٹر جیمز کے سفر ڈربی شائر اور ایلرٹن فارم کا تعلق ہے' اس کے بارے میں میں تحقیق کرچکا ہوں اور اس تحقیق کی روشنی میں ڈاکٹر جیمز کا بیان درست نظر آتا ہے' اس مختصر سی تمہید کے بعد میں یہ داستان قارئین کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ دراصل ڈاکٹر جیمز کی خودنوشت ڈائری ہے۔ کہیں کہیں عبارت طویل ہے اور کہیں مختصر..... اکثر صفحے ایسے ہیں جہاں ڈاکٹر نے چند سطریں لکھیں اور پھر انہیں ربڑ سے مٹانے کی کوشش کی۔ ان میں سے چند الفاظ میں نے پڑھ لیے' باقی اتنے مدھم اور مٹے ہوئے تھے کہ پڑھے نہیں جاسکے۔ بہرحال اس کا آغاز یوں ہوتا ہے۔

O☆O

۱۷ اپریل

جب سے میں اس پرفضا مقام پر آیا ہوں' طبیعت میں انبساط اور آسودگی محسوس کررہا ہوں۔ ہوا میں تازگی اور سوندھا پن ہے۔ شاید اس لیے کہ ایلرٹن فارم سمندر کی

سطح سے چودہ سو فٹ بلند ہے۔ صبح کے وقت ہلکی کھانسی کا دورہ اٹھنے کی شکایت ہوجاتی ہے۔ امید ہے چند روز تک یہ شکایت بھی دور ہوجائے گی۔ تازہ دودھ اور عمدہ لذیذ گوشت باافراط ملتا ہے' خوب کھاتا ہوں اور ہضم بھی کرلیتا ہوں۔ خیال ہے کہ میرا وزن بھی بڑھ رہا ہے۔

ایلرٹن نام کی دو بہنیں ہیں..... غالباً جڑواں بہنیں۔ یہ فارم انہی کی ملکیت ہے جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آہستہ آہستہ بڑھاپے کی طرف قدم بڑھا رہی ہیں' لیکن صحت بہت اچھی ہے۔ نہایت خوش اخلاق اور مہربان عورتیں ہیں۔ میرے آرام کا بڑا خیال رکھتی ہیں۔ پروفیسر سنڈرسن نے مجھے صحیح جگہ اور صحیح لوگوں میں بھیجا ہے۔ اس کا یہ احسان میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا۔

ایلرٹن فارم دیہی آبادی سے الگ تھلگ ایک حسین سرسبز وادی کے سرے پر واقع ہے اور ان لوگوں کے لیے سیر و تفریح کی بہترین جگہ جو تنہائی پسند ہیں۔ چراگاہ میں اردگرد کے کسانوں کی بھیڑ بکریاں گھاس چرتی اور کلیلیں کرتی پھرتی ہیں۔ وادی کے چاروں طرف چونے کی بے شمار چھوٹی بڑی پہاڑیاں ہیں اور اتنی نرم کہ انہیں توڑنے کے لیے کسی اوزار کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہاتھ لگاؤ تو چونا جھڑنے لگتا ہے۔ میرا خیال ہے یہاں لاکھوں برس پیشتر کبھی سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا' پھر سمندر غائب ہوگیا اور چونے کی چٹانیں اور ان کے اندر میلوں لمبے چوڑے تاریک غار وجود میں آئے۔ اب بھی کہیں کہیں ندیاں بہتی ہیں اور چٹانوں کے اندر سے پانی کثرت سے رستا رہتا ہے۔ مجھے ان غاروں کے اندر جانے کا بڑا شوق ہے۔ کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں زمین کے سینے میں اتر رہا ہوں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی اور ہولناک سناٹا جیسے غار کی چھت سے رستے ہوئے پانی کی ٹپ ٹپ کبھی کبھار توڑ دیتی ہے۔ میرے پاس اتفاق سے ایک چھوٹا سا لیمپ ہے۔ میں جب صبح و شام کو ٹہلنے نکلتا ہوں' تو کسی نہ کسی غار کی طرف ضرور جاتا ہوں۔ تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی برقی لیمپ کی کرنیں جب غار میں پھیلتی ہیں' تو عجیب دلفریب اور سرور انگیز منظر سامنے آتا ہے جیسے کالی اور سفید پریاں آنکھ مچولی کھیل رہی ہوں۔ غار کی بلند چھت پر کاربونیٹ آف لائم کا تہ نشین مادہ ان گنت قلموں کی شکل میں لٹکا نظر آتا ہے۔ یہ مادہ پانی کے رسنے سے بنتا ہے اور جب اس پر روشنی پڑتی ہے' تو یوں لگتا ہے جیسے مہتابیاں سی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوٹ رہی ہوں' لیکن لیمپ بند کرتے ہی تاریکی..... بے پناہ تاریکی کا دیو مجھے نگل لیتا ہے۔ حتیٰ کہ میں اپنے ہاتھ کی انگلیاں تک دیکھنے سے معذور ہوتا ہوں۔

۲۰ اپریل

ان بے شمار قدرتی غاروں میں سے ایک غار ایسا ہے جس سے میری دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ غالباً یہ اس علاقے کا سب سے بڑا اور سب سے گہرا غار ہے' لیکن قدرتی نہیں' بلکہ انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا..... اس غار کا نام یہاں کے لوگوں نے بلیو جان رکھ دیا ہے' نہ معلوم اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق یہاں زمانہ قدیم میں رومنوں نے سنگ مرمر نکالنے کے لیے اس غار کو کان کی شکل دے دی تھی۔ غار کے منہ پر بنی ہوئی رومن طرز کی محراب بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں سے یہ قیمتی سفید پتھر نکالا جاتا رہا ہے۔ اس غار یا سرنگ میں اترنے کے لیے راستہ بھی بنا ہوا ہے۔ دہانے پر خود رو پودے' گھاس اور جھاڑیاں کثرت سے اُگی نظر آتی ہیں۔ میں نے آج اس کا قریب سے معائنہ کیا۔ اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جب اس غار کے اندرونی حصوں میں لیمپ کی روشنی پھینکتا ہوں' تو اس کی دیواریں ارغوانی رنگ کی نظر آتی ہیں۔ میرا لیمپ زیادہ دن تک کام نہیں دے گا۔ سوچ رہا ہوں موم بتیوں کا ذخیرہ جیب میں رکھا کروں۔ ان کے بغیر ان غاروں اور خصوصاً بلیو جان غار کی سیر ممکن نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ایک دفعہ ان کی تاریکیوں میں گم ہوجانے کے بعد کوئی شخص زندہ سلامت اس دنیا میں نہیں آسکتا' اس لیے موم بتیوں کا ساتھ لے جانا بے حد ضروری ہے۔

۲۱ اپریل

آج میں پھر بلیو جان کے ہیبت ناک دہانے پر پہنچا اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ ایک نوجوان جس کا نام آرمی ٹیج ہے' گھومتا گھامتا ادھر آ نکلا۔ مجھے وہاں پاکر اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار نمودار ہوئے' کہنے لگا:

"ڈاکٹر جیمز..... پناہ بخدا! آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا ادھر آتے ہوئے؟"

"ڈر؟" میں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ڈر' آخر کس بات کا؟"

اس نے اپنے انگوٹھے سے غار کی جانب اشارہ کیا:

"یہ بڑی خطرناک جگہ ہے ڈاکٹر۔ اس غار کے اندر ایک بہت بڑی بلا رہتی ہے۔"

یہ سن کر میں اپنی ہنسی روک نہ سکا۔ مجھے علم تھا کہ یہ نوجوان پڑھا لکھا ہے اور اس سے اس توہم کی توقع نہ تھی' چنانچہ میں نے کہا: "کیا تم بھی ایسی باتوں پر اعتقاد رکھتے ہو؟"

"ہاں ڈاکٹر۔" نوجوان نے سنجیدگی سے کہا۔ "چونکہ آپ کو یہاں آئے ہوئے ایک دو روز ہی ہوئے ہیں' اس لیے آپ پورے حالات و واقعات سے آگاہ نہیں' لیکن ساری تفصیل سننے کے بعد آپ کو بھی میرا ہم خیال بننا پڑے گا۔"

نوجوان کے بیان کے مطابق قصہ یہ تھا کہ وادی میں گھاس چرنے والی بھیڑیں اور بکریاں وقتاً فوقتاً گم ہو جاتی ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان بھیڑ بکریوں کو کون پکڑ کر لے جاتا ہے۔ اس علاقے میں نہ بھیڑیے ہیں اور نہ کوئی اور وحشی جانور کہ خیال ہو وہ حرکتیں کرتے ہیں۔ اب رہا کسی چور کا معاملہ' تو وہ بھی ممکن نہیں' کیونکہ یہاں گنتی کے لوگ آباد ہیں اور باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص زیادہ عرصے تک اپنے آپ کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا۔ پھر سوال یہ بھی ہے کہ کسی شخص کو بھیڑ بکریاں اٹھالے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے' جبکہ گوشت بے حد سستا مل جاتا ہے۔

صرف ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اس غار کے نزدیک ایک جگہ بہت سا تازہ خون اور بھیڑ کے بال بکھرے ہوئے دیکھے گئے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بھیڑ بکریاں ہمیشہ تاریک راتوں میں غائب ہوتی ہیں۔ ایسی راتیں جبکہ آسمان پر سیاہ بادل بھی جمع ہورہے ہوں اور بجلی کوند رہی ہو۔ چاندنی راتوں میں کبھی کوئی بھیڑ گم نہیں ہوئی۔

"بہرحال..... جناب آپ مانیں یا نہ مانیں' یہ کام کسی انسان کا ہرگز نہیں۔" آرمی ٹیج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "میں نے خود ان کانوں سے اس بلا کی آواز سنی ہے اور اگر آپ روزانہ یہاں آتے رہے' تو ایک نہ ایک دن یہ آواز آپ کے کان بھی سن لیں گے۔ تب آپ کو میری باتوں پر یقین آئے گا۔"

میرے پاس ان باتوں کے جواب میں معنی خیز مسکراہٹ کے سوا کچھ نہ تھا۔ بھیڑوں کا اندھیری اور ابر آلود راتوں میں گم ہوجانا ایسی تحیر خیز بات نہیں۔ یہ کام یقیناً کسی ماہر اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوشیار شخص کا ہے جو ایلرٹن فارم میں رہنے والوں کی توہم پرستی اور دقیانوسی خیالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہے۔ اب رہا اس "بلا" کی آواز سننے کا معاملہ..... تو یہ بھی ایسا پراسرار نہیں۔ اس غار کی گہرائی میں چونا بڑی مقدار میں موجود ہے اور اس میں جب پانی شامل ہوجاتا ہے تو اس چونے کے ابلنے سے گونج دار آواز پیدا ہوتی ہے' اسے یہ سادہ لوح نوجوان بلا کی آواز سمجھ رہا ہے۔

۲۲ اپریل

میں نے ایلرٹن فارم کے کئی اور لوگوں سے بھی وہی داستان سنی ہے جو آرمی میج سنا چکا ہے۔ سبھی لوگ بلیو جان غار کی اس نادیدہ بلا کے تصور میں ڈرے سہمے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ لیکن کیا؟ یہ تو اسی وقت پتہ چل سکے گا جب میں غار کا معائنہ کروں گا۔ اگرچہ یہ کام ہے بے حد مشکل اور خطرناک' تاہم میں مصمم ارادہ کرچکا ہوں کہ اس غار کے اندر جاؤں گا ضرور۔

۲۳ اپریل

آج میں پھر وہاں گیا تھا اور دیر تک غار کے دہانے کے نزدیک کھڑا رہا۔ عجب وحشت انگیز مقام ہے۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعی اس کے اندر کوئی نہ کوئی موجود ہے اور ابھی دہانے پر اگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس میں سے برآمد ہوجائے گا' مگر..... سوال تو یہ ہے کہ اگر کوئی بلا اس میں چھپی ہوئی ہے اور وہ باہر نکلتی ہے' تو اس کے "پیروں" کے نشان تو ضرور نرم زمین پر نظر آتے..... لیکن ایسا کوئی نشان اب تک ایلرٹن فارم والوں کو دکھائی دیا ہے اور نہ میں نے دیکھا ہے۔ ابھی میں اسی سوچ بچار میں کھویا ہوا تھا کہ دفعتاً ایک عجیب آواز غار کی گہرائیوں میں سے اٹھی۔ دہشت سے میرے بدن کا رواں رواں تھرا گیا۔ ابتدا میں یہ آواز ہلکی تھی' لیکن رفتہ رفتہ بلند اور تیز ہوتی گئی۔ یوں سمجھیے جیسے سینکڑوں ہزاروں گھوڑے ہنہنا رہے ہوں یا..... ہاتھی چنگھاڑ رہے ہوں۔ پھر یک لخت خاموشی چھا گئی۔ اعصاب شکن خاموشی..... اب آرمی میج کی باتیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں..... غار میں سے آنے والی آواز جو نہ جانے کتنی گہرائی میں سے آرہی تھی' یقیناً چونا ابلنے کی نہ تھی..... یا مجھے دھوکا ہوا ہے..... میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا..... میں پاگل تو نہیں ہوگیا..... میں نے غار میں جانے اور اچھی طرح دیکھ

بھال کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ فی الحال میں اس پروگرام سے ایلرٹن فارم کے لوگوں کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا' ورنہ وہ مجھے کبھی ایسا نہ کرنے دیں گے' اس لیے مجھے چپ چاپ اور انتہائی رازداری سے کام لینا چاہیے۔ میں اس راز کو بے نقاب کرکے رہوں گا کہ غار میں کون ہے اور یہ آواز کہاں سے آتی ہے۔

۲۶ اپریل

تین دن گزر گئے ہیں اور میں ہر روز غار کے اندر جاکر واپس آجاتا ہوں۔ دو دن برقی لیمپ نے کام دیا' لیکن غار کی تاریکی لیمپ کی روشنی پر حاوی ہوجاتی ہے اور جوں جوں میں آگے بڑھتا جاتا ہوں' لیمپ کی روشنی خود بخود مدھم ہونے لگتی ہے۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو..... مگر جہاں تک میرے امکان میں ہے' میں اس غار کے اسرار کا سراغ لگانے کی برابر کوشش کروں گا۔ میں نے اس دن کے بعد سے اب تک وہ بھیانک آواز دوبارہ نہیں سنی اور اب مجھے کچھ یہ احساس ہورہا ہے کہ میں فریب گوش و ہوش کا شکار ہورہا ہوں' لیکن نہیں..... نہیں..... یہ سب آرمی میج کی بے ہودہ اور بے سروپا باتوں کا اثر ہے۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوں' میرے حواس صحیح کام کررہے ہیں..... تاہم ایک بات مجھے پریشان کیے ہوئے ہے' اور وہ یہ کہ میں نے پہلے پہل جب غار کے دہانے پر اگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس کو دیکھا تھا' تو وہاں کوئی ایسی علامت دکھائی نہ دی تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ کوئی بڑی جسامت کا جانور غار میں داخل ہوا ہے۔ گھاس اور جھاڑیاں روندی ہوتیں' لیکن..... اب..... اب میں اسے دیکھتا ہوں' تو صریحاً معلوم ہوتا ہے کہ کوئی عظیم قدوقامت رکھنے والی مخلوق حال ہی میں ان جھاڑیوں کو روندتی ہوئی غار کی طرف گئی ہے..... کیا یہ بھی فریب نظر ہے..... ہرگز نہیں..... میں آج اپنے ساتھ موم بتیاں اور ماچس کی ایک ڈبیا لے گیا تھا تاکہ زیادہ تیز روشنی میں دور تک جاسکوں۔ میں معمول کے مطابق (کسی خوف کے بغیر) غار کے اندر اندازاً دو فرلانگ دور تک چلا گیا۔ راستے بے حد پیچیدہ اور پراسرار ہیں..... یا مجھے ہی ایسے نظر آتے ہیں۔ غار کی چھت اتنی اونچی ہے کہ روشنی کے باوجود نظر نہیں آتی۔ عجیب سی بدبو پھیلی ہوئی ہے میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے پاس روشنی کا انتظام نہ ہو اور مجھے اندھیرے ہی میں باہر آنے کی ضرورت پڑے' تو میں قیامت تک باہر نہ نکل سکوں گا۔ یہ راستے نہیں' بھول بھلیاں ہیں۔ سینکڑوں بھول بھلیاں..... کہیں کہیں غار کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمین نرم اور گیلی گیلی سی ہے۔ دیواروں پر چونا جما ہوا ہے اور روشنی میں چمکنے لگتا ہے۔ میں زیادہ دیر تک غار کی گندی ہوا میں رہوں، تو سانس پھولنے لگتا ہے۔ تپ دق کا مریض ہوں نا...... میرے پھیپھڑوں کو تازہ ہوا چاہیے...... تاہم میں اپنے اندر پہلے سے زیادہ توانائی پاتا ہوں...... خدا نے چاہا، تو چند روز بعد غار کے اندر مزید گہرائی میں جا سکوں گا۔

میں سوچتا ہوں اس موقع پر کوئی اور شخص اس مہم میں میرا ساتھ دینے کے لیے موجود ہوتا، تو بڑی آسانی رہتی۔ اگرچہ ایلرٹن فارم میں بھی نڈر آدمیوں کی کمی نہیں، تاہم اس سلسلے میں میں ان لوگوں سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے سب کام اکیلے ہی کرنا ہوگا۔ آج رات میں مکمل آرام کروں گا اور اپنے ذہن کو بھی بھٹکنے سے بچاؤں گا تاکہ صبح سویرے غار کے اندر اور زیادہ دور تک جانے کے قابل ہو سکوں۔

۲۸ اپریل

کل کا دن میری زندگی کا ناقابل فراموش دن تھا۔ مجھے ایک ہولناک تجربے سے گزرنا پڑا ہے۔ حیران ہوں کہ ان بعید از فہم و عقل واقعات کو کس طرح بیان کروں کہ ان کی صحیح صحیح تصویر کشی ہو سکے۔ علی الصبح ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے موم بتیاں اور ماچس کی ڈبیا جیب میں رکھی اور غار کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی شخص کو میری ان سرگرمیوں کا علم ہو، اس لیے نہایت احتیاط سے چھپتے چھپاتے وہاں پہنچا۔ گھاس اور جھاڑیاں اسی طرح روندی اور کھلی ہوئی نظر آئیں، چند بڑے پتھر بھی اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے تھے۔ ضرور کوئی غار میں داخل ہوا ہے، لیکن پیروں کے نشان (بشرطیکہ اس کے پاؤں ہوں) دکھائی نہ دیے۔ اس روز میں اندازے کے مطابق گزشتہ دنوں کی نسبت تقریباً پچاس فٹ اور آگے نکل گیا۔ یہاں غار کی زمین پتھروں سے اٹی پڑی تھی اور جابجا محرابیں نظر آتی تھیں جو رومن معماروں کے فن تعمیر کی رہین منت تھیں۔ اب میں نے اپنے آپ کو ایسے مقام پر پایا جہاں دیواریں چونے کی نہیں، کسی اور سخت مادے کی تھیں۔ ان دیواروں پر معماروں کے تیشوں اور دوسرے اوزاروں کی ضربوں کے نشان ابھی تک یوں موجود تھے جیسے ابھی ابھی لگائے گئے ہوں۔ موم بتی کا شعلہ کانپ رہا تھا اور اردگرد پھیلے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کے سائے بھی کانپ کانپ کر مجھے بدحواس کر رہے تھے، لیکن میں رکے بغیر آگے بڑھتا گیا۔ ایک تنگ سرنگ سے ہو کر میں وسیع و عریض ہال

میں داخل ہوا جو رومن تعمیر کا شاندار نمونہ تھا اور یہاں سے بے شمار سرنگ نما راستے دائیں بائیں اور آگے پیچھے نکلتے تھے۔ پھر میں نے پانی گرنے کی آواز سنی۔ غالباً یہاں کوئی چشمہ بھی تھا۔ چند لمحوں کے لیے میں رک گیا اور پانی گرنے کی آواز بغور سننے لگا۔ کدھر سے آ رہی ہے یہ آواز؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ غالباً سامنے سے...... ہاں، اسی طرف سے...... میں اور آگے بڑھا اور پھر میرے پاؤں جیسے کیچڑ میں بھر گئے۔ میں نے موم بتی نیچے کی اور جھک کر دیکھنے لگا...... آہ! ایک ایسی چیز نظروں کے سامنے تھی جس نے مجھے پتھر کا بت بنا دیا۔

یہ گیلی مٹی میں بنا ہوا ایک عجیب و غریب نشان تھا۔ غار کی چھت پر سے پانی کے قطرے رس رس کر عین اسی جگہ گر رہے تھے اور یہاں کی زمین پانی سے تر ہو چکی تھی...... سرسری نظر میں یوں لگا جیسے کوئی بڑا پتھر اوپر سے گرا اور اس کے گرنے سے یہ نشان بنا ہے، لیکن اس ہال میں آس پاس تو کیا، دور تک بھی ایسا کوئی بڑا پتھر نہ تھا، پھر یہ نشان، جو خاصا گہرا اور کسی قدر چوکور اور کچھ کٹا پھٹا سا تھا، یہاں کیونکر بن گیا؟ اگر یہ کسی جانور کا پاؤں ہے، تو دنیا میں اتنا بڑا جانور کونسا ہے جس کے پاؤں کا نشان کم از کم ڈیڑھ فٹ چوڑا اور آٹھ انچ لمبا ہو اور پھر ایک ہی پاؤں والا جانور؟ دوسرے پاؤں کا نشان بھی ہونا چاہیے۔ ممکن ہے دوسرا نشان خاصے فاصلے پر ہو، یہ سوچ کر میں اور آگے بڑھا، لیکن دور تک دیکھنے بھالنے کے باوجود دوسرا نشان نہ مل سکا۔ اب دہشت سے میرا کلیجہ اندر ہی اندر بیٹھنے لگا اور میں نے واپس جانے کا ارادہ کر لیا، مگر روشنی کے باوجود راستہ بھول کر ایک اور سرنگ میں جا نکلا اور اس سے پیشتر کہ میں سنبھل سکوں، ٹھوکر کھائی اور پھر اپنے آپ کو یخ بستہ پانی کے اندر غوطے کھاتے پایا۔ میرے گرتے ہی گھپ اندھیرا چھا گیا۔ یہ نہر...... میں اسے نہر ہی کہوں گا، اندازاً بیس فٹ چوڑی تھی، میں نے ہاتھ پیر مارے اور کنارے پر پہنچ کر باہر نکلا۔ سردی سے میرا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے ستارے سے ناچ رہے تھے۔ میں غار میں اتنی دور نکل آیا تھا کہ اب روشنی کے بغیر باہر جانا ممکن نہ تھا اور پھر اس ایک پاؤں والی نادیدہ بلا کا خوف بھی مجھ پر مسلط تھا جس کے "قدم" کا نشان میں دیکھ چکا تھا۔

میرے ہر طرف ہیبت ناک سناٹا تھا جو گھپ اندھیرے کے ساتھ مل کر ایسا ماحول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیش کررہا تھا کہ بیان سے باہر۔ میری حالت اس چوہے کی سی تھی جسے راہ فرار نہ مل رہی ہو اور وہ کوئی دم میں بلی کے خونخوار جبڑوں کا شکار ہونے والا ہو۔ موم بتی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر پانی میں گم ہوچکی تھی' لیکن ابھی میری جیب میں دو موم بتیاں اور تھیں۔ میں نے ماچس کی ڈبیا جیب سے نکالی..... مگر بے سود..... سب تیلیاں پانی میں بھیگ چکی تھیں اور انہیں سوکھنے کے لیے کئی گھنٹے درکار تھے۔ نہ جانے میں کتنی دیر وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ کیا کروں' کہاں جاؤں۔ میرا ذہن اس حالت میں بھی کام کررہا تھا۔ اب میں تصور ہی تصور میں غار کے راستے کا نقشہ تیار کرنے لگا۔ کوشش کروں' تو شاید دہانے تک پہنچ جاؤں...... یہ خیال آتے ہی میں دیواروں اور پتھروں کو اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا ایک طرف کو چلنے لگا۔

لیکن بہت جلد احساس ہوگیا کہ میں اندھیرے کی اس دبیز چادر کو پھاڑ کر راستہ تلاش کرنے میں ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا اور اب میری قبر اسی غار کے اندر بنے گی۔ میں نے ایک بڑے سے پتھر کے اوپر پناہ لی اور اپنے بچاؤ کی تدبیروں پر غور کرنے لگا' مگر ذہن اس قدر ابتر اور حواس ایسے پراگندہ تھے کہ کوئی راہ سوجھتی نہ تھی۔ مجھے اپنی جذبات آمیز حماقت پر افسوس ہونے لگا۔ کم از کم اپنے کمرے میں اس مضمون کا رقعہ ہی رکھ آتا کہ میں فلاں جگہ جارہا ہوں۔ یہاں مجھے کوئی ڈھونڈنے نہ آئے گا۔ ماچس کی ایک بھیگی ہوئی ڈبیا اور دو موم بتیاں۔ صرف ان حقیر چیزوں کے سہارے کچھ امید بندھی تھی کہ میری جان شاید بچ جائے اور وہ بھی اس وقت جب ماچس کی تیلیاں خشک ہوکر جلنے کے قابل ہوجائیں۔ اب میں نے ڈبیا کو جیب سے نکال کر اپنی بائیں بغل کے نیچے دبایا تاکہ اس کی گرمی سے تیلیاں خشک ہوں۔ میری قمیض کی اندرونی جیب میں اتفاق سے چند بسکٹ نکل آئے جو میں نے صبح ناشتہ کرتے ہوئے غیرارادی طورپر جیب میں ڈال لیے تھے۔ اگرچہ ان بسکٹوں نے بھی پانی کا اثر قبول کرلیا تھا' مگر یہ کھانے کے قابل ضرور تھے' چنانچہ ان سے کسی قدر بھوک مٹائی۔ اس کے بعد میں نے اپنے سونے کے لیے ایک مناسب سی جگہ ٹٹول ٹٹول کر تلاش کی۔ یہ دو بڑے پتھروں کی درمیانی جگہ تھی۔ میں نے ہاتھ پیر سکیڑ دیے اور گٹھڑی سا بن کر لیٹ رہا۔

کہہ نہیں سکتا کتنی دیر سویا ہوں گا۔ شاید پندرہ منٹ' ایک گھنٹہ یا کچھ زائد.....

کیونکہ اس یکساں اندھیرے میں وقت کا صحیح احساس کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے میں کئی گھنٹے سویا ہوں' کیونکہ میرے کپڑے اب گیلے نہ تھے اور سردی بھی کسی حد تک کم محسوس کررہا تھا۔ دفعتاً میرا دل زور سے دھڑکا اور سارے جسم کا خون یک لخت گرم ہوکر دماغ کی طرف چڑھنے لگا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے کان اس پراسرار اور وحشت انگیز آواز کی طرف لگا دیے جو غار میں کسی جگہ گونج رہی تھی۔ کیا کچھ لوگ میری تلاش میں آنکلے ہیں اور مجھے پکار رہے ہیں؟...... نہیں...... یہ آواز آدمیوں کی نہیں ہوسکتی..... پھر مجھے اس نادیدہ بلا کا خیال آیا جس کی آواز میں چند روز قبل غار کے دہانے پر سن چکا تھا..... اف!..... خدایا..... یہ تو وہی ہے..... بالکل وہی..... اگرچہ وہ خاصے فاصلے پر تھی' لیکن میں نے محسوس کیا کہ لحہ بہ لحہ قریب آتی جارہی ہے..... کسی بڑے گھوڑے کے ہنہنانے یا گدھے کے ہینگنے کی آوازوں کے مشابہہ..... لیکن انتہائی ڈراؤنی اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی..... یہ ضرور کسی زندہ مخلوق کے حلق سے نکل رہی ہے.....

پھر میرا بدن سرد پڑنے لگا..... اور سر کے بال کانٹوں کی مانند سیدھے کھڑے ہوگئے..... میں نے اپنی پیشانی' چہرے اور ہتھیلیوں کو پسینے میں شرابور پایا..... کیونکہ اب میرے کانوں تک اس کے بولنے کی آواز کے ساتھ ساتھ اس کے قدموں کی دھمک بھی پہنچ رہی تھی۔ عظیم اور وزنی پیروں کی دھمک جس سے زمین میں ہلکا ہلکا ارتعاش پیدا ہورہا تھا۔ آہ!...... یہ بلا اسی جانب بڑھی آرہی تھی جدھر میں چھپا ہوا تھا..... لیکن...... کیا وہ اندھیرے میں دیکھنے کی قدرت رکھتی ہے؟..... ہاں..... یہی بات ہے..... قدموں کی چاپ یا دھمک اور نزدیک آگئی۔ شاید میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ پچاس ساٹھ فٹ سے زائد نہ ہوگا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس سمت میں دیکھنے کی کوشش کی' مگر بے سود۔ بے ہنگم اور لرزہ خیز آوازیں سنائی دینے کے سوا جو غار کی بلند چھت سے ٹکرا کر واپس آتی تھیں' مجھے کوئی ہیولا یا جسم دکھائی نہ دیا۔

معاً یہ ہوش ربا آوازیں رک گئیں اور ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا' اعصاب پر چھا جانے والا سکوت' لیکن میں اس سکوت میں بھی اپنے دل کی دھڑکن بخوبی سن سکتا تھا۔ کیا آنے والی بلا نے میری بو پالی ہے؟ کیونکہ خود میرے نتھنوں میں ایک عجیب قسم کی ناگوار بدبو گھسی آرہی تھی جو یقیناً اس کے جسم سے خارج ہورہی تھی۔ اس کا مطلب یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ یہ بلا کوئی مافوق الفطرت شے نہیں' بلکہ اسی دنیا کی جیتی جاگتی مخلوق ہے جو نہ صرف مادی جسم رکھتی ہے' بلکہ اس کے جسم سے بدبو بھی اٹھ سکتی ہے۔

اچانک قدموں کی دھمک شروع ہوگئی' پھر چند پتھروں کے اِدھر اُدھر اچھلنے اور گرنے کی آوازیں گونجیں۔ اس کے بعد میں نے سنا کہ پانی میں ہلچل سی ہوئی اور ایسی آواز آئی جیسے وہ مخلوق نہر کو عبور کرکے دوسری جانب چلی گئی ہے۔ پھر مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ میرے اعصاب اس سے زیادہ اذیت برداشت نہیں کرسکتے تھے اور نہ مجھ میں حرکت کرنے کی جرأت تھی۔ اگرچہ میں اس بلا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں پایا تھا' تاہم اس بات کا پورا یقین ہوچکا تھا کہ یہ کوئی خونخوار درندہ ہے اور آرمی میج کی بیان کردہ کہانی لفظ بہ لفظ درست ہے۔ جب مجھے ہوش آیا' تو غار میں وہی سکوت اور اندھیرا چھایا ہوا تھا جس پر وقت بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ میں نے اپنی بغل میں دبی ہوئی ماچس کی ڈبیا نکالی اور ایک تیلی رگڑ کر روشن کرنے کی کوشش کی۔ چند ثانیے بعد تیلی جل اٹھی۔ میں نے جلدی سے موم بتی جلائی اور اپنے اردگرد دیکھا... پھر میں لڑکھڑاتے قدموں سے راستہ دیکھتا ہوا دہانے کی طرف چلا اور آدھ گھنٹے بعد جب میں نے اپنے آپ کو غار سے باہر کھلے اور تارے ٹکے ہوئے آسمان کے نیچے پایا' تو جان میں جان آئی۔ اس دوران میں اس راستے سے بھی گزرا جہاں پہلے وہ نشان گیلی زمین میں دیکھا تھا۔ اب وہاں ایک کے بجائے کئی نشان نظر آئے جو پہلے نشان سے کچھ مختلف نہ تھے اور ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ غار کی یہ مخلوق کسی ایسے عظیم اور وزنی جانور کے قدموں سے مشابہت رکھتی ہے جو شیر' گینڈے یا ریچھ کی نسل سے ہے' لیکن ایسا کوئی جانور کرۂ ارض پر پایا نہیں جاتا' میں ہانپتا کانپتا ایلرٹن فارم پہنچا اور اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گرگیا۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ دلچسپ بات یہ کہ دوسرے لوگ مزے سے سو رہے تھے اور کسی کو میرے بارے میں خبر نہ تھی کہ میں سارا دن اور ساری رات کہاں غائب رہا۔

تھکن کے باعث میرا جسم چور چور تھا' لیکن دہشت اتنی تھی کہ نیند نہ آئی۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ غار کی اس خطرناک بلا کے بارے میں کسی سمجھدار اور بہادر شخص کو آگاہ کروں' ورنہ یہ بھیڑ بکریوں کا صفایا کرنے کے بعد انسانوں کو ہڑپ کرنے پر اتر آئے گی اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ اس غار کی اتھاہ اور اندھیری گہرائیوں میں ایسی بہت سی بلائیں

پل رہی ہوں۔

۲ مئی

گزشتہ دو روز سے سخت بخار اور ہذیانی کیفیت میں مبتلا رہنے کے بعد ڈائری لکھنے کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کسی شخص کو اپنا رازدار بناؤں تاکہ وہ صحیح مشورہ دے سکے اور میری دماغی صحت پر شبہہ نہ کرے۔ پروفیسر سنڈرسن نے ایک مرتبہ کسی ماہر ڈاکٹر مارک جانسن کا ذکر کیا تھا جو یہیں ڈربی شائر میں ایلرٹن فارم سے چند میل دور اپنا ہسپتال کھولے ہوئے ہے۔ آج دوپہر میں اس کے پاس گیا تھا۔ اس نے نہایت توجہ اور غور سے میرا معائنہ کیا' ساری کہانی سنی اور سنجیدگی کے آثار چہرے پر لیے گردن ہلاتا رہا۔ پھر اس نے مجھے ایک رقعہ لکھ کر دیا اور زبانی بھی کہا کہ کیسلٹن میں ڈاکٹر پکٹن سے ملوں' وہ اس سلسلے میں میری صحیح مدد کرسکے گا' چنانچہ میں ڈاکٹر پکٹن کی تلاش میں کیسلٹن گیا۔ اس قصبے کے نواح میں ایک عالی شان عمارت کے صدر دروازے پر ڈاکٹر پکٹن کے نام کا بہت بڑا بورڈ لگا دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ آدمی نامور ہے اور ضرور کچھ کرے گا۔ میں اس سے ملنے کے لیے عمارت کے اندر جانے ہی والا تھا کہ ایک خیال کے زیر اثر رک گیا اور قریب سے گزرنے والے ایک شخص سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیسا آدمی ہے۔ اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا' پھر مسکرا کر بولا: "ڈاکٹر پکٹن دماغی امراض کا علاج کرنے میں ماہر ہے۔ یہیں اس نے پاگل خانہ کھول رکھا ہے۔"

یہ سن کر میں چکرایا اور پھر مجھے ڈاکٹر مارک جانسن پر سخت طیش آیا۔ کم بخت نے مجھے شاید سودائی سمجھ کر یہاں بھیج دیا۔ لعنت ہے اس پر..... میں ڈاکٹر پکٹن سے ملے بغیر ایلرٹن فارم آگیا۔ مجھے اکیلے ہی اس بلا سے نمٹنا ہوگا۔ کاش! میں بیمار نہ ہوتا' تب کوئی پروا نہ تھی۔ جس زمانے میں میرا قیام کولبرج میں تھا' وہاں ایک مکان کے بارے میں مشہور ہوا کہ اس میں آسیب ہے اور کوئی شخص وہاں جانے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا' لیکن میں دو راتیں اس مکان میں رہا۔ بلاشبہ وہاں کچھ تھا ضرور' لیکن مجھے کوئی ضرر نہ پہنچا سکا۔ اس بیماری میں بھی جبکہ اعصاب کمزور ہوچکے ہیں' میں اس بلا سے دو بدو ہاتھ کرلینے کی ہمت رکھتا ہوں۔

۵ مئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ابھی تک اپنے آپ کو اس کشمکش سے آزاد نہیں کر سکا کہ مجھے ایلرٹن فارم کے لوگوں کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرنا چاہیے یا نہیں۔ فرض کرو اس مہم میں' میں مارا جاتا ہوں' تب کیا ہوگا؟ یہاں کے لوگوں کو پھر کون بتائے گا کہ میرا کیا حشر ہوا اور ان پر کیسی آفت ٹوٹنے والی ہے؟ اور اگر میں انہیں بتا دیتا ہوں' تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟ وہی جو ڈاکٹر جانسن نے سوچا ہوگا' یعنی پاگل سمجھ کر ڈاکٹر پکٹن کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ مجھے اپنے شفا خانے میں داخل کرلے۔ پھر یہ بھی تو ممکن ہے کہ میری داستان سن کر لوگ خوف و ہراس کے مارے یہاں سے بھاگ جائیں اور یہ بستی ویران ہو جائے' بہرحال میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے چند ضروری چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آج میں اسی مقصد کے لیے دوبارہ کیسلٹن گیا۔ ایک بڑی اور عمدہ گیس لالٹین خریدی جس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ دس فٹ کے فاصلے پر پڑی ہوئی سوئی بھی صاف نظر آجاتی۔ اس کے علاوہ میں نے نہایت طاقتور دو نالی رائفل اور ایسے کارتوس خریدے جو قوی ہیکل ہاتھی اور دریائی گھوڑے کو ختم کرنے کے لیے کافی تھے۔ یہ چیزیں لے کر جب میں اپنی قیام گاہ پر آیا' تو بڑی مس ایلرٹن نے حیرت سے کہا کہ میں اس رائفل سے کس کو مارنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا: ایک ایسے موذی کو جو ہم سب کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ کہنے لگی:

"آہ! میں سمجھی تم نے شاید اس چور کا پتہ لگا لیا ہے جو اندھیری راتوں میں ہماری بھیڑ بکریاں پکڑ کر لے جاتا ہے۔"

"ہاں' یہی بات ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر..... تمہیں پولیس کو اطلاع دینی چاہیے۔ کیا یہ جرم نہ ہوگا کہ تم قانون کو اپنے ہاتھ میں لو؟"

"بہت اچھا' میں ابھی پولیس اسٹیشن جاتا ہوں۔"

مجھے یقین نہیں تھا کہ پولیس انسپکٹر میری بات غور سے سنے گا' لیکن خلاف توقع وہ سنبھل کر بیٹھ گیا اور نہایت توجہ اور غور سے ساری کہانی سننے کے بعد اپنے بڑے سے رجسٹر میں اسے درج کرلیا پھر کہا۔

"آپ جائیے' ہم اس بلا کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔"

میں شکریہ ادا کرکے وہاں سے اٹھا۔ اب میرے دل پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا' لیکن دوسرے ہی لمحے اسی پولیس انسپکٹر کے فلک شگاف قہقہے کی آواز میرے کان میں آئی۔ وہ ماتحت سپاہیوں کو ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا کہ ابھی ایک خبطی یہاں آیا تھا اور اپنی احمقانہ باتوں سے مجھے محظوظ کرکے گیا ہے۔ آدمی دلچسپ ہے' پھر کبھی آئے تو اس سے تفریح رہے گی' اسے تو پاگل خانے میں ہونا چاہیے تھا۔

۹ مئی

موسم روز بروز بدل رہا ہے اور موسم کے ساتھ ساتھ اندوہناک واقعات بھی پیش آرہے ہیں۔ راتیں انتہائی تاریک ہیں اور آسمان بادلوں میں چھپا رہتا ہے۔ گزشتہ تین راتوں میں چار بکریاں گم ہو چکی ہیں۔ دو مس ایلرٹن کی' ایک بڈھے پرسن کی اور ایک مسز مولٹن کی۔ اس صورت حال سے ایلرٹن فارم کے علاوہ گردونواح کی بستیوں میں بے حد خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ لوگ اس چور کو پکڑنے کے لیے بے تاب ہیں جو ہمیشہ اندھیری راتوں میں بکریاں اٹھا کر لے جاتا ہے اور اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتا۔

اس دوران میں ایک اور بات ایسی ہوئی ہے جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور وہ یہ کہ نوجوان آرمی ٹیج اپنے گھر سے غائب ہے۔ اسے بدھ کی رات کو اپنے گھر سے نکلتے دیکھا گیا' اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا۔ بعض کا خیال ہے کہ وہی بکریاں چراتا تھا' مگر اکثر لوگوں نے اس کی تردید کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ وہ نہایت شریف اور بلند اخلاق نوجوان تھا اور ایلرٹن فارم میں کبھی اس کی کوئی بری حرکت نہیں دیکھی گئی۔ چونکہ اس کا باپ خاصا روپیہ چھوڑ کر مرا ہے اور آرمی ٹیج کوئی کاروبار کرنے کی فکر میں تھا' اس لیے ممکن ہے وہ لندن یا کہیں اور چلا گیا ہو' مگر میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ کہاں گیا۔ اسے یقیناً غار والی بلا پکڑ کر لے گئی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ معاملہ لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ خطرے کے کتنے دہانے پر کھڑے ہیں۔ پولیس انسپکٹر میرا مذاق اڑاتا ہے اور ڈاکٹر جانسن مجھے پاگل سمجھتا ہے' بہرحال جو کچھ بھی ہو' میں اسے یوں نہیں چھوڑ سکتا۔

۱۱ مئی

گزشتہ رات میں ایک ڈراؤنے تجربے سے دوچار ہوا ہوں۔ یہ رات بھی معمول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے مطابق تاریک تھی اور آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کوئی گیارہ بجے کے لگ بھگ میں اپنے کمرے سے نکلا۔ میرے ہاتھ میں برقی لالٹین اور رائفل تھی۔ جانے سے پہلے میں نے اس مضمون کا ایک رقعہ اپنے کمرے میں میز پر رکھ دیا

"میں بلیو جان غار کی طرف ایک کام سے جارہا ہوں۔ اگر کل شام تک واپس نہ آؤں، تو مہربانی کرکے مجھے وہیں تلاش کیا جائے۔"

ہر طرف ہولناک سناٹا طاری تھا اور دور وادی کے نیچے کسانوں اور چرواہوں کے چھوٹے چھوٹے مکانوں کی کھڑکیوں اور روشن دانوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ غار کے دہانے کے قریب پہنچ کر میں نے لالٹین بجھا دی اور ایک طرف جھاڑیوں میں بیٹھ گیا۔ یک لخت گرجے کے کلاک کے بارہ بجانے کی مدھم آواز میرے کان میں آئی۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا اور غار ایک سربفلک دیو کی مانند اپنا منہ کھولے میرے سامنے تھا۔ ایک بج گیا..... پھر دو بجے۔ اب مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور میں جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔ دفعتاً قریب ہی سے کوئی الو اپنی بھیانک آواز میں چیخا ہو..... ہو..... او..... او..... او یہ آواز دائیں ہاتھ پر واقع چٹانوں میں سے آئی تھی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور رائفل کے ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔ اب ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک اور لیکن وہی لرزہ خیز مانوس آواز سنائی دی..... غار کی بلا بیدار ہورہی تھی اور اس کے ہنہنانے اور دھاڑنے سے زمین ہلنے لگی تھی۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون سرد پڑنے لگا اور پھر بڑے بڑے پتھروں کے اِدھر سے اُدھر لڑھکنے اور گرنے کا مسلسل شور بلند ہوا۔ غار کے منہ پر اُگی ہوئی قد آدم جھاڑیاں ہلنے لگیں اور پھر موٹی موٹی شاخیں کچلنے کی آواز..... میں نے ایک ثانیے کے لیے غار کے دہانے سے نظر ہٹا کر آسمان کی طرف دیکھا، بادلوں کی اوٹ سے ایک روشن اور چمکدار ستارہ یہ پراسرار منظر دیکھنے کے لیے جھانک رہا تھا۔

معاً میری نظریں تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی اس وحشی اور زندہ مخلوق پر پڑیں جو غار کے دہانے پر جھاڑیوں کے عقب میں کھڑی تھی۔ چند لمحوں کے لیے میرا جسم جیسے بیکار ہوگیا۔ میں نے لالٹین کا بٹن دبانے اور پھر رائفل چلانے کی کوشش کی، مگر انگلیوں میں جنبش نہ ہوئی۔ اس بلا کا قد بارہ چودہ فٹ سے زائد تھا اور جسم ایک پہاڑ کی مانند پھیلا ہوا اور مضبوط، لیکن اندھیرے کے باعث میں یہ نہ دیکھ سکا کہ اس کے جسم پر بال ہیں یا

نہیں، تاہم یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ اسی زمین کی مخلوق ہے اور کوئی غیر معمولی ہستی نہیں۔ غار سے باہر نکلتے ہی اس نے فضا میں منہ اٹھا کر کچھ سونگھا اور پھر تیز بدبو میرے نتھنوں میں آن گھسی جس کی وجہ سے میں ہوش میں آگیا۔ بجلی کی مانند لپک کر میں نے برقی لالٹین روشن کی اور رائفل سنبھال لی۔ تیز روشنی اس بلا کے چہرے پر پڑی اور اس نے اس زور سے چیخ ماری کہ اردگرد کی پہاڑیاں لرز گئیں۔ اب میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چار ہاتھ پیر تھے اور وہ اس وقت اپنے پچھلے پیروں کے بل کھڑی تھی۔ جسم پر سیاہ رنگ کے لمبے لمبے اور گھنے بال تھے اور آگے بڑھے ہوئے بازوؤں کے پنجوں میں ایک ایک فٹ لمبے نوکیلے ناخن۔ اس کا منہ انتہائی بھیانک اور ڈراؤنا تھا اور سفید سفید بڑے بڑے دانت منہ سے باہر جھانک رہے تھے، لیکن یہ بلا اندھی تھی۔ بالکل اندھی..... اگرچہ اس کی آنکھوں کے بڑے بڑے اور گول گول سفید ڈیلے باہر کو نکلے ہوئے تھے، لیکن ان کی پتلیاں گردش نہ کرتی تھیں۔ لالٹین کی روشنی پڑتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ اتنے عظیم قدوقامت کا ایک ایسا خوفناک درندہ کہاں سے آیا اور اس غار میں کب سے چھپا ہوا ہے۔

میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیا اور بیک وقت دو فائر کیے مگر ان گولیوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا، بلکہ وہ خوفناک بلا اپنے چاروں ہاتھ پیروں کے بل چیختی اور چنگھاڑتی ہوئی میری طرف دوڑی اور کئی کئی من وزنی پتھروں کو تنکوں کی طرح پرے پھینکتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کے جسم سے اٹھنے والی بدبو ناقابل برداشت تھی۔ میں نے دو فائر اور کیے اور اس مرتبہ گولیاں اس کے بازو میں لگیں۔ وہ رک گئی اور پھر پلٹ کر غار کی طرف بھاگی اور چند لمحوں بعد نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے چیخنے اور گرجنے کی آوازیں دیر تک سنائی دیتی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر میرے پاس اس وقت گیس لالٹین نہ ہوتی، تو یہ خونخوار درندہ جو کسی حد تک ریچھ سے مشابہ تھا، مجھے پکڑ کر ہڑپ کرجاتا۔ یہ سارا واقعہ اس سرعت اور ناقابل یقین تیزی سے پیش آیا کہ مجھے اب تک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر بعد ایلرٹن فارم کی جانب سے لوگوں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بولنے اور پکارنے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دیکھا کہ پچاس ساٹھ افراد ہاتھوں میں لالٹینیں تھامے چلے آرہے ہیں۔ ان کے کانوں تک اس بلا کی چیخیں پہنچ چکی تھیں' مگر کوئی بھی شخص غار کے اندر جانے کو تیار نہ تھا۔ جب میں نے انہیں اس بلا کے حلئے اور قدوقامت کے بارے میں بتایا' تو سب میری طرف یوں دیکھنے لگے جیسے میں دیوانہ ہوں۔

O☆O

یہاں ڈاکٹر جیمز ہارڈ کیسل کی ڈائری اچانک ختم ہوجاتی ہے اور پھر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ تاریک غار کی اس مخلوق کو بعد میں کسی اور نے دیکھا یا نہیں' البتہ تحقیق کے بعد یہ ضرور معلوم ہوا کہ تاریک راتوں میں ایلرٹن فارم سے بھیڑ بکریاں گم ہوتی رہی ہیں اور پولیس سرتوڑ کوشش کے باوجود آرمی میج کا سراغ نہیں پاسکی۔ وہاں کے لوگوں نے ڈاکٹر جیمز کو ذہنی ابتری کا مریض قرار دیا' تاہم انہوں نے اس بات کا اقرار کیا کہ ۱۰ اور ۱۱ مئی کی درمیانی رات کو بلیو جان کی جانب سے ہولناک چیخوں کی آوازیں سنی گئی تھیں۔ ان چیخوں نے سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کردیا اور جب وہ جمع ہوکر وہاں پہنچے' تو انہوں نے ڈاکٹر جیمز کو بے ہوش پڑے پایا۔ اس کے قریب ہی دونالی رائفل اور ایک گیس لالٹین الٹی پڑی تھی۔

ماہرین طبقات الارض اور علم الحیوانیات نے بلیو جان غار کا معائنہ کرنے کے بعد اس امر کی تصدیق کی ہے کہ اس میں رہنے والی مخلوق پتھر کے زمانے کے عظیم ریچھ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ چونکہ اس غار کے بے انداز گہرائی میں پانی اور ہوا دونوں عناصر موجود ہیں' اس لیے گھاس پھونس اور پودے بھی ضرور اُگتے ہوں گے جن پر یہ ریچھ زندہ رہا اور جو رومنوں کے دور میں کان کی کھدائی کے باعث زمین کے بالائی حصے میں آنکلا۔ تلاش بسیار کے باوجود اس کا دوبارہ سراغ نہ ملا' لیکن آج بھی راتوں کے سناٹے میں ایلرٹن فارم کے لوگوں کو اس نادیدہ ریچھ کی چیخیں سنائی دے جاتی ہیں جو کئی ہزار برس سے زندہ سلامت ہے اور نہ جانے کتنی مدت تک اس دنیائے آب و گل میں رہے گا۔

O☆O